فہم دین کا مصدر

حامد کمال الدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ والصلوۃ والسلام علیٰ رسول اللہ

آپ کے

فہمِ دین کا مصدر

سلف؟ خلف؟ یا ذاتی تحقیق؟

پاکستان بھر میں ہماری کتب، وسہ ماہی ایقاظ کے ڈسٹری بیوٹر:

کتاب سرائے الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، فون: 7239884 ,7320318

مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 042-37351124

بذریعہ ٹیلیفون، SMS، خط یا ای میل ہم سے براہ راست بھی منگوا سکتے ہیں

مطبوعاتِ ایقاظ ۔ D 336 سبزہ زار، لاہور

0323-4031624, matbooateeqaz@gmail.com,

ہمارا ویب سائٹ: www.eeqaz.org

آپ کے

فہمِ دین کا مصدر

سلف؟ خلف؟ یا ذاتی تحقیق؟

حامد کمال الدین

مطبـــــوعات ایقــــاظ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

طباعت دوم: ذوالقعدۃ ۱۴۳۲ھ، اکتوبر ۲۰۱۱ء

عنوان: آپ کے فہمِ دین کا مصدر.. سلف؟ خلف؟ یا ذاتی تحقیق؟

مؤلف: حامد کمال الدین hamidkamaluddin@gmail.com

ناشر: مطبوعات ایقاظ matbooateeqaz@gmail.com

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلد) Rs300

کارڈ کور: Rs200

مطبوعاتِ ایقاظ

336 D سبزہ زار، لاہور

Ph: 042-35175288 / 0323-403 1624 matbooateeqaz@gmail.com

www.eeqaz.org

’اتباعِ حق‘ کا عمل اس امت کے اندر اِس تسلسل کے ساتھ ہوا ہے.. اور نسل در نسل اور کڑی در کڑی اس شدید حد تک مربوط ہے.. اور کہیں رکے یا روپوش ہوئے بغیر اصحابِؓ رسول اللہؐ سے سیدھا بے ساختہ یوں جا ملتا ہے،...... کہ

’پہلوں‘ کے ذخیروں سے ایک بات کا ثبوت نہ دیا جا سکنا اور ایک مکتبِ فکر کا محض ’تحقیق‘ کے نتیجے میں سامنے آ جانا اُس کے محدَث اور **’فَھُوَ رَدٌّ‘** ہونے پر مہرِ تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔

ائمۂ اہلِ سنت نے کیا سچ کہا:

انقطاع _ یعنی دین کی کسی تعبیر کا پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جا سکنا _ اس کے باطل ہونے کیلئے کافی اور بجائے خود ایک دلیل ہے۔

فہرس

مُقدّمۃ طائفہ منصورہ...... وہ ''بڑا دائرہ'' پھر تشکیل پاتا ہے! 11

حصہ اول: **تمھید**

فصل 1: ''مصدر تلقی'' اصل بنیاد ہے 18

فصل 2: مصدر تلقی، اہل سنت واہل بدعت کے مابین اصل نقطۂ افتراق 20

کتاب اللہ و سنت رسول اللہؐ کو مصدر تلقی نہ ٹھہرانے والے طبقے 20

روافض جن کے نزدیک سنت کا پورا ذخیرہ ہی رد ہے 21

معتزلہ: الٰہیات وغیبیات میں نصوصِ شرع کو عقل کے تابع رکھنا 22

طوائفِ صوفیہ: 'طریقت' کو ''شریعت'' پر مقدم کرنیوالے 25

نیچرسٹ: غیبیات میں نصوصِ شریعت کو فزیکل لاز کے تابع رکھنا 25

منکرینِ حدیث: قدیم وجدت پسند 26

سیکولرز: ''شریعت'' کو پوری زندگی پر محیط نہ ماننے والے طبقے 29

کتاب اللہ و سنت رسولؐ اللہ کو مصدر تلقی ماننے والا طائفہ منصورہ 30

مدارس اہل سنت کا تنوع 30

مدارس اہل سنت، دبستانِ صحابہؓ کا تسلسل ہیں 31

یہ سب اہل اتباع میں آتے ہیں 39

سنی مذاہب کا، مدارسِ صحابہؓ کا ایک تسلسل ہونا 42

خبر واحد کے موضوع پر جدت پسندوں کا الحاد، اور مسلکی رجحانات کی چپقلش 45

فصل 3: ہمارا اصل سرمایہ: مصدرِ دین پر متفق طبقے 61

حصہ دوم: **تشخیص**

فصل 4: مراجعِ فہم......؟ 66

فہم کے مستند مراجع کی ضرورت...... چند مثالیں 67

''اصولِ فقہ'' کیوں بنے؟ 72

''اصولِ عقیدہ'' کا تقرر معمولی بات نہیں 73

پہیہ دوبارہ ایجاد کرنا! 74

فصل 5: سلف سے استغناء.. مگر بیشتر استدلالات درست! 76

فصل 6: انبیاءؑ اور اصحابؓ کا راستہ اپنائے بغیر اھواء سے دور ہونے کا دعویٰ سب سے بڑا جھوٹ ہے 81

اھواء کا علاج: انبیاء سے موروثہ علوم، اصحاب سے موروثہ مناہج 81

پہلی تلقین......: ''پہلوں کی راہ'' 88

دوسری تلقین......: ''پہلوں کی راہ'' والوں سے اپنی فکری ساخت کروانا 95

تیسری تلقین......: اہل زیغ سے دور رہنا 96

اشکال......: علوم کی مروجہ تقسیم 99

حسی علوم 100

خالص شرعی علوم 100

سماجی علوم 104

سماجی علوم کے اندر اگر اھواء نہیں......! 106

اصل امتحان......: اتباع و اھتداء 107

دلوں کا بگاڑ...... کسی حدیث کو تو نہیں ٹھکرایا تھا؟ 109

دلوں کا الٹا کر دیا جانا 110

خوارج کی حالت 111

تفسیر ابن کثیر...... **بغیاً بینھم** کے موضوع پر 112

''اھواء'' اور ''بغیاً بینھم''...... یا 'معروضیت'؟! 113

''زیغ'' کی سزا، ''ایک بڑا زیغ'' 114

دلوں اور دیدوں کا اوندھا کر دیا جانا 116

امام ابو حنیفہؒ صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتے 118

نبی صرف ''بیج'' دے کر نہیں ''فصل'' اگا کر جاتا ہے 120

''ارتقاء'' نہیں...... ''اِزدھار'' 127

فصل 7: **ایک الجھن، تین رویے** 130

کیوں، وہ نبی ہیں؟! 131

متبوع مستقل بالذات! 132

ہر قید سے آزاد! 134

فصل 8: **جمود کی کہانی** 136

اصل المیہ 136

جمود اور اس کے ردعمل میں بھی جمود! 139

فصل 9: **استشراق کی سوغات......: ''مطلق رواداری''!** 141

فصل 10: **ایک بے قابو مجمع!** 148

'جلتے بجھتے' سلسلے! 149

جب بھگدڑ مچی ہو! 152

اجتماع کی صحیح بنیاد 155

مقیاسِ مفقود 158

فصل 11: **مسلمات کی ضرورت** 161

دین...... ایک متعین حقیقت 163

نقلِ ثابت وعقلِ راسخ 169

غیر نبوی معاشروں کی شقاوت 170

حصہ سوم: تأصیل

فصل 12: "صراطِ مستقیم" کے بعد صراط الذین أنعمت علیهم کی صراحت 175
"أهواء"......: صحابہؓ کی راہ سے ہٹنا 176
صراط الذین أنعمت علیهم، غیر المغضوب علیهم ولا الضالین 179
"انقطاع" کسی راستے کے باطل ہونے کی دلیل ہے 182
فصل 13: منہجِ سلف کو لازم پکڑنا 188
فصل 14: مدرسۂ صحابہؓ اساس ہے 203
'ہم کیا صحابہؓ سے کم ہیں'......! 204
یہ رتبۂ بلند......! 205
صحابہؓ کا اتباع، اہلسنت کے سب مذاہب کے نزدیک واجب ہے 210
امام شاطبیؒ: 210
تقریراتِ امام شافعیؒ 211
امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مذہب ہے 215
امام مالکؒ و امام احمدؒ کا موقف تو خیر محتاجِ بیان ہی نہیں 220
فہم کیلئے سلف کا حوالہ حجت نہیں تو پھر حجت کیا ہے؟ 224
کتاب و سنت کے بعد ابو بکرؓ و عمرؓ 226
إنا نقتدی ولا نبتدیٔ "ہم اقتداء کرنیوالے ہیں نہ کہ ابتداء کرنیوالے" 228
"پہلے سے چلا آنیوالا راستہ" نہ کہ 'غور و خوض سے سامنے آنیوالی چیز' 228
"علم" نہ کہ 'رائے' 229
"الذین أوتوا العلم" کی تفسیر صحابہؓ ہیں۔ 238
اتباعِ اثر 239
صحابہؓ خود اپنی بابت کیا کہتے ہیں 242

صحابیؓ کے ساتھ 'اتفاق' نہیں، صحابیؓ کی ''پیروی'' 248

قیامت کی نشانیاں! 248

علمائے سلف کو چھوڑ کر بونوں سے علم لیا جانا 248

شریعت کے ساتھ کھلواڑ کیلئے کھلا لائسنس 257

تین ادوار.. تین مدرسے 261

فصل 15: دلائل ابن قیمؒ از اعلام الموقعین صحابہؓ معیارِ حق اور انکے مدرسہ کی اتباع لازم 267

فصل 16: منہجِ سلف، قرونِ ثلاثہ کے بعد 289

فصل 17: تنقیح 'بعد والوں' کے مناہج کی، نہ کہ ''دورِ اول'' کے مسلمات کی! 299

فصل 18: دورِ صحابہ و سلف کی ''اتباع'' نہ کہ محض ''تعظیم''! 305

فصل 19: دورِ اول کے ''سَلَف'' اور زمانۂ آخر کے 'اکابرین' 308

فصل 20: کوئی چیز کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا متبادل نہیں 315

حصہ چہارم: تحصیل

فصل 21: 'مجمع' سے ''جماعت'' تک!!! 320

حصہ پنجم: ازالۂ اشکالات

ابو جہل اور ابو لہب دین کو سمجھ سکتا ہے تو مستشرقین اور جدت پسند کیوں نہیں؟ 330

منہجِ سلف حل کیسے، اِس کی تو حجیت ثابت کرنے کیلئے گھنٹے چاہئیں! 335

کیا ہر نئی بات ممنوع ٹھہرا دی جائے گی؟ 345

اختلافِ سلف کا جو دائرہ آپ بنا کر دیتے ہیں، ہم بھی اُس سے باہر تو نہیں! 350

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ والصلوۃ والسلام علی رسول اللہ
أما بعد

مُقدِّمَة

طائفہ منصورہ
وہ "بڑادائرہ" پھرتشکیل پاتاہے!

ایک زوردارتحریکی عمل مسلم برصغیر کے وجود میں تسلسل کے ساتھ کروٹیں لے رہاہے۔ یہ جوش اور ولولہ اپنا ظہور کرانے کو عرصہ سے بے چین ہے مگر کچھ بے ڈھب رکاوٹیں ہیں جو اِس کا راستہ مسدود کیئے بیٹھی ہیں۔ یہ بے رحم رکاوٹیں زیادہ تر یہاں کے مسلکی و غیر مسلکی رجحانات کی پیدا کردہ ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل عبور دیواریں بنتی جارہی ہیں۔اپنے تحریکی عمل کی راہ میں آج یہ دیواریں حائل نہ ہوتیں تو عمل اور فاعلیت کا جواٹوٹ جذبہ ہمارے "نوجواں مسلم" میں موجزن ہے، ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ...... تہذیبوں کے اِس تصادم اور نظریات کے اِس گھمسان میں ہمارا نوجوان آج اِس بری طرح مار نہ کھا رہا ہوتا۔ نہ صرف یہ، بلکہ نظریاتی میدان میں وہ ایک کامیاب ترین پیش قدمی بھی کر رہا ہوتا۔

ہماری نظر میں، یہ کچھ خاصی بے تکی رکاوٹیں ہیں اور بلا وجہ ہماری اسلامی پیش قدمی کی راہ میں لے آئی گئی ہیں۔ نہ ان کا تعلق ہمارے دین سے ہے اور نہ ہمارے دین کی ساخت میں ایسی رکاوٹوں اور الجھنوں کیلئے کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے۔ یہ محض کچھ گرد ہے جو صدیوں کے ایک عمل نے اِس پر ڈال رکھی ہے، اور جس کو ہٹائے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ ذرا محنت کر کے اگر اِن رکاوٹوں کو اپنے اِس

''کارواں'' کی راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے تو ایک ایسی عظیم شاہراہ خودبخود آپ کے سامنے آ جاتی ہے.. اور یہاں کے سب موحد طبقوں سے مل کر ایک ایسا زوردار دھارا آپ سے آپ یہاں پر تشکیل پا جاتا ہے.. جو اللہ کے فضل سے جاہلیت کا سب جھاڑ جھنکاڑ بہالے جانے والا ہے۔

اِن بے ہنگم رکاوٹوں میں سے ایک بڑی رکاوٹ: یہاں کا فکری انتشار اور منہجی بے سمتی ہے، اور اِسی کا سد باب ہماری اِس کتاب کا موضوع......:

دین سمجھنے کیلئے ہمارا یہ نوجوان یا تو 'مسلکوں' کے پاس جاتا ہے جو بالعموم اِس کو اُس دنگل کا حصہ بناتے ہیں جو ہمارے برصغیر میں ڈیڑھ سو سال سے خاصی بے حسی کے ساتھ ہمارے اپنے ہی مابین لڑا جا رہا ہے اور جو کہ ہماری توانائیوں کو نچوڑ نچوڑ کر ضائع کرواتا چلا آیا ہے...... اور وہ بھی اُس دور میں جب بدیسی استعمار ہمارے سروں پر مسلط تھا اور کفر کی نظریاتی و ثقافتی یلغار ہمارے گھر کی رہی سہی بنیادیں ہلا رہی تھی اور جس نے بالآخر اِس گھر کی کوئی ایک بھی چیز سلامت نہیں رہنے دی ہے۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں، یہ دنگل اُسی جوش وخروش اور اُسی جذبۂ ثواب کے ساتھ جاری ہے!

اور یا پھر...... اِس نوجوان کا واسطہ اسلام کی اُس 'غیر مسلکی' تفسیر کے ساتھ پڑتا ہے جس کی رُو سے دین کا ہر مسئلہ بلکہ دین کا ہر عقیدہ، 'نکتۂ نظر' قسم کی چیز ہے۔ اور جس میں ہر کوئی 'رائے' رکھنے کا مجاز ہے؛ اور 'رائے' سے آگے کچھ نہیں! چنانچہ یہاں کے وہ دینی طبقے جو 'مسالک' سے اب ایک طرح کی بیزاری ظاہر کرنے لگے ہیں، (اور یہ بھی اب کوئی کم مقبول فیشن نہیں)، ان کے یہاں آپ کو ایک مخصوص طرزِ تعامل نظر آتا ہے۔ جس کی رُو سے: دین کے ایک مسئلہ میں زیادہ سے

زیادہ، 'رائے' رکھ لی جائے گی! دین میں جس درجہ کا بھی اختلاف ہو، اُس کے بالمقابل 'رواداری' اختیار کروائی جائے گی......! 'منحرف' یا 'گمراہ' ایسے لفظ کا تو استعمال ہی اِس طبقہ کے نزدیک منع ہے اور ''مبتدع'' ایسی ڈراؤنی اصطلاح کو تو اپنی اسلامی لغت سے کھرچ ہی دینا چاہیے، بے لحاظ اِس سے کہ دین کا وہ کیا ناگزیر مفہوم ہے جس کو ادا کرنے کیلئے یہ اصطلاح ائمۂ سنت کے ہاں مستعمل رہی، اور بے پروا اِس سے کہ کیسی ہی خطرناک گمراہیاں اور کیسی ہی تباہ کن بدعات ہمارے اپنے زمانے میں کیوں نہ پائی جا رہی ہوں! دین کا سب سے بڑا فرض گویا کوئی ہے تو وہ رواداری ہے، توحید کا درجہ بھی شاید اس کے بعد آتا ہو!

اور یا پھر...... ہمارے اِس نوجوان کو 'جدت پسندوں' کے پاس جانا ہوتا ہے جو کہ ہے ہی یہاں پر استشراق کا کاشت کیا ہوا پودا، اور جو کہ اِس کو اسلام کے اُس پرانے اصیل تصور ہی سے برگشتہ کرا دینے کیلئے ہماری زمین میں بویا گیا ہے۔

چنانچہ.. جدت پسندوں کی روش کا تو ذکر ہی کیا، اور جو کہ اِن میں خطرناک ترین ہے......پہلی دو انتہائیں بھی کچھ کم تشویشناک نہیں:

- ایک انتہا پر یہ حال ہے کہ: کوئی شخص اگر کسی ایک بھی مسئلہ میں آپ والے 'مسلک حقہ' پر نہیں تو وہ منحرف ہے اور اُس پر اپنے اُس انحراف سے تائب ہو کر آپ والے 'مسلک حقہ' کی طرف لوٹ آنا فرض......! نماز وہ جو 'آپ والی' مسجد میں ہو اور عبادت وہ جو 'آپ والے' طریقے پر ہو!...... ('مسلکی' اپروچ!)

- تو دوسری انتہا پر یہ حال ہے کہ: دین کے چھوٹے مسئلے ہوں یا بڑے، فروع ہوں اور چاہے اصول، 'رائے' سے بڑھ کر کسی چیز کے متحمل نہیں! خاص اپنی تحقیق اور مطالعہ سے، ہر شخص یہاں 'رائے' اختیار کرے گا! اور چونکہ ہر شخص کو 'رائے'

رکھنی ہے لہٰذا دین کے ہر ہر مسئلے اور ہر ہر شعبے میں 'اختلاف' کیلئے بھی آدمی کو غیر معمولی طور پر دل کھلا رکھنا ہے! ('غیر مسلکی' اپروچ!)

اِن دو انتہاؤں کے بیچ، راہِ وسط کہاں ہے؟ اِس 'مسلکی' اپروچ اور اُس 'غیر مسلکی' اپروچ سے ہٹ کر، ایک ''اصولی'' طریقِ فکر کیا ہے؟...... بڑی حد تک، جواب نہ دارد!

یہاں پر، ہمارے اِس نوجوان کے سامنے سب راستے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ دین کے اصول اور فروع کی بابت ایک مستند اور متوازن فہم اس کو شاید ہی کہیں سے ملتا ہو۔ اِس کو یہ تو معلوم ہے کہ دین، اللہ کی کتاب سے لینا ہے اور اُس کے رسولؐ کی سنت سے لینا ہے، (کہ اس کے بغیر آدمی نجات کا امیدوار ہو ہی نہیں سکتا)، مگر کتاب اور سنت سے دین لینا کس طرح ہے؟ یعنی دین کو کیونکر سمجھنا ہے، اور تاریخی طور پر اس کے فہم کے مستند ترین مراجع ہماری تاریخ کے کونسے ادوار اور کونسے طبقے ہیں؟ اہل اتباع کے مابین یگانگت uniformity اور تنوع diversity برقرار رکھنے کیلئے درست ترین پیمانے کیا ہیں اور کہاں سے دستیاب ہوتے ہیں؟ دین کا فہم لینے کے اِس عمل میں کہاں کہاں وہ مقامات ہیں جہاں فراخ دلی سے کام لینا ہے اور ''اختلاف'' و ''تعددِ مدارس'' کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنا ہے.. اور کہاں کہاں وہ مقامات ہیں جہاں پر ''اختلاف'' کو ناقابل برداشت اور باعثِ تفرقہ و باعثِ ہلاکت جاننا ہے اور جہاں اختلاف ہونے پر ائمۂ سنت کے چہرے لال پیلے ہو جاتے رہے ہیں...... یہ راہنمائی قریب قریب مفقود ہے۔

ایسے میں، دین کی ایک متوازن اور ٹھوس صورت سامنے آئے تو کیونکر؟

☆☆☆☆☆

''کارواں'' کی راہ سے یہ گرد ہٹانا.. اور اِن بے ہنگم رکاوٹوں سے اس کی راہ کو صاف کر دینا.. تاکہ جہانِ نو کے اندر پیش قدمی کیلئے ہمارے نوجوان کو ایک کھلی شاہراہ دستیاب ہو، ہم سب کا فریضہ ہے۔

اِس مبارک عمل میں اپنا ناچیز حصہ ڈالنے کیلئے.. ادارہ ایقاظ نے ایک سلسلۂ مطبوعات کا اجراء کیا ہے؛ جس کے متعدد حصے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔

یہ کتاب جو اِس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے......، اپنے اس حالیہ بحران سے بحث کرتی ہے جس کو ہم نے یہاں پائے جانے والے ''فکری انتشار اور منہجی بے سمتی'' سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کتاب کا موضوع: یہاں کے ایک نہایت دیرینہ و جان لیوا مسئلہ کا حل ہے......:

''دین کا مصدر'' تو اللہ کا شکر ہے یہاں کے کسی بھی پڑھے لکھے شخص پر اوجھل نہیں ہے، اور سوائے روافض یا جدت پسندوں وغیرہ کے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ قرآن کی آیات یا رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک قولی یا فعلی یا تقریری حدیث کسی بھی معنیٰ میں اور کسی بھی لحاظ سے ہر ذی نفس کے حق میں حجت absolute evidence اور ملزم binding نہیں۔ یہ ہم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ دین کے اِس اصل پر ہم آج بھی متفق و یکجا ہیں۔ اپنے انحطاط و پسماندگی کے اِس دور میں بھی ''دین کا مصدر'' ہم پر پوری طرح واضح ہے۔ اب اگر ''فہم کا مصدر'' بھی واضح ہو جائے تو ہمیں اس ''مصدرِ دین'' سے ''راہنمائی لینے کا صحیح ترین طریقہ'' بھی مل جاتا ہے اور ہم اِفراط و تفریط اور باہمی رسہ کشی ایسے اِن سب تکلیف دہ رجحانات کا شکار ہونے سے بھی محفوظ ہو جاتے ہیں.. نیز ہم افکار کے اُس جمعہ بازار سے بھی چھٹکارا پا لیتے ہیں جو کہ بڑی دیر سے ہم پر ہجوم کئے ہوئے ہے اور جو کہ

ہمارے تحریکی عمل میں مطلوبہ زور اور بلاخیزی لے آنے میں بری طرح مانع ہے اور جس کے ہوتے ہوئے ایک ''قافلہ'' کا رواں دواں ہونا ممکن نہیں۔ یہیں سے؛ ہمیں اپنی ''وحدت'' کیلئے بھی ایک درست ترین بنیاد فراہم ہو جاتی ہے اور اپنے ''تعددِ مدارس'' کیلئے صحیح دائرہ کی بھی ایک بہترین نشان دہی ہو جاتی ہے۔

آپ اتفاق کریں گے، یہ وضوح اور یہ دلجمعی اور یہ یکسوئی ہمارے اِس راستے میں پیر جما کر چلنے کیلئے ناگزیر ہے۔

☆☆☆☆☆

قارئین کا ایک طبقہ ایسا ہو سکتا ہے جو اِس موضوع کو محض فقہی اور تفسیری پہلوؤں سے ہی دیکھنا چاہے، جبکہ ہماری گفتگو میں اِن اشیاء کو تحریکی موضوعات کے ساتھ بھی جوڑا جاتا ہے۔ یہ کتاب اساساً یہاں کی ایک تحریکی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہے؛ بحث کو اس کے فقہی و تفسیری جوانب تک محدود رکھا جاتا تو کتاب کا ایک بڑا مقصد پورا ہونے سے رہ جاتا۔

اور جہاں تک اِس ''باعثِ تحریر'' کا تعلق ہے...... تو یہی ایک تالیف نہیں، ہماری جملہ تحریری محنت کا ہدف یہاں تحریکی عمل کو ایک نظریاتی بنیاد فراہم کرنا ہے۔ اِس لکھنے لکھانے سے ہمارے پیش نظر یہاں کی علمی دنیا میں کوئی اضافہ کرنا ہے اور نہ ہم اِس اہل۔ مسلم ہند کے اندر ''جہادِ کبیر'' کا راستہ صاف کرنا اِس دور کا ایک اہم فریضہ ہے اور ہماری یہ ناچیز محنت اِسی عمل میں حصہ ڈالنے کی اپنی سی ایک کوشش۔

اللّٰھم أرِنا الحقَّ حقاً وارزقنا اتباعه، وأرِنا الباطلَ باطلاً وارزقنا اجتنابه۔

حامد کمال الدین

حصہ اول: **تمہید**

''مصدرِ تلقی'' اصل بنیاد ہے

مصدرِ تلقی، اہل سنت و اہل بدعت کے مابین اصل نقطۂ افتراق

برصغیر میں ہمارا اصل سرمایہ: مصدرِ دین پر متفق طبقے

1

”مصدرِ تلقی“ اصل بنیاد ہے

””تلقّی““ کا مطلب ہے دین کو لینا۔ اصولِ اہلسنت میں جو پہلی چیز دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے **مصدرِ تلقِی** اور **منہج تلقِی**۔ انہی دو باتوں پر جملہ مسائل دین کا انحصار ہے۔

مصدر تلقِّی کا مطلب ہے: دین کہاں سے لینا ہے۔

اور **منہج تلقِّی** کا مطلب ہے: دین کس طرح لینا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، یعنی **تلقِّیِ دین** کا مصدر.. تو اہلسنت کا اجماع ہے کہ: یہ کتاب اللہ ہے اور سنت رسول اللہ ﷺ[1]۔ جو اس پر متفق نہیں وہ اہل اتباع کے دائرہ میں ہی نہیں آتا۔

رہا اس **تَلَقِّی** کا منہج، تو وہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کا فہم اور طریقہ ہے۔ البتہ یہاں پر کچھ غلطی ہائے مضامین پائے جاتے ہیں؛ جن میں سے اہم اہم کا ازالہ ہماری اِس کتاب کا موضوع ہے۔

اول الذکر یعنی مصدرِ تلقی، شریعت کی اساس ہے۔ مصدرِ تلقی کے معاملہ میں، الحمدللہ ہمارے آج کے سب تحریکی حلقے اہلسنت دائرہ سے وابستہ ہیں: کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی آئینی حیثیت اِن کے ہاں کبھی محل نظر نہیں رہی۔ فہم کی بات الگ ہے، جس پر بحث آگے آرہی ہے، البتہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ کو رد کر دینے کا رجحان اِن کے ہاں کبھی نہیں پایا گیا۔ ’’مصدریت‘‘ ان سب طبقوں کے

ہاں قطعی طور پر نصوصِ وحی کو ہی حاصل ہے؛ بشر کی ہدایت کیلئے قرآن وحدیث کے سوا آسمان سے کچھ نہیں اترا۔ یہ ''وحی'' ہی قیامت تک کیلئے اِن سب اصحابِ عزیمت کا دستور ہے اوراس سے عدولی کرنا اِن سب کی نظر میں ایمان کھودینے کے مترادف۔

یہیں سے؛ اِن دوفریقوں کے مابین ایک واضح لکیر کھچ جاتی ہے:

- **ایک وہ فریق** جونصوصِ وحی کی آئینی حیثیت کوتسلیم کرنے میں ہی 'اگر مگر' کرتا ہے اور عین ''وفاداری'' کے مقام پہ جا کر 'شرط استواری' کا سوال اٹھا دیتا ہے......، یعنی اہل بدعت۔

- **اور دوسرا وہ فریق** جونصوصِ وحی کو مطلق آئینی حیثیت دینے میں ہرگز کوئی پس وپیش اور کوئی 'اگر مگر' نہیں کرتا......، یعنی اہل سنت۔

حصۂ اول میں اِن دوفریقوں کا فرق ہی ہمارا موضوع ہوگا، یعنی: **''مصدرِ تلقی'' کی بنیاد پر ''اہل انحراف'' اور ''اہل اتباع'' کے مابین ایک واضح لکیر کھینچ دینا**......

مابعد اجزاء (کتاب کے حصہ دوم و مابعد) میں پھر ہم فہم کی مرجعیت پر بات کریں گے۔ وہاں پر ہم وہ مباحث سامنے لائیں گے جو ''نصوصِ وحی کی حجیت پر یک آواز طبقوں'' کو نہ صرف ''فہم وحی'' کی کچھ مستند بنیادیں فراہم کرکے دیتے ہیں بلکہ ان کی وحدت اور تنوع کو ایک خوبصورت ضبط اور سیاق بھی عطا کرتے ہیں۔

(حاشیہ ۱)

''اجماع'' وغیرہ اسی کے ساتھ ملحق ہیں، گو کسی کسی وقت الگ سے بھی ذکر ہوتے ہیں۔ ''مصدرِ دین'' سے متعلق اہلسنت کے ہاں پائی جانے والی بحثوں میں بالعموم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہﷺ ہی مذکور ہوتے ہیں، باوجود اِسکے کہ اجماع و قیاس وغیرہ اس سے منفی نہیں ہوتے اور اپنی اپنی جگہ پر ''ادلہ شرعیہ'' کے طور پر تسلیم ہوتے ہیں۔

2

مصدرِ تلقّی
اہل سنت واہل بدعت کے مابین اصل فارِق

کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کو تلقی کا مصدر نہ ٹھہرانے والے طبقے:

وہ کونسے طبقے ہیں جو ''وحی'' کی ایک یا ہر دو صورت (متلو وغیر متلو) کو ''دین کا مصدر'' نہیں مانتے؟ (''دین کا مصدر'' ایک مطلق معنیٰ میں، نہ کہ اپنی اگر مگر کے ساتھ)۔ اور اس کو اپنے شرعی استدلال و استنباط کے معاملہ میں حتمی ''حجت'' نہیں ٹھہراتے؟ یہاں ہم ایسے گروہوں کی چند مثالیں ذکر کریں گے۔

یہ چند مثالیں ہی ہیں نہ کہ اُن فرقوں کا مفصل بیان جو وحییـــــــن کی حاکمانہ حیثیت کو اپنے دین کی بنیاد نہیں بناتے۔ اِن چند مثالوں کا ذکر بھی محض اس لئے کہ وہ فرقے جو اس باب میں بھٹکے ہیں اُن کی شناعت اور ان کے حق سے دور ہونے کی نوعیت واضح ہوسکے: کہ یہ کسی ایک آدھ نص کے ساتھ اُن کا رویہ نہیں جو ان کو ''غیر اہل سنت'' شمار کرواتا ہے بلکہ کھلم کھلا انحراف اور باقاعدہ طریق عمل ہے۔ نیز یہ وہ فرقے ہیں جن کا دین سے منحرف ہونا کسی ایک آدھ متبع سنت گروہ کا خیال نہیں، بلکہ اِن کے راستے کو ضلال اور انحراف کہنا سبھی طوائفِ حق کے یہاں ثابت و طے شدہ امر ہے۔

حق اور سنت کے دائرہ سے خروج کر لینے والے طبقوں کی یہ کنکریٹ مثالیں

ہم اِس لئے بھی دینا چاہیں گے کہ لفظ ''گمراہ فرقوں'' کے استعمال اور تصور کو ایک ضبط مل جائے؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں ایسے شنیع الفاظ پر مشتمل گولہ باری کسی کسی وقت طوائفِ حق کے اپنے مابین بھی ہونے لگتی ہے۔ یہ خبط جس چیز کا پیدا کردہ ہے وہ ہے دائرہ اہلسنت (وابستگانِ صحابہؓ) سے جہالت۔ ''اہل سنت'' وہ دائرہ ہے جس سے باہر کے لوگوں کا اختلاف ''شقاق''☆ اور ''افتراق''☆ کہلاتا ہے، البتہ اِس دائرہ کے اندر کے لوگوں کے مابین اختلاف ہو تو اُس کو ''اختلافِ آراء'' مانا جاتا ہے۔ جبکہ ''گمراہ'' اور ''منحرف'' اور ''مبتدع'' ایسے الفاظ مخالف کیلئے وہاں استعمال ہوتے ہیں جہاں ''شقاق'' ہو نہ کہ وہاں جہاں ''اختلافِ آراء'' ہو۔

پس چند مثالیں اُن طبقوں کی جن کی راہ شقاق، انحراف اور گمراہی شمار ہوتی ہے:

۱) <u>مصدرِ تلقی کے موضوع پر</u> دائرۂ سنت سے باہر ہونے میں، سب سے نمایاں طبقہ **روافض** کا ہے۔

روافض: جنکے نزدیک حدیث کا پورا ذخیرہ ہی ردھے

''حجیتِ قرآن'' کے حوالے سے روافض کے عقیدہ ومنہج پر بات نہ بھی کی جائے.. تو ''سنت'' کے سب کے سب ذخیرے تو جو ہمارے یہاں پائے جاتے ہیں اور جن کے علاوہ سنت کا کوئی مستند ذخیرہ کہیں پایا ہی نہیں جاتا، روافض کی نظر میں بہرحال قابل اعتناء نہیں۔ یہ سب مرویات چونکہ عائشہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ، ابوسعید خدریؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن عمروؓ اور جابر بن عبداللہؓ وغیرہ وغیرہ ایسے اصحابِؓ رسول اللہ ﷺ کی راہ سے آتی ہیں لہٰذا یہ سب مرویات روافض کیلئے قابل اعتناء نہیں۔ آپ تو ''صحیح بخاری'' کی کسی ایک ہی حدیث کو رد کر

☆ شقاق: یعنی اہل حق سے راستہ الگ کر لینا۔ ☆ افتراق: یعنی اہل حق سے مفارقت اختیار کر لینا

دیا جانے پر برانگیختہ ہو جاتے ہوں گے، مگر روافض وہ طائفہ ہیں جن کے ہاں آپ کی پوری کی پوری ''بخاری'' ہی رد ہے، اور یہی حکم ان کی نظر میں حدیث کی اُن باقی سب کتب کا ہے جن سے آپ رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی وحیِ غیر متلو کی نصوص حاصل کرتے ہیں۔ یعنی روافض وہ طبقہ ہے جن سے ہم ''اصول'' میں ہی الگ ہیں۔ مرویاتِ صحابہؓ کو قبول کرنا ہمارے دین کا ایک نہایت اہم اصل ہے اور اس کو گرانے سے پورا دین گر جاتا ہے۔

۲) روافض کے بعد...... اخبارِ وحی کو حجت نہ ماننے والوں میں

معتزلہ: الٰہیات وغیبیات میں نصوصِ شرع کو عقل کے تابع رکھنا

معتزلہ آتے ہیں، قدیم بھی اور جدید بھی۔ جہاں اخبارِ وحی ان کی عقل کے خلاف پڑیں، وہاں یہ (معتزلہ) اخبار و آثار کو رد کر دیں گے، یا پھر ان کے معانی کو اِس قدر توڑ مروڑ دیں گے ___ اور جس کو یہ لوگ ''تاویل'' کہتے ہیں ___ کہ اخبارِ وحی ان کی عقل کے تابع ہو جائیں۔ غرض کتاب اور سنت کی نصوص کو اپنے بے ساختہ معانی رکھتے ہوئے یہ حیثیت حاصل ہی نہیں کہ وہ مطلق طور پر قبول ہوں اور لوگوں کی عقول اور اَذواق پر مطلق طور پر حاکم ہوں!

جیسا کہ ائمہ سنت نے واضح کیا، معتزلہ وغیرہ کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ کتاب اور سنت کے معانی سمجھنے کی کوشش کے دوران اور کتاب اور سنت کے اندر حق کے تلاش کے کسی عمل کے دوران لغزش کھا بیٹھتے تھے۔ اِن کا معاملہ یہ تھا کہ یہ لوگ حق کا تعین پہلے خود اپنی عقول سے کرتے تھے اور پھر کتاب اور سنت کو اپنے اُس مزعومہ حق کے تابع کرتے تھے اور اس کیلئے نصوص شریعت کو جتنا بھی مروڑنا یا کھینچنا پڑے، کھینچتے تھے۔ یہ گویا ان کا شریعت کو ایک طرح کی 'توقیر' دینا تھا کہ وہ اس کو کچھ نہ کچھ خاطر

میں بہرحال لاتے ہیں (ورنہ کام تو اس کے بغیر بھی کوئی نہیں رکا ہوا!)۔ چنانچہ الٰہیات اور غیبیات کے موضوع پر یہ اپنے ہی عقلی پیمانے رکھتے تھے اور کتاب و سنت کے وہ سب حصے جو ان پر پورا اترتے قبول ہوتے چلے جاتے اور وہ حصے جو ان پر پورا نہ اترتے الگ کر کے رکھ دیے جاتے اور پھر ''تاویل'' کی سان پر چڑھا دیے جاتے۔ مثلاً قیامت کے روز اللہ کے دیدار کا انکار، باوجود اس کے کہ نصوص شریعت میں یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور صحابہؓ وتابعینؒ میں سے اہل تفسیر کا اس پر مکمل اتفاق ہے، مگر چونکہ یہ بات معتزلہ کے ''تصورِ خدا'' کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتی لہٰذا رد ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کا بولنا اور کلام فرمانا، کتاب اور سنت سے ثابت ہونے کے باوجود کسی ارسطو کے ''تصورِ خدا'' کے ساتھ لگا نہیں کھاتی لہٰذا کتاب اور سنت کی نصوص اس موضوع پر یا تو رد ہوں گی اور یا توڑی مروڑی جائیں گی، چاہے خدا کی صفتِ کلام کا انکار کرتے ہوئے قرآن کو مخلوق کیوں نہ کہنا پڑے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

پس ہم نے دیکھا، معتزلہ کا اختلاف اہل سنت کے ساتھ ''اصولِ دین'' کے اندر تھا اور وہ اِس میدان میں ہی نصوصِ شرع کو (نصوص کے اُس بے ساختہ مفہوم کے ساتھ جو اہل اسلام کے ہاں روزِ اول سے چلا آیا ہے)، تلقی کا اولین مصدر مانتے تھے اور نہ اپنے اُن مزعومہ عقائد وتصورات پر مطلق حاکم۔

یہ کچھ وضاحت اس لئے ہوئی کہ جب ہم یہ کہیں کہ ''کچھ گمراہ فرقے مانند معتزلہ وعقلانیہ وغیرہ کتاب اور سنت کو اپنے لئے تلقی کا علی الاطلاق مصدر نہیں مانتے''، تو ہماری اس بات کا صحیح مدعا واضح ہو جائے اور ہرگز ہرگز ہمارے ان ائمۂ سنت کے ساتھ خلط نہ کر دیا جائے جو کچھ فقہی مسائل کے استنباط واستدلال کی غرض سے اخبارِ وحی کی تحقیق اور چھان پھٹک کے معاملہ میں، یا قبولِ روایات کے وقت

کچھ علمی شروط عائد کرنے کے معاملہ میں، اور یا پھر تعارضِ ادلہ کو رفع کرنے کے معاملہ میں، ہوسکتا ہے آپ کے یا آپ کے ائمہ کے طریقے کی نسبت قدرے ایک مختلف طریقہ رکھتے ہوں، مگر امت میں وہ اہل سنت ہی گنے گئے ہیں بلکہ اہل سنت کے ائمہ اور اَعلام مانے گئے ہیں، مانند ائمہ اَربعہ وغیرھم۔ یہ ائمہ اور ان کے دیے ہوئے علمی خطوط پر چلنے والے طبقے ــــ ''نصوصِ شریعت'' کے قبول اور مطالعہ کے حوالہ سے ــــ جس دائرہ کے اندر رہ کر اختلاف کرتے ہیں وہ بھی یقیناً ایک وسیع دائرہ ہے اور اس کے اندر بھی نہایت زبردست علمی مباحثے پائے جاتے ہیں اور ایک دوسری پر نقد اور علمی گرفت بھی بڑی کھل کر لی جاتی ہے اور ایک دوسرے کے موقف کو رد اور باطل بھی ٹھہرا لیا جاتا ہے، کیونکہ مطلق وفاداری اہل سنت کے یہاں اللہ اور رسولؐ کے قول کے ساتھ رکھی جاتی ہے اور باقی ہر کسی کو اللہ اور رسولؐ کے قول کی روشنی میں قبول بھی کیا جاتا ہے اور رد بھی کیا جاتا ہے......، تاہم یہ دائرہ علمی وفقہی اختلاف کا دائرہ ہے۔

اِس خلط کی مثال دیکھنا ہوتو آپ یہاں کے اُن کم علم طبقوں کو دیکھ سکتے ہیں جو آپ کو امت کے بعض معتبر ائمۂ فقہاء کے اقوال اور استنباطات کی بعض ایسی مثالوں کو، جن میں ہوسکتا ہے ان ائمۂ فقہاء سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہو، اتنا بڑا اور گھناؤنا بنا کر دکھائیں گے گویا یہ فقہاء تو نصوصِ کتاب وسنت کی حاکمانہ حیثیت ہی کو تسلیم نہیں کرتے! اور پھر ان فقہاء کی اور ان سے منسوب علمی طبقوں کی وہ مذمت اور وہ برائی کریں گے جو ہمارے ائمہ سنت کسی وقت جہمیہ، معتزلہ اور کلابیہ وغیرہ ایسے گمراہ فرقوں کی کرتے رہے ہیں! اِس مسئلہ کی کچھ وضاحت اِسی فصل کے اندر آگے چل کر بھی آئے گی۔

۳) اَخبارِ وحی کو تلقی کا علی الاطلاق مصدر نہ ماننے میں...... پھر صوفیہ کے وہ طبقے آتے ہیں جو ''طریقت'' کو ''شریعت'' پر مقدم ٹھہرانے والے ہیں (واضح رہے صوفیاء کے وہ طبقے جو رسول اللہؐ کی لائی ہوئی شریعت کو اور آپؐ سے وارد اخبارِ وحی کو ہر ہر چیز پر مقدم مانتے ہیں اور جو کہ صوفیاء کی ایک بڑی اکثریت ہیں، وہ یقینی طور پر اہل سنت میں شامل ہیں)۔ صوفیہ کے یہ منحرف طبقے (یعنی طریقت کو شریعت پر مقدم ماننے والے طبقے) وہ ہیں جن کیلئے ہدایت اور آگہی اور علم کا مصدر کتاب وسنت کی نصوص نہیں، بلکہ ان کے اپنے یا ان کے بڑوں کے کشف والہام ہیں اور کوئی خاص قسم کا علم لدنی وکسبی وغیرہ ہے۔ کم از کم بھی یہ کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ علم اور ایقان کا مطلق وآخری مصدر نہیں اور ''غیب'' پر مرجع ہونے کی حیثیت ان کے یہاں کتاب اور سنت کے ماسوا اشیاء کو بھی حاصل ہے۔ ان کے کثیر طوائف ایسے بھی ہیں جو کتاب وسنت کی نصوص کی باطنی تفسیر کرتے ہیں، اور اس طرح نصوص وحی کو توڑ مروڑ کر اپنے اوہام اور خرافات کے تابع کر لیتے ہیں، یہاں سے ان کا یہ بھرم بھی قائم رہتا ہے کہ دیکھیں جناب یہ تو ''شریعت'' کو مانتے ہیں، جبکہ درونِ خانہ وہ سب خرافات بھی محکّم مانی اور منوائی جارہی ہوتی ہیں۔

طوائف صوفیہ: 'طریقت' کو ''شریعت'' پر مقدم کرنیوالے

۴) اخبارِ وحی کو حجت اور مصدرِ دین نہ ماننے والوں میں پھر وہ نیچرسٹ آتے ہیں جو اپنے زعم میں ''نیچر'' سے تصادم کی بنیاد پر اُن اخبارِ غیب کو جو کلام اللہ یا زبانِ نبوی سے صادر ہوئیں رد کر دینے کے قابل مانتے ہیں۔ یا پھر ان اخبارِ غیب کو معانی کے لحاظ سے اس قدر توڑ مروڑ دینا ضروری جانتے ہیں کہ وہ ان کی مزعومہ 'نیچر' کے ساتھ

نیچرسٹ: نصوصِ شریعت کو فزیکل لاز کے تابع رکھنا

فٹ بیٹھ جائیں اور بہر صورت 'نیچر' کے تابع رہیں۔ یعنی معتزلہ اخبارِ شریعت کو ''عقل'' کے تابع رکھتے تھے تو یہ لوگ ''فزیکل لاز'' کے تابع۔ دونوں کا میدان بالعموم غیبیات ہیں۔ اخبارِ غیب کی کھینچ تان اور توڑ مروڑ دونوں کے یہاں اِس قدر واضح نظر آتی ہے بلکہ بھونڈا پن کی حد کو پہنچتی ہے، کہ آدمی پوچھ اٹھتا ہے نصوص پر 'ایمان' کے اِس تکلف کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

۵) اخبارِ وحی کو ''مصدرِ دین'' نہ ماننے والوں میں پھر منکرین

منکرینِ حدیث: قدیم وجدت پسند

حدیث آتے ہیں۔ ''منکرین حدیث'' کوئی ایک طائفہ نہیں بلکہ بے شمار کنبے اور قبیلے ہیں۔ ان کا کوئی کنبہ کسی وقت اگر یہ بھی کہہ دے کہ 'ہم تو سنت کو مانتے ہیں' تو اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی رافضی کسی وقت آپ کو یہ کہہ دے کہ 'ہم تو سنت کو مانتے ہیں' مگر اس کی مراد اُس 'سنت' سے ہو جو اُس کے 'معصوم' مصادر سے پاس ہوتی ہو، یعنی اُس تصور کے مطابق جس کی مغایرت اہلسنت کے متفقہ تصور و مصادرِ سنت کے ساتھ واضح بھی ہے اور معلوم بھی۔

انکارِ حدیث کے مسلک پر پائے جانے والے قبیلے اور گوتیں اِس قدر کثیر کیوں ہیں اور کسی ایک رنگ میں کیوں نہیں رہتے.. یہاں تک کہ مختلف ملکوں کے اندر تو اِن میں رنگوں اور لیبلوں کا جو فرق ہے وہ ہے ہی، ایک ہی ملک کے اندر ہر دس بیس سال بعد کوئی نئی صورت پائی جاتی ہے؟

اِس لئے کہ ایک تو یہ کسی واضح بنیاد پر نہیں، لہٰذا ان کا سفر ہر دم جاری رہتا ہے اور ادھیڑ بن کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ (اپنی اِس مسلسل جاری نقل مکانی کے باعث... جہاں ان کے کچھ طبقے طریقِ حق سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں وہاں

اِن کے کچھ دوسرے طبقے حق سے قریب تر بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غرض ان کے ارتقاء کی، جوکہ کسی بھی وقت نہیں تھمتا، کوئی بھی سمت ہوسکتی ہے؛ حق سے بعد کی بھی اور حق سے قرب کی بھی۔ اور جب ایسا ہے تو اِن کے سب طوائف کے ساتھ معاملہ ایک سا نہیں رکھا جاتا[1])۔

دوسرا یہ کہ معاشرے کے اندر بیانِ حق جس قدر زور سے ہوتا ہے اُس کا بھی یہ طبقے یا ان میں سے کئی ایک، خصوصاً خیر پسند، براہِ راست اثر لیتے ہیں؛ اور بلاشبہ پچھلے کچھ عشروں میں یہاں پر یہ پیشرفت بھی ہوئی ہے۔ ''سنتِ رسول اللہؐ'' ایک ایسی زبردست اور روشن بین چیز ہے کہ اس کا بالکلیہ انکار اور رد کر دینا خاصی جرأت اور دل گردے کا کام ہے۔ قریباً ہر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ اِس کو کچھ نہ کچھ تو مان ہی لے۔ مگر اِس کا دائرہ کیا ہو؟ یہ وہ چیز ہے جس کے دائرہ کو اِن کا کوئی فریق کھینچتا چلا جاتا ہے اور کوئی فریق سکیڑتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک ہی فریق خود بھی اِس کو کئی کئی بار 'ایڈجسٹ' کرتا ہے۔ غرض اِسکی کوئی متعین شکل ان کے ہاں ہے ہی نہیں؛ اور یہ ایک ایسا معلوم واقعہ ہے جس کو جھٹلانا نرا مکابرہ ہے۔ خود اِن میں سے کئی ایک مانتے ہیں کہ یہ ایک ارتقائی عمل ہے اور اِس معاملہ میں نہ صرف کوئی اور، بلکہ یہ خود بھی کوئی آخری بات نہیں کہہ سکتے! (ایسی امت کا خدا حافظ جو اپنے نبیؐ کی ''سنت'' ایسی (اپنے دین کی) بنیادی ترین چیز کے تعین کی بابت کوئی حتمی ویقینی بات نہ تو جانتی ہو اور نہ کہہ سکتی ہو!...... یعنی گم گشتگی اور سرگردانی کی انتہا!)۔ اِس سرگردانی کو امت کے حق میں تو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر بیانِ حق کو ایسے کسی ماحول میں زیادہ سے زیادہ زوردار بنا دیا جائے تو خود اِن (جدت پسندوں) کے کچھ طوائف کو حق سے قریب تر کرنے کا امکان ضرور بڑھ جاتا ہے۔ کم از کم بھی یہ کہ اِنکے جو آئندہ ورژن آئیں

وہ سنت کو ''وزن'' دینے کے معاملہ میں حالیہ ورژن سے بہتر ہوں۔ تاہم اگر بیانِ حق کا عمل یہاں پر کسی کمزوری یا ابتری کا شکار ہوتا ہے تو آپ دیکھیں گے نقل مکانی کے عادی اِن قبائل کا رخ کسی دوسری سمت کو زیادہ ہونے لگا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا جا چکا، اِس صنف میں آنے والے مختلف گروہوں کے مابین تفاوت حد سے بڑھ کر ہے اور سب کے ساتھ ایک سا معاملہ ممکن نہیں، پھر بھی ''انکارِ حدیث'' کی توصیف اِن پر سب سے بڑھ کر فٹ آتی ہے اور یہی ان کے سبھی طوائف کے مابین ایک قدرِ مشترک۔

''مصدرِ تلقی'' کے حوالے سے آج کے بیشتر جدت پسندوں کو یہ ایک ہی وصف کفایت کر جاتا ہے، یعنی ''ردِ حدیث''۔ (۲) ظاہر ہے سنت رسول اللہؐ سے ہماری ___ اور سب اہلسنت طبقوں کی ___ مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی قولی و فعلی و تقریری احادیث۔ لہٰذا ہمارے اِس ماحول میں پائے جانے والے کسی ایسے فریق کے دعوائے قبولِ سنت سے فریب نہ کھانا چاہیے جو قبولِ حدیث کے معاملہ میں صاف صاف اہل حدیث و مذاہب اربعہ کے ایک معلوم اور معروف منہج کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اِن کے بعض طبقے، نبی ﷺ کی چند ایک باتوں کی آئینی حیثیت کو تسلیم کر کے اپنے اوپر سے ردِ سنت کا پورا الزام دھو دینا چاہتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں ''احادیثِ رسول اللہؐ'' کے ایک نہایت وسیع ذخیرہ سے، لے دے کر، کوئی بیس تیس باتیں ہی ہیں جو ''سنت'' کے نام سے اِن کے ہاں 'شرفِ قبولیت' پاتی ہیں۔ یوں سمجھئے، اپنے انکارِ حدیث میں کوئی بیس تیس جگہوں پر استثناء کر کے اب یہ امت کو جھانسہ دینے لگے ہیں کہ ''سنت'' تو ان کے ہاں بھی حجت ہی ہے۔

۶) نصوصِ شریعت کی مصدریت اور حاکمانہ حیثیت کو مسترد کر دینے کی ایک اور برہنہ مثال یہاں کے نام نہاد 'کلمہ گو' سیکولر ہیں۔ ''دین'' کو ''مذہب'' میں محصور کر دینے والے یہ طبقے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی اُن واضح بین نصوص کو جو معیشت، سیاست اور دیوانی و فوجداری امور سے متعلق ہیں یہ حیثیت دینے کے ہی روادار نہیں کہ خدا کی نازل کردہ یہ نصوص ہی اِن سب کے سب امور میں فیصل اور حکم ٹھہریں اور مسائلِ جہانی کے اندر حرفِ آخر قرار پائیں۔

سیکولرز: ''شریعت'' کو پوری زندگی پر محیط نہ ماننے والے طبقے

ان (سیکولرز) میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی نصوص کو معانی و مفہومات کے لحاظ سے اتنا توڑ مروڑ لیں کہ وہ ان کی اہواء کے مطابق ہو جائیں اور دینِ اینگلوسیکسن کے ساتھ لگا کھا جائیں۔ نیز جہاں کتاب و سنت کی نصوص کا اقتضاء ان کی اہواء کے موافق ہو وہاں کتاب وسنت کی نصوص کا کچھ تھوڑا بہت حوالہ دے لیں اور وہ بھی زیادہ تر آنکھوں میں دھول جھونکنے کے باب سے اور 'سیاست' کی کچھ ضرورتوں اور مجبوریوں سے۔ مگر ان میں سے بیشتر ایسے ہوں گے جو شخصی دائرہ سے باہر، یعنی امورِ مملکت کے باب میں، کتاب اللہ کے کسی ایک بھی لفظ اور سنت رسول اللہؐ کی کسی ایک بھی بات کو ''حجت'' ماننا تو درکنار ''قابل اعتناء'' ہی نہ جانیں گے۔ کیونکہ ''شخصی امور'' سے باہر کے دائرہ میں حکم دینا، خصوصاً امورِ مملکت کی بابت حکم اور ہدایت دینا نصوصِ شریعت کا منصب ہی نہیں؛ نصوصِ شریعت کا دائرہ ہی ان لوگوں کے نزدیک خاص 'مذہبی و روحانی' معاملات ہیں۔ تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔

☆☆☆☆☆

یہ ہوئیں چند مثالیں کتاب اور سنت کو تلقی کا مصدر ہی نہ ماننے کے حوالے سے۔ ظاہر ہے یہ وہ طبقے ہیں جو وحی کی اُن اخبار کو جو عہدِ صحابہؓ سے لے کر امت کے ہاں تسلیم ہوتی چلی آئی ہیں، حجت ماننے پر ہی تیار نہیں۔ ظاہر ہے، یہاں فہم اور استنباط اور استدلال ایسی کسی ''مخلصانہ کوشش'' کا مسئلہ نہیں کہ جس میں بھول چوک معاف ہوسکتی ہے، سرے سے یہ اس کو حجت اور تلقی کا مصدر ہی ماننے پر آمادہ نہیں۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو تلقی کا مصدر ماننے والا طائفہ منصورہ:

ظاہر ہے، بہت سے مسائل میں اہل سنت کے اپنے مدارس کے مابین بھی اختلاف ہوا ہے، یہاں تک کہ خود ایک ہی مدرسہ کے فقہاء کے مابین اختلاف ہوا ہے، کسی وقت نصوصِ شریعت کے ثبوت کے حوالے سے تو کسی وقت اِن نصوص کی دلالت کے حوالے سے۔ بلکہ اختلاف کی یہ ہر دو صورت کسی نہ کسی حد تک اصحابِ رسول اللہ ﷺ کے اپنے مابین بھی پائی گئی ہے۔

مدارس اہلسنت کا تنوع

تو پھر لازم ہے کہ کوئی ایسا دائرہ ہو، جس کے اندر اندر یہ چیز قابل برداشت بھی ہو۔ اور ایسا تو بہرحال نہ ہو کہ کسی ایک بھی نص کے ثبوت کے معاملہ میں یا اُس نص کی دلالت کے معاملہ میں کسی فقیہ کے یہاں اگر ہم کوئی دوسرا قول پالیں یا حتیٰ کہ اس کو (ہم اپنے خیال میں) کسی وقت غلطی پر پائیں **تو اِس بات کو ''مصدرِ تلقی'' کا ہی مسئلہ بنا ڈالیں**، جس کی بنیاد پر اُس فقیہ کا یا اُس کی تحقیق پر اعتماد کرنے والے کسی سنی طبقے کا شمار ہی آئندہ سے ہم اہل زیغ وضلال میں کیا کریں......! یوں ایک ایک مسئلہ پر اہل سنت

کے اپنے ہی مدارس کے مابین، بلکہ ہر ہر مدرسہ کے اپنے ہی اصحاب کے مابین، ایک محاذ کھڑا ہو جایا کرے!

آپ بھی اتفاق کریں گے کہ ایسا کوئی دائرہ ہونا تو چاہیے، مگر سوال یہ آ جاتا ہے کہ اِس دائرہ کی حدود کیا ہوں؟ اور کیا یہ محض ہماری اپنی مرضی پہ ہو کہ جس قدر چاہا اِس دائرہ کو وسیع کر دیا اور جس قدر چاہا سکیڑ دیا؛ جس کو چاہا اُس میں شامل کر دیا اور جس کو چاہا اُس سے باہر کر دیا!...... یا اس کیلئے کوئی پیمانہ بھی ہے؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے اور در حقیقت بہت سے راستے یہیں سے پھوٹتے اور یہیں سے الگ ہوتے ہیں۔

اِس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے: کہ وہ ''پیمانے'' کیا ہوئے جن کو ہم خود بنائیں؟! اور اگر کوئی پیمانہ ہمیں بنانا بھی ہو تو آپ جانتے ہیں ہر پیمانہ ہی اپنے وجود میں آنے کیلئے کسی اور پیمانے کا ضرورت مند ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مدارس اہلسنت دبستان صحابہؓ کا تسلسل ہیں

جہاں تک اس ''دائرہ'' کا تعلق ہے جس کی بابت اوپر سوال اٹھایا گیا ہے......، تو دراصل یہاں ایک ہی پیمانہ ہے جس سے، آگے چل کر، پھر ہزاروں پیمانے وجود میں آئے ہیں۔ پس یہ سب پیمانے، پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے جاتے جاتے، اگر اُس ''مثالی پیمانے'' کے ساتھ جا ملیں تو یہ ہمارے لئے درخورِ اعتناء ہوتے ہیں، ورنہ رد۔

یہ ''مثالی پیمانہ'' جو پھر آگے چل کر ہزاروں پیمانوں کیلئے مطلق بنیاد بنا...... یہ دراصل وہی پیمانہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی تیئیس سال کی محنت سے مالکِ آسمان کی ہمہ وقت نگرانی کے تحت ایک جیتے جاگتے انسانی واقعہ کی صورت میں

تشکیل دیا اور پھر رہتی دنیا تک کیلئے خود آپ اپنی زبان سے اس کو ''حق'' ہونے کی سند عطا فرمائی۔

ہماری مراد ہے مدرسہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ۔

یہ ایک باقاعدہ مدرسہ ہے جو وحی اور صاحبِ وحیؐ کے رموز و اشارات تک کو جان گیا تھا۔ اور یہ صلاحیت اِس نے خود صاحب وحیؐ کے زیرِتعلیم اور زیرِتربیت رہ کر اور طویل سالوں تک ایک ایک پل اُسؐ کی صحبت میں گزارنے کے نتیجے میں حاصل کی تھی۔ (اور یہ وہ بات ہے جس کا دعویٰ کوئی اور شخص یا دبستان کر ہی نہیں سکتا)۔ جلد ہی اِس مدرسہ میں پڑھنے والے پھر آگے پڑھانے لگے۔ خدا کا کرنا اِس مدرسہ کے جیتے جی آدھی دنیا اسلام کے قدموں میں ڈھیر ہوگئ؛ جس سے اِس مدرسہ کو ایک بڑی دنیا کو پڑھانے سدھانے اور چلانے کا موقعہ ملا اور شاید ہی کوئی اصولی معاملہ ہو جو اِس کے جیتے جی اِس امت کو پیش نہ آ گیا ہو۔

یہاں تک کہ وہ بڑے بڑے فتنے اور بحرانات turmoils بھی جو اِس قدر تیزی سے پھیلتے ہوئے کسی معاشرے یا کسی قلمرو کو پیش آ سکتے ہیں، اِس مدرسہ کی زندگی میں ہی رونما ہوئے۔ اب اِن فتنوں اور اِن بحرانات turmoils کے ساتھ یہ مدرسہ جس انداز سے پیش آیا وہ بھی اُن معیارات کا حصہ بنا جنہیں اِس مدرسہ میں پڑھنے والوں نے باقاعدہ ''علم'' کی طرح سیکھا اور اس کو ''پیمانہ'' باور کرتے ہوئے اپنے مابعد نسلوں کو منتقل کیا۔

یہ تابعینؒ تھے جنہوں نے سب علوم کو اور علوم کی سب فروع کو بے حد وحساب ترقی دی اور کمال انداز میں ان کی تطبیقات کیں مگر اُس پیمانے کی شدید ترین پابندی کرتے ہوئے جو ان کو اصحابِ رسول اللہؐ سے ملا تھا۔ یہ تابعینؒ تھے جو اپنے وقت

کے سب فتنوں اور بحرانوں کے ساتھ پورا اترنے میں عین اُنہی خطوط پر گامزن رہے جن پر انہوں نے صحابہؓ کو پایا تھا، نیز اندرونی وحدت وشیرازہ بندی کو بھی عین اُنہی بنیادوں پر قائم رکھنے پر کاربند رہے جن پر صحابہؓ رہے تھے۔ یہ تابعینؒ بھی تاریخ میں یونہی وجود میں نہیں آ گئے تھے۔ اِنہوں نے جس طرح علمائے صحابہؓ میں سے ایک ایک کا دامن تھاما، جس طرح اِنہوں نے علمائے صحابہؓ میں سے ایک ایک کی صحبت وملازمت اختیار کی، جس طرح یہ اُن کے دروازوں پر ہجوم کرتے رہے، اُن کے جوتے اٹھاتے رہے، اُن کے حلقوں میں دَم مار کر بیٹھتے رہے، اور جس طرح یہ اُن کے رمز شناس بنے، اور جس طرح یہ اصحابِؓ رسول اللہؐ سے اپنے علم وفہم کی تصحیح اور توثیق کراتے رہے، وہ اپنی مثال آپ ہے؛ اور آج کا کوئی دبستان ایسا نہیں ہے جس کے پہلوں نے اس کے بعد والوں کے، اپنے دبستان کے فہمیدہ ورمز شناس ہونے کی، ویسی توثیق کی ہو جیسی توثیق تابعین علیہم الرحمۃ کو علمائے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے حاصل ہوتی رہی۔

پھر تابعینؒ کے اِس مدرسہ میں تبع تابعینؒ پڑھے جنہوں نے فکر وعمل کے اُن سب جوانب کو جو اصحابِؓ رسول اللہؐ سے تابعینؒ کو منتقل ہو کر آئے تھے، خواہ یہ وہ جوانب ہوں جو لکھنے اور بولنے میں آتے ہیں اور خواہ وہ جوانب جو لکھنے اور بولنے سے بھی عیاں تر ہوتے ہیں اور باقاعدہ صحبت ورمز شناسی سے ہی مکتسب ہوتے ہیں.. فکر وعمل کے اُن سب جوانب کو یہ باقاعدہ ایک علم کی صورت میں تابعینؒ سے لیتے رہے۔

پس یہ وہی دبستانِ صحابہؓ ہے جس میں پڑھ پڑھ کر تابعینؒ آگے تبع تابعینؒ کو پڑھاتے رہے۔ (واضح رہے، ائمہ اربعہؒ تبع تابعینؒ میں آتے ہیں، یعنی یہ

صحابہؓ کے پوتا شاگرد بنتے ہیں)۔ اِسی دبستان کو علمائے سنت کی اصطلاح میں ''سلف'' کہا جاتا ہے۔

یعنی درحقیقت صحابہؓ کا مدرسہ......!

جس شخص کو یہ باقاعدہ ایک تسلسل نظر نہیں آتا اور جس شخص کو اِس مدرسہ کے اختیار کردہ معیارات کوئی معیارات نظر نہیں آتے، اور اسکی ایک ایک چیز دوسری پر بنا کرتی ہوئی اور ایک دوسری کے ساتھ گندھی ہوئی نظر نہیں آتی......، وہ اس شخص سے مختلف نہیں جو نصف النہار کے سورج کو سورج ماننے پر تیار نہ ہو۔

نصوص کے قبول وتلقی اور امتثال واتباع کا معیار اگر کسی کو یہاں سے نہیں ملتا تو پھر اس کیلئے کوئی معیار ہے ہی نہیں۔ ایسے شخص کو واقعتاً چاہیے وہ قیامت تک امت کو 'بحثوں' میں مشغول رکھے!

پس یہ ہے وہ دبستان جو ہمیں نہایت واضح انداز میں ایک پیمانہ فراہم کرتا ہے۔ اِس دبستان کے اندر پھر آگے (٣) کئی ایک دبستان ہیں۔ (٤)

(واضح رہے، یہاں ہماری گفتگو ''مصدرِ تلقی'' پر ہو رہی ہے اور ''مصدرِ تلقی'' کی بنیاد پر ''منحرفین'' اور ''متبعین'' کے مابین تمیز کیلئے درکار پیمانہ پر)۔

پس اِس دبستانِ سلف کو دیکھیں تو:

ا) نصوص کے قبول وتنقیح کے موضوع پر: کچھ باتیں ہیں جو اِس پورے دبستان اور اس کے سب مدارس کے مابین مشترک ہیں، اور یہ ایک بہت بڑا دائرہ ہے..

(اور درحقیقت یہ ہمارے اُس سوال کا جواب ہے جو ہم نے چار صفحات پیشتر اٹھایا ہے، یعنی ''متبعین حق'' کے اِس دائرہ کی حدود کیا ہونی چاہئیں اور

وہ کونسے طبقے ہوں گے جن کو اِس دائرہ سے باہر ہونے پر ہم ایک ''نئی چیز'' اور ایک ''انحراف'' قرار دیں گے؟)

ب) پھر نصوص کے قبول و تنقیح سے متعلق: کچھ باتیں ایسی ہیں جن میں اِس دبستان کے معروف و معتمد علیہ مدارس کے مابین کچھ فرق بھی پایا گیا ہے۔ (مثال کے طور پر ''اخبارِ آحاد'' کے قبول کرنے میں مدرسۂ حجاز یا مدرسۂ عراق کے معیارات کا قدرے مختلف ہونا، یا مدرسۂ مالک اور مدرسۂ شافعی کے مابین نصوص کے اثبات سے متعلق کچھ فرق پایا جانا)[٥] اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن پر اِس دبستان کے مختلف مدارس نے آپس کے اندر ایک صحت مند اختلاف تو کیا اور بحث و مناقشہ بھی خوب خوب کیا، مگر نہ تو اس پر وہ شدت اپنائی جو اِس دائرہ کے باہر کے لوگوں (مانند روافض، خوارج، قدریہ، جہمیہ، معتزلہ اور باطنیہ وغیرہ) کے ساتھ اپنا رکھنا یہ لوگ دین کا ایک باقاعدہ حصہ جانتے تھے.. اور نہ ان کو بنیاد بنا کر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ویسا کوئی محاذ کھڑا کیا۔

(اور یہاں سے ہمیں اپنے اُس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ نصوص کے قبول و تنقیح سے متعلق اصول رکھنے میں کتنا سا تنوع ہو تو آدمی اُسی ''دائرے'' کے اندر رہتا ہے جسے ہم ''اہل اتباع'' کا دائرہ قرار دیں؟)

اِس ''دبستانِ سلف'' کے مختلف مدارس کے مابین ہونے والے بحث و تنازعہ کے دوران اگر کچھ گرمجوشی بھی پائی گئی، یا حتیٰ کہ کسی وقت اُن کا آہنگ بلند بھی ہو گیا......تو یہاں سے بھی ہمیں کوئی معیار ہی ملا۔ مثلاً کسی کسی وقت ''اہل الحدیث'' و ''اہل الرأی'' کے مابین ــــ خاص علمی ماحول کے اندر، نہ کہ 'عامۃ الناس' کی سطح پر اور نہ ہی 'مسجدیں الگ کر لینے' والی سطح پر ــــ بحث و نزاع اور رَدّ و تعقیب کے اندر

کبھی کوئی شدت بھی آ گئی، یا مثلاً عبداللہ بن عباسؓ کچھ تلامذہ کو حجِ تمتع کے مسئلہ پر حدیث کے حوالہ کے سامنے ابو بکرؓ و عمرؓ کے فتاویٰ کا ذکر کر دینے پر از راہِ تعلیم یہ سرزنش تک کر دیتے ہیں کہ ''مجھے ڈر ہے تم پر آسمان سے پتھر نہ پڑنے لگیں، میں تمہیں بتاتا ہوں قالَ رسول اللہؐ اور تم مجھے بتاتے ہو قالَ ابو بکرؓ و عمرؓ؟''......تو یہ سب کچھ اُن اسالیب اور آداب کو واضح کرنے کیلئے جو نصوصِ شریعت کی تعظیم کے معاملہ میں خود اہل ایمان کے مابین کسی وقت اختیار کر لئے جاتے ہیں۔

تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ جس طرح یہ لوگ اہل اہواء و بدعات (مانند خوارج، روافض، قدریہ اور معتزلہ وغیرہ) کے خلاف باقاعدہ برسر جنگ ہو جاتے رہے اور اُنکے خلاف اپنی اس جنگ کو عامۃ الناس کی سطح تک لے جاتے رہے یہاں تک کہ اُن کے ساتھ مجالست اور مؤاکلت تک کو ممنوع ٹھہرا دیتے رہے، یہاں تک کہ اُن کو دھکے دے دے کر مساجد سے نکال دیتے رہے اور برسر محفل ذلیل و بے عزت کر کے اپنی مجالس سے اٹھا دیتے رہے...... یہ اسلوب دبستانِ سلف کے یہاں خود اپنے آپس کے فقہی مدارس کے مابین بہرحال روا نہیں رکھا گیا۔ خوارج اور روافض اور معتزلہ وغیرہ کے خلاف فقہائے عراق (اصحابِ ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ و محمدؒ) بھی برسر جنگ ہوئے، فقہائے حجاز (اصحاب مالکؒ) بھی اور فقہائے شام ومصر (اصحاب لیثؒ و اوزاعیؒ و شافعیؒ) بھی اور بغداد کے حنابلہ بھی۔ یعنی مبتدعہ کے خلاف یہ سب کے سب مدارس ایک صف اور ایک محاذ بن کر رہے اور شدت اپنانے میں بھی حد کر دیتے رہے، اور اِس (بدعات والے) محاذ پر ہم دیکھتے ہیں ہمیشہ ایسا رہا۔

لیکن جہاں تک اِن (اہل سنت مدارس) کے آپس کا معاملہ ہے تو اِن کے آپس کے مابین ایک وحدت اور یگانگت ہی رہی اور بحث وتنازعہ کا دائرہ خاص علمی

مجالس اور علمی ماحول سے باہر نہیں جانے دیا گیا۔ کہاں اہل بدعت و اہل ضلال کے ساتھ وہ شدید ترین اور درشت ترین رویے اور کہاں آپس کا یہ معاملہ کہ امام بخاریؒ کسی وقت فقہائے عراق کے خلاف اپنا پوائنٹ لائیں تو ''قال بعض الناس'' سے بڑھ کر کوئی ایک لفظ نہ بولیں!

صحابہؓ کا یہ مدرسہ اپنے پہلے تین ادوار میں، کہ جب اِس کی آب وتاب آسمان تک پہنچتی تھی، ''سلف'' کے نام سے تعبیر ہوتا ہے۔ بعدازاں یہی مدرسہ ''اہلِ سنت'' کے عنوان سے اپنا تسلسل قائم کر کے رہا۔ تاہم اِس مدرسہ کے معیارات سامنے آنے کا بہت بڑا کام ''دورِ سلف'' میں ہی اِس کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا کہ بعدازاں اِس کے اندر کوئی بہت اساسی کام نہیں کرنا پڑا۔ بعد کے اِن تمام ادوار میں ''اہل سنت'' کو کوئی چیلنج رہا تو وہ یہی کہ وہ ''سلف'' کے قائم کردہ معیارات پر کوئی آنچ نہ آنے دیں اور زمانے کی آندھیوں کو ان پر اثر انداز نہ ہونے دیں۔ یعنی اصل اور بنیادی کام جو بھی ہوا دورِ سلف میں ہی انجام پا گیا۔

اب ''دورِ سلف'' سے گزر کر بعد کے ''ائمۂ سنت'' کے دور میں بھی آجایئے...... اہل بدعت کے خلاف محاذ بدستور گرم رہا بلکہ کسی کسی وقت اور بھی شدت اختیار کر گیا، جبکہ اہل سنت کے اپنے مدارس کے مابین معاملہ علمی بحث و رَدّ کے دائرہ سے باہر نہیں گیا۔ یعنی آپس کے اِن علمی نزاعات کے معاملہ میں نہ ایک دوسرے کو ''دائرۂ حق'' سے باہر ٹھہرایا گیا اور نہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی ایک بھی فریق اپنا کیس 'عوام' کی عدالت میں لے کر گیا۔ بدعتی ٹولوں کو ضرور وعیدیں بھی سنائی گئیں اور تائب ہو جانے کی تاکیدیں بھی؛ مجالس کے اندر بھی اور برسرِ منبر بھی۔ مگر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ یہ اسلوب نہیں اپنایا گیا۔ **تیسری صدی**

ہجری سے لے کر آٹھویں، نویں اور دسویں صدی ہجری تک اتنے بڑے بڑے علم کے پہاڑ ائمۂ سنت ہو گزرے ہیں، کبھی کسی کے ہاں حنفیوں کو اُن کے مذہب سے ''تائب'' کروانے کی تحریک چلائی گئی ہو، شافعیوں کو اُن کی ''گمراہی'' سے نکل آنے کی کوئی صدا گلی گلی لگائی ہو، مالکیوں اور حنبلیوں کو ''ضلالت'' کی وعیدیں سنانے کا کوئی صبح شام کا مشغلہ اختیار کیا گیا ہو، غیر مقلدوں کو ایک ''گالی'' بنا کر پیش کرنے اور امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ وغیرہ کی ''نافرمانی'' پر ان کو ''راہِ حق سے برگشتہ'' قرار دینے کی کوئی دعوتِ عام برپا کی گئی ہو......ایسی کوئی بھی چیز آپ کو اِن ائمہ فقہاء ومحدثین اور اِن علمائے عقیدہ کے ہاں نہ ملے گی۔

اب جب ائمۂ سنت کے یہاں ایسی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی......تو یا تو یہ سب کے سب ائمہ 'رواداری' کے کسی ایسے منہج پر ہوں جو ہمیں آج کے دانشور ٹولوں کے ہاں ملتا ہے؛ کہ کسی کو گمراہ کہنا ہی نہیں۔ ظاہر ہے ایسی بھی بات نہیں ہے: اہل بدعت کے خلاف یہ ائمہ ننگی تلوار ہی بن کر رہے ہیں۔ جبکہ 'حنفی Vs شافعی' اور 'مقلد Vs غیر مقلد' ایسی جنگوں کی حوصلہ افزائی بھی اِن ائمۂ علم نے کبھی نہیں کی ہے، بلکہ جس حد تک ہو سکا اِن داخلی جنگوں کی حوصلہ شکنی ہی کی۔ اہل سنت کی اِن داخلی جنگوں کو ''تعصب'' سے تعبیر کیا، اور ہاں اِس ''تعصب'' کے خلاف البتہ ضرور ایک شدید ترین جنگ کی۔ یہ سب بلا وجہ نہ تھا۔ یہ دراصل اُس ''معیار'' کی عملی تطبیق تھی جو اِس باب میں ''دورِ سلف'' سے لے کر چلا آیا تھا، اور جو ہر دور کے اہل حق پر یہ نہایت واضح کر دیتا رہا ہے کہ ان کو جنگ کرنی ہے تو کس محاذ پر اور وحدت و اُلفت قائم کرنی ہے تو کس دائرہ کے اندر۔

☆☆☆☆☆

یہ سب اہل اتباع میں آتے ہیں

""فہم دین"" کے معاملہ میں ""سلف کی اتباع"" کی اہمیت اور لزوم پر ابھی ہم آگے چل کر بات کریں گے (کتاب کے حصہ دوم وسوم میں)۔ یہاں پر جتنی گفتگو ہوئی وہ اسلئے کہ اُس ""دائرہ"" کا تعین ہو جائے جس کے اندر نصوص کے قبول اور تنقیح (تلقی) کے معاملہ میں اگر کوئی ""تعددِ آراء"" پایا گیا ہے تو اس کو باعث تفرقہ نہ جانا جائے؛ یعنی ""اہل سنت"" کے دائرہ میں آنے والے اِس ""تعددِ آراء"" یا ""تعددِ مدارس"" کو سامنے رکھتے ہوئے ہی ""اہل اتباع"" کے ایک وسیع تر دائرہ کا تعین اور شناخت کی جائے۔

اِس دائرہ کے اندر آپ ضرور اپنے لئے خوب سے خوب تر کی تلاش کیجئے اور اپنی علمی وفکری ترجیحات کو دیگر فریقوں کے ساتھ بھی کھل کر شیئر کیجئے: بحث ونقاش کی راہ بھی پوری طرح کھلی ہے؛ صحت مند تبادلۂ افکار جتنا چاہیں کریں، مگر اِس دائرہ کے اندر پائے جانے والے فریقوں کے اختلاف کیلئے ""ہدایت Vs ضلالت"" اور ""نجات Vs بربادی"" ایسے الفاظ پر مشتمل ایک عمومی قاموس سے بہرصورت اجتناب فرمائیں......۔ قصہ کوتاہ، یہ وہ دائرہ ہے جو ایک وسیع تر معنیٰ میں ایک ہی جماعت ہے، جسے ہم ""اہل سنت"" یا ""اہل اتباع"" کہتے ہیں اور جس کا مصدرِ تلقی اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ اِس ""جماعت"" کا ہر فریق اپنے تمام استنباطات و استدلالات، یہاں پر پائے جانے والے تمام تر تنوع کے علی الرغم، اِنہی دو بابرکت مصادر سے کرتا ہے۔

اِس بیان کے بعد یہ واضح ہو جانا کچھ مشکل نہیں کہ: آج آپ کے سامنے مذاہب اربعہ کی صورت میں جو طوائف پائے جاتے ہیں یعنی احناف، شوافع، مالکیہ اور حنابلہ (جبکہ ہمارے برصغیر میں مذاہب اربعہ میں سے ایک بڑی سطح پر صرف

احناف پائے جاتے ہیں اور یا پھر محدودسی سطح پر، خصوصاً ہمارے جنوبی ساحلوں پر، شوافع).. پھر اِن مذاہب اربعہ کے علاوہ بھی جو طوائف کتاب اور سنت کو اپنے تلقی کی بنیاد ماننے والے پائے جاتے ہیں، چاہے ان کا کوئی خاص نام ہے مانند اہل حدیث و اہل الظاھر وغیرہ (جن کی ایک معتد بہ تعداد برصغیر کے اندر پائی جاتی ہے) یا ان کا کوئی خاص نام نہیں ہے...... یہ سب گروہ ''مصادرِ دین'' کی بابت کوئی بہت بنیادی و جذری اختلاف نہیں رکھتے، اور اس بنا پر یہ سب کے سب اصحابِ اتباع میں آتے ہیں (٦)۔ ان سب طوائف کے مصادرِ دین کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ اور اجماعِ امت ہیں۔ البتہ ان مصادر سے فہم وفقہ لینے میں ان طوائف کے مابین ضرور ایک تنوع پایا جاتا ہے.. جو کہ جب تک صحت مند رہا، اور بلاشبہہ کئی صدیاں ایسا رہا، امت کی فقہی تاریخ کے ایک قابل رشک واقعے کے طور پر دیکھا گیا۔ ہاں اس ''تنوع'' کے اندر ان آخری زمانوں میں آکر اب بڑی سطح پر ایک اضطراب بھی پایا جانے لگا ہے؛ جس کے باعث یہ ''تنوع'' بڑی حد تک اب ایک ''تضاد'' کی صورت دھار گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی صورت درست کرنا اب بے حد ضروری ہوگیا ہے...... اور یہی وہ ضرورت ہے جس نے ہمیں اپنی یہ ناچیز تالیف سامنے لانے پر آمادہ کیا ہے۔

المختصر، یہ سب طبقے معتبر علمائے امت کی نگاہ میں اہل سنت کے اندر آتے ہیں۔ نیز یہ سب طوائف آج پیدا نہیں ہوئے بلکہ کوئی ہزار بارہ سو سال سے امت کی تاریخ میں ''ایک جماعت'' اور ''ایک محاذ'' چلے آتے ہیں۔ ہمیشہ، یہی ___ مل کر ___ باہر سے حملہ آور دشمن کے خلاف جہاد کیلئے صف آرا ہوتے رہے ہیں.. اور یہی، اپنے گھر کے اندر نقب زن اہل بدعت و اہل زندقہ کے خلاف، ___ مل کر ___ سیسہ

پلائی ہوئی دیوار بن جاتے رہے ہیں......۔ اور آج بھی امت کے سب اندرونی و بیرونی محاذوں پر اِسی ایک جماعت ہی کے __ مل کر __ صف آرا ہونے کی دیر ہے، کہ وہ خوبصورت کہانی جو کچھ دیر سے رک سی گئی ہے، بلکہ اِس جماعت کے اپنے ہی فریقوں کے مابین ایک جنگ کھڑی ہو جانے کے باعث بدصورتی کا بھی شکار ہو چکی ہے، پھر سے اپنی اُسی آب وتاب کے ساتھ شروع ہو جانے والی ہے اور آسمانی نصرت کو بھی منا کر ایک بار پھر اپنی پشت پر لے آنے والی ہے...... بلکہ کوئی دیکھنا چاہے تو اِس کی شروعات دیکھ بھی سکتا ہے!

☆☆☆☆☆

(حاشیہ ۱)

برصغیر کے اہل علم کی معتد بہ تعداد نے انکارِ حدیث کے حوالہ سے یہاں پر پائے جانے والے ایک نہایت مشہور طائفہ، جو ''پرویزیوں'' کے نام سے معروف رہا ہے، کی تکفیر کی ہے۔ ''ردحدیث'' کے حوالے سے یہ ایک نہایت صریح وبدزبان طائفہ رہا ہے اور وہ باتیں جو آدمی زبان پر لا تک نہیں سکتا اِس طائفہ کے ہاں محاوروں کی حیثیت اختیار کئے رہی ہیں۔ پس واضح رہے، تکفیر ایسا شدید حکم ''پرویزیت'' ایسے ہی کسی صریح الکفر طائفہ کیلئے ہی روا ہے۔ البتہ ''ردحدیث'' کا فنامنا اِس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ہزار شکلوں میں پایا جاتا ہے؛ اور سب پر اِس قسم کا شدید حکم لگانا اہل علم سے ثابت نہیں۔

(حاشیہ ۲)

یہاں بات ''مصدرِ تلقی'' کے حوالے سے ہو رہی ہے جو کہ اہلسنت کے ہاں شدید سختی کا متقاضی ایک مبحث ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ نصوص کی تفسیر اور

تعبیر کے میدان میں جدت پسندوں نے مصائب کھڑے کر کے نہ دیے ہوں۔ لہٰذا فہم اور تفسیر کے حوالے سے بھی بہت سی باتیں ہیں جو جدت پسندوں کے پیدا کردہ مصائب کے حوالے سے اس کتاب میں آگے چل کر واضح کی جائیں گی۔

(حاشیہ ۳)

سنی مذاہب کا صحابہ رضکے مدارس کا ایک تسلسل ہونا

مراد ہے اسلام کے وہ اولین فقہی مدارس جن کی بنا دورِ صحابہؓ ہی کے دوران پڑ گئی تھی۔ خلفائے راشدین کے ابتدائی عہد میں معاملہ اور تھا؛ جب ''نصوص'' کا سرمایہ بھی سب کا سب مدینہ ہی میں پڑا تھا اور ''قلوب'' کا سرمایہ بھی۔ البتہ بعدازاں، جیسے ہی اِس مدرسہ کے درخشاں ستارے مفتوحاتِ اسلام میں اپنی اپنی روشنی بکھیرنے کیلئے جہان بھر کے اندر پھیل گئے، وہ پہلے والا معاملہ کہ جب سارے کا سارا علم اور اِس علم کے مخزن وہ سب کے سب پاکیزہ قلوب مدینہ کے اندر یکجا پائے جاتے تھے، باقی نہ رہا.. چنانچہ اب ایک دوسرا عہد شروع ہوا جو کہ ''فقہی مدارس'' کے وجود میں آنے، پروان چڑھنے، اور بالآخر ہر مدرسہ کے اپنے اپنے اصول اور امتیازات سامنے آنے پر منتج ہوا۔

یہ جو دوسرا عہد ہے، اور جو کہ دورِ صحابہؓ ہی میں شروع ہو جاتا ہے، اپنی نوعیت و ماہیت کے اعتبار سے ایک نئی ڈویلپمنٹ تھی۔ ہمارے وہ سادہ لوح طبقے جن پر (صحابہؓ کے بلادِ عالم میں متفرق ہونے سے پیدا شدہ) یہ نئی علمی تصویر واضح نہیں، وہ بہت سی الجھنیں پیدا کر کے لوگوں کو دے دیتے ہیں۔

اِس کی کچھ وضاحت آپ کو اِس بات سے ہو جاتی ہے کہ خلیفہ منصور (بعض

حواشی

روایات کی رو سے رشید)☆ نے جب امام مالکؒ کے سامنے اپنے اِس ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ مؤطا مالک کو سب مسلم خطوں میں لاگو کر دے، تو امام مالک نے خلیفہ کو اِس سے منع کرتے ہوئے اس کی جو وجہ بیان کی وہ آج بھی ہمارے لئے قابل غور ہے۔ امام مالک کی اِس بات کا لب لباب یہ تھا کہ: اصحابؓ رسول ﷺ مختلف امصار (خطوں) کے اندر پھیل گئے تھے؛ نتیجتاً ایک خطہ کے لوگ جن اقوال اور روایات اور فتاویٰ کو ایک بار اپنا معمول بنا چکے، لوگوں کو اُس سے ہٹا کر ایک دوسری چیز تھمانا اُن کو مشقت میں ڈال دینے کا موجب ہے۔ کسی خطے کا جو معمول (عہد صحابہؓ سے لیکر) چل گیا، اب اُسی کو چلنے دیا جائے۔

ابن تیمیہؒ نے امام مالکؒ کے جو الفاظ نقل کئے وہ یہ ہیں:

إن أصحابَ رسولِ الله ﷺ تفرقوا فی الأمصار، وقد أخذ كل قوم من العلم ما بلغهم۔

(مجموع الفتاویٰ، ج ۳۰، ص ۷۹، کتاب الفقه، باب الشرکة، فصل سئل عمن ولی أمرا)

''اصحابِ رسول اللہ ﷺ ملکوں کے اندر بکھر گئے تھے۔ اب ہر قوم (اُنکے) علم سے وہ چیز لے چکی ہے جو اُنکو (اُن صحابہؓ سے) پہنچی ہے''

ذہبیؒ نے امام مالکؒ کے الفاظ کچھ زیادہ تفصیل سے نقل کئے ہیں:

يا أمير المؤمنين لا تفعل۔ فإن الناس قد سبقت إليهم أقاويل، وسمعوا أحاديث، ورووا روايات، وأخذ كل قوم بما سبق إليهم، وعملوا به، ودانوا به، من اختلاف أصحابِ رسول الله ﷺ وغيرهم، وإن ردَّهم عما اعتقدوه شديد، فدعِ الناس وما هم عليه وما اختار أهل

☆ بعض علماء نے اِس کی یہ توضیح کی ہے کہ منصور اور رشید ہر دو نے اپنے اپنے دور میں امام مالکؒ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی ہو، اور امام مالکؒ نے ہر دو موقعہ پر یہی جواب دیا ہو۔

كل بلد لأنفسهم۔ (سير أعلام النبلاء، ج ٨، ص ٧٨ ط مؤسسة الرسالة)

امیر المومنین! ایسا مت کیجئے۔ کیونکہ اِس سے پہلے لوگوں کے یہاں اقوال پہنچے ہوئے ہیں۔ لوگوں تک (مختلف) احادیث پہنچی ہوئی ہیں۔ (مختلف) روایات اُنکو ملی ہوئی ہیں۔ اصحابِ رسول اللہ ﷺ و دیگر اہل علم کے اختلاف سے ہرقوم کو جو چیز پہنچی وہ اس کو لے چکی۔ اُس کو معمول بنا چکی، اور اُسکو دین کے طور پر اختیار کر چکی۔ اب وہ جس چیز کے قائل ہو چکے، اُس سے اُن کو ہٹانا ایک شدید بات ہے۔ لہٰذا لوگوں کو اب ان کے حال پر چھوڑ دیجئے، اور ہر ملک کے لوگوں نے جن اشیاء کو اختیار کر لیا اُن کو اُسی پر رہنے دیجئے۔

(حاشیہ ٤)

مثال کے طور پر: **دبستانِ مدینہ** جس کی گدی عائشہؓ، زید بن ثابتؓ اور ابن عمرؓ سے ہوتی ہوئی، اور پھر سعید بن مسیّبؒ، عروہ بن زبیرؒ اور فقہائے سبعہ وغیرہ سے ہوتی ہوئی، اور آگے زہریؒ اور یحیٰی بن سعیدؒ سے **منتقل** ہوتی ہوئی مالک بن انسؒ کے پاس آتی ہے۔ **دبستانِ مکہ** جس کی گدی ابن عباسؓ سے ہوتی ہوئی، اور پھر عکرمہؒ، مجاہدؒ اور عطاءؒ سے ہوتی ہوئی، اور آگے سفیان بن عیینہؒ اور مسلم بن خالدؒ سے **منتقل** ہوتی ہوئی محمد بن ادریس شافعیؒ کے پاس آتی ہے (شافعیؒ کے دورِ اول کے لحاظ سے)۔ **دبستانِ عراق** جس کی گدی علیؓ بن ابی طالب و ابن مسعودؓ سے ہوتی ہوئی، اور پھر علقمہ بن قیسؒ اور قاضی شریحؒ سے ہوتی ہوئی، اور آگے ابراہیم نخعیؒ اور پھر حماد بن سلیمانؒ سے **منتقل** ہوتی ہوئی ابو حنیفہ النعمانؒ کے پاس آتی ہے۔ **دبستانِ مصر** جس کی گدی عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ہوتی ہوئی، اور بعد ازاں یزید بن حبیبؒ، اور بعد ازاں لیث بن

حواشی

سعدؒ وغیرہ سے منتقل ہوتی ہوئی محمد بن ادریس شافعیؒ کو ملی (شافعیؒ کے دور دوئم کے لحاظ سے)۔ اوراس کے علاوہ کئی دبستان۔

(حاشیہ ۵)

خبرِ واحد: جدت پسندوں کا الحاد اور مسلکی رجحانات کی چپقلش

اخبارِ آحاد کے قبول و عدم قبول کے حوالہ سے یہاں ہم کچھ بنیادی امور کو واضح کر دینا چاہیں گے......

۱) قرآن تو اللہ کے فضل سے پورے کا پورا متواتر ہے۔ **حدیث کا بھی ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو اگر متواتر نہیں تو بھی محدثین و فقہائے اہلسنت کے ہاں محل اتفاق ہے۔**

جن احادیث کو قرونِ سلف میں بالاتفاق قبول کیا گیا ہے؛ اور مذاہب اربعہ سمیت زمانۂ اول کے سب علمائے سنت نے اُن احادیث کو اپنے استدلال و احتجاج کی بنیاد بنایا ہے...... اور جو کہ احادیث کا ایک بے حد بڑا ذخیرہ ہے؛ اگرچہ فنی اعتبار سے وہ احادیث 'متواتر' کی تعریف میں نہ آتی ہوں پھر بھی عملی و واقعی اعتبار سے وہ احادیث قطعی طور پر حجت ہیں، بلکہ بقولِ امام ابو العزؒ: وہ متواتر ہی کی ایک قسم ہیں؛ بعد کے ادوار کا ہر وہ جدت پسند جو ان احادیث کو مشکوک ٹھہرانے کیلئے زور لگائے گا، اگرچہ وہ اِس مقصد کیلئے ہمارے اصولِ حدیث ہی کے ساتھ کیوں نہ کھیل رہا ہو اور بے شک وہ اِدھر اُدھر سے اہلسنت کی کتبِ رجال کے حوالے ہی کیوں نہ دے رہا ہو، ایسا جدت پسند الحاد اور زندقہ کا ایک دروازہ کھول کر امت کو دے رہا ہوگا اور اپنی کسی ھوائے نفس کی ہی تسکین کر رہا ہوگا اور اپنے زمانے کے باطل کی ہی کسی نہ کسی خدمت میں لگا ہوگا۔ ایک مسلمان کیلئے ایسے گمراہ شخص کی بات سننا تک صحیح نہیں ہے۔

پس یہ بات سمجھ لی جانا ضروری ہے کہ ایک مجرد انداز میں حدیث کی جو اقسام بیان کی جاتی ہیں مثل ''مستفیض'' یا ''عزیز'' یا ''غریب'' وغیرہ.. حدیث کی اِن اقسام اور اِن تعریفات کا نظری طور پر زیر بحث آنا اور کسی کسی وقت بخاری یا مسلم یا موطا وغیرہ سے ''مستفیض'' یا ''عزیز'' یا ''غریب'' وغیرہ کی مثالیں دے لی جانا محض اور محض ایک طالبعلمانہ عمل ہے اور اس کا کل تعلق سیکھنے سکھانے کے ساتھ ہے۔ البتہ جہاں تک حقیقت کا معاملہ ہے: تو وہ چند ہزار احادیث (برسبیل مثال) **جو ایک بار بخاری میں ثبت ہوگئیں اور امت کے ہزاروں کے ہزاروں علمائے محدثین اُس پر اپنے مکمل علمی بھروسہ کا اظہار کر چکے اور امت کے ہزاروں کے ہزاروں علمائے فقہاء ان احادیث کو اپنے احتجاج کی بنیاد بنا چکے** (جبکہ اپنے متن اور مضمون کے اعتبار سے یہ عین وہی احادیث ہیں جن کو ہزاروں کے ہزاروں علمائے محدثین وفقہاء نے بخاری میں درج ہونے سے پہلے بھی عین یہی حیثیت دے رکھی تھی؛ یعنی امت کے محدثین اِن احادیث کو صحیح جانتے تھے اور امت کے فقہاء ان کو احتجاج کی بنیاد مانتے تھے؛ بخاری نے اس حوالے سے کوئی بھی نیا کام نہیں کیا)...... **تو امت کے ہزاروں کے ہزاروں محدثین وفقہاء کی اِس شہادت کے آجانے کے بعد** یہ احادیث نہ تو محض محمد بن اسماعیلؒ نامی ایک شخص کی تصنیف رہ گئیں اور نہ ہی مجرد 'مستفیض' یا 'عزیز' یا 'غریب' قسم کی کوئی چیز۔ **امت کے اِن احادیث کو قبول کر لینے کے واقعہ** نے اِن احادیث کو اب اِس سے ایک بہت اوپر کی حیثیت دے دی ہے؛ یہ احادیث اب امر ہو چکیں؛ یعنی پتھر پر لکیر۔ قیامت تک اب جس کو بھی آنا ہے اُسکو اِن احادیث کو من وعن لے کر آگے چلنا ہے۔ اِن میں مین میخ نکالنے یا ان کو کنڈم ٹھہرانے کیلئے ایسی کسی حدیث کا

حواشی

فائل نئے سرے سے کھولنے کا عمل ابتداءً اور اصولاً باطل ہے؛ ایسے شخص کے ساتھ اُس حدیث پر 'فنی بنیادوں پر' جھگڑا کرنا تو بعد کی بات ہے۔ یہی حکم اِس صنف میں آنے والی اُن ہزاروں حدیثوں کا ہوگا جو صحیح مسلم میں آئی ہیں اور یہی حکم موطا یا مسند یا سنن وغیرہ میں آنے والی ہزار ہا ہزار احادیث کا ہوگا۔

دوبارہ عرض کر دیں: یہاں ہم اُن احادیث کی بات کر رہے ہیں جو قرونِ سلف میں امت کے محدثین کے ہاں ثبوت کے معاملہ میں اور امت کے فقہاء کے ہاں احتجاج کے معاملہ میں قبول ٹھہر چکی ہیں، اور جو کہ ذخیرۂ حدیث کا ایک بے حد بڑا حصہ ہے۔

امام ابن ابی العز الحنفیؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف شرح عقیدہ طحاویہ کے اندر رقمطراز ہیں:

وخبر الواحد إذا تَلَقَّته الأمةُ بالقبول، عملاً به وتصديقاً له، يفيد العلم اليقيني عند جماهير الأمة، وهو أحد قسمي المتواتر۔ ولم يكن بين سلف الأمة في ذلك نزاع۔

(شرح الطحاوية، ص ۳۹۹)

خبر واحد جب ایک بار امت کے ہاں قبول ٹھہر چکی ہو، اُس پر عمل ہو جانے کی صورت میں اور اُس کو سچ مان لیا جانے کی صورت میں.. تو علمائے امت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ یہی مذہب رکھتے ہیں کہ ایسی خبر علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ اور یہ متواتر ہی کی دو قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ **سلفِ امت کے مابین اِس معاملہ میں ہرگز کوئی اختلاف نہ تھا۔**

۲) رہ گئی اخبارِ آحاد کی وہ صنف: {وہ احادیث: أ} جن کے ثبوت کے معاملہ میں قرونِ سلف کے محدثین کے مابین اختلاف ہوا ہو، {ب} یا جن

سے احتجاج کے معاملہ میں قرونِ سلف کے فقہاء کے مابین نزاع ہوا ہو......تو اُن پر علمی مذاکرے کوئی آج بھی جتنے چاہے کرسکتا ہے اور اُن کے ثبوت یا ان سے احتجاج پر فریق مخالف کو غلط ٹھہرانے کا حق بھی وہ یقیناً رکھتا ہے.. مگر یہ اختلاف کا یہ وہ دائرہ ہے جس میں وعید اور شدت کا انداز نہیں اپنایا جائے گا۔ اور نہ اِس کو عداوت اور تفرقہ کی بنیاد بنایا جائے گا۔

اختلاف کا وہ دائرہ جو قرونِ سلف کو حاصل تھا__ خواہ کسی حدیث کے ثبوت کے معاملہ میں ہو یا اُس حدیث سے احتجاج کے معاملہ میں__ اختلاف کا عین وہی دائرہ آج ہمیں بھی حاصل رہے گا۔ یہاں پر علمی اخذ و رد کوئی جتنا چاہے کرے، کہ یہ ایک صحتمند عمل ہے، **مگر یہ محاذ آرائی کا میدان بہرحال نہیں۔**

اِس دائرہ کے اندر:

کسی ایک حدیث کے ثبوت یا اُس سے احتجاج کے معاملہ میں حنفیہ اور شافعیہ کے مابین ہونے والے علمی مناقشہ پر کتابوں کی کتابیں وجود میں آ سکتی ہیں اور جس میں کوئی حرج کی بات نہیں، البتہ اُس حدیث کے ثبوت یا احتجاج کے معاملہ میں حنفیہ اور شافعیہ دست و گریباں نہیں ہوں گے۔

مالکیہ اور ظاہریہ (واہلحدیث) کسی ایک حدیث کے ثبوت یا عدم ثبوت کے موضوع پر یا اُس سے احتجاج یا عدم احتجاج کے مسئلہ پر اپنا پورا علمی زور صرف کریں گے اور ایک دوسرے کے پوائنٹس کا خوب خوب صفایا کریں گے، جس میں ہرگز کوئی حرج کی بات نہیں؛ مگر ایک دوسرے پر 'حدیث کا منکر' یا 'نبی ﷺ کا نافرمان' ہونے کے فتوے نہیں لگائیں گے اور نہ ہی ایک دوسرے کو 'شرک فی الرسالت' کا طعنہ دیں گے۔ نیز اِن علمی اختلافات کو 'عوام کی

حواشی

عدالت' میں لے کر بھی نہیں آئیں گے۔

۳) جہاں تک اِس (مؤخر الذکر) صنف میں آنے والی اخبارِ آحاد کے اِسنادی ثبوت کا تعلق ہے ___ **اور جوکہ زیادہ تر مصطلح الحدیث اور علم الرجال کا موضوع** ہے ___ تو یہاں پر کسی حدیث کی تصحیح اور تضعیف پر محدثین کے مابین جو کوئی اختلاف ہو جاتا ہے، وہ تو کسی حد تک ہمارے عام نوجوانوں کیلئے قابل فہم ہوتا ہے (**گو وہاں پر بھی بسا اوقات ایک علمی اختلاف کو مسلکی افتراق کی بنیاد بنا لیا جاتا ہے**، جس طرح کہ (صرف ابتدائی) رفع الیدین پر عبد اللہ بن مسعودؓ کی حدیث جس کو محدثین کی ایک تعداد بشمول شیخ البانیؒ ☆ نے بہرحال قبول کیا ہے، پھر بھی ایک حدیث کے مجرد ثبوت وعدم ثبوت کے مسئلہ کو 'کفر واسلام' ایسا مسئلہ تک بنا دیا جاتا ہے!)۔ یہاں مسئلہ ایک حدیث کو فنی بنیادوں پر صحیح یا ضعیف ٹھہرانے کا ہے اور اس میں محدثین کا اگر کوئی اختلاف ہو جاتا ہے تو یہ بات سمجھ آنا بہرحال کچھ ایسا مشکل نہیں، سوائے کچھ بہت ہی متعصب طبقوں کیلئے۔

۴) البتہ جہاں تک اِس صنف میں آنے والی اخبارِ آحاد سے احتجاج کا تعلق ہے ___ **اور جوکہ اصولِ فقہ واستدلال کا موضوع ہے** ___ تو یہاں فقہائے امت کے مابین جو کوئی اختلاف ہو جاتا ہے وہ ہمارے اُن نوجوانوں کیلئے جو اسلامی علوم میں نو آموز ہیں قدرے ناقابل فہم رہتا ہے اور اس وجہ سے ہمارے یہ نوجوان ایک بڑے افراط اور تفریط کا شکار بھی ہونے لگتے ہیں؛ البتہ یہاں کے مسلکی اختلافات اِفراط وتفریط کے اِن رجحانات کو بھڑکانے بھی لگتے ہیں، یہاں تک کہ دورِ سلف کے بعض بزرگوں کی بابت ایک نہایت منفی تاثر بھی پیدا کراتے ہیں۔

☆ دیکھئے "صحیح الترمذی" از البانی حدیث رقم ۲۱۱ ص ۸۲، نیز "صحیح سنن ابی داود" از الانی حدیث رقم ۶۸۳۔ ص ۱۴۳

اب اِس سلسلہ میں مثال ہم امام ابوحنیفہؒ کی نہیں دیں گے کیونکہ یہاں کے کچھ مفرط رجحانات امام ابوحنیفہؒ کو مدرسہ اہل الرأي کا سرخیل ہونے کی بنا پر 'شک کا فائدہ' دینے تک کے روادار نہیں۔ نیز اُن کو حدیث کا عالم ماننے پر بھی تیار نہیں۔ یہاں مثال ہم امام مالکؒ کی دیں گے جو مدرسہ اہل الحدیث کے سرخیل ہیں، بستیِ رسولؐ کے بلا نزاع امام، اور عائشہؓ و ابن عمرؓ کے گدی نشین، وہ ہستی کہ جس کی زندگی حدیث کے تعلیم و تعلم میں گزری، رسول اللہ ﷺ کا خالی ذکر ہونے پر تعظیم اور عقیدت سے جس کے چہرے کی حالت غیر ہونے لگتی، اور جو کہ اِس مشہورِ عام مقولۂ حق کی اولین قائل ہے: **كلٌّ يؤخذ من قوله ويرد إلا صاحب هٰذا القبر** یعنی ''ہر شخص کی بات لی بھی جا سکتی ہے اور رد بھی ہوسکتی ہے، سوائے اِس قبر میں جلوہ افروز ہستی ﷺ کے''......

یہ امام مالکؒ **امامُ اهل المدينة** ہیں جن کے اصولِ استدلال کے حوالہ سے ہر مؤلف آپ کو بتائے گا کہ خبر واحد کے قبول کیلئے وہ یہ شرط ٹھہراتے تھے کہ خبر واحد مدینہ کے اندر معروف چلے آنے والے ایک عمل کے ساتھ نہ ٹکراتی ہو۔ اب یہاں ایک سطحی علم رکھنے والا شخص بولے گا: دیکھا استغفر اللہ، حدیث رد کر دی! جبکہ معاملہ یہ ہے کہ امام مالک مدینہ کے اندر معلوم و معروف چلے آنے والے ایک عمل کو رسول اللہ ﷺ سے چلی آنے والی روایت ہی کی ایک صورت مانتے ہیں۔ اِسی کو بعض فقہاء روایتِ عملی کہتے ہیں۔ اِس (اہل مدینہ کے تعامل) کو امام مالکؒ اِس حد تک قوی اور قابل بھروسہ جانتے تھے کہ کسی ایک آدھ شخص کی روایت سے اُس کی معارضت کرنے کو درست قرار نہ دیتے۔ اِس سلسلہ میں مالکؒ اپنے استاد ربیعۃ الرأي کا مقولہ دہرایا کرتے تھے: **ألف عن ألف خير من واحد عن واحد** یعنی ''ہزار شخص ہزار شخص

حواشی

سے ایک چیز کو نقل کرے وہ اِس سے کہیں مضبوط ہے کہ کوئی ایک شخص کسی ایک شخص سے روایت کرے''۔

اسی طرح.. اگر ایک چیز شریعت کے عمومی اصولوں سے ثابت ہے (اور یہی چیز کسی وقت قیاس کے باب میں بھی چلی جاتی ہے جہاں پر اصولاً امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مابین کوئی بڑا فرق نہیں رہ جاتا) تو امام مالکؒ اُس چیز کی معارضت میں خبر واحد سے احتجاج کرنا درست نہیں جانتے۔ یہاں بھی؛ ایک فتویٰ باز شخص کہہ سکتا ہے کہ دیکھا امام مالکؒ نے حدیث کو صاف رد کر دیا! حالانکہ مسئلہ یہاں پر تعارضِ ادلہ کا ہے؛ یعنی ایک چیز دلیل ہے تو اس کے مقابلے پر بھی دلیل ہے، اور اِس تعارض کو کوئی فقیہ ایک طریقے سے حل کرے گا تو کوئی دوسرا فقیہ کسی دوسرے طریقے سے۔ نیز یہاں پر، شاطبیؒ کے الفاظ میں، شریعت کی جزئیات کو شریعت کی کلیات کی طرف لوٹانے کا مسئلہ ہے اور شریعت کی (امام مالک کی نظر میں) ایک غیر واضح اور قابل تاویل خبر کو شریعت کی ایک واضح، محکم اور نا قابل تاویل حقیقت کی جانب لوٹانے کا باب ہے؛ جہاں پر مختلف فقہاء مختلف اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

اِس کی مثال اور توجیہ پیش کرتے ہوئے شاطبیؒ لکھتے ہیں:

وللمسألة أصلٌ فی السلف الصالح، فقد ردَّت عائشة رضی الله عنها حدیث إن المیت لیعذب ببکاء أهله بهذا الأصل نفسه لقوله تعالیٰ **ألا تزر وازرة وزر أخریٰ وأن لیس للإنسان إلا ما سعیٰ**۔ ورَدَّت حدیث رؤیة النبی ﷺ لربه لیلة الإسراء لقوله تعالیٰ **لا تدرکه** .. وردَّت هی وابن عباس خبر أبی هریرة فی غسل الیدین قبل إدخالهما فی الإناء استنادا إلیٰ أصلٍ مقطوعٍ به وهو رفع

الحرج ومالا طاقة به عن الدين، فلذلك قالا: فكيف يصنع بالمهراس؟ وردَّت أيضا خبر ابن عمر فى الشؤم وقالت إنما كان رسول الله ﷺ يحدث عن أقوال الجاهلية لمعارضته الأصل القطعى أن الأمر كله لله وأن شيئا من الأشياء لا يفعل شيئا ولا طيرة ولا عدوىٰ۔

- -

وفى الشريعة من هٰذا كثير جدا، وفى اعتبار السلف له نقل كثير۔ ولقد اعتمده مالك بن أنس فى مواضع كثيرة لصحته فى الاعتبار۔ ألا ترىٰ إلىٰ قوله فى حديث غسل الإناء من ولوغ الكلب سبعا: جاء الحديث ولا أدرى ما حقيقته۔ وكان يضعفه ويقول: يؤكل صيده فكيف يكره لعابه۔ وإلىٰ هٰذا المعنىٰ أيضا يرجع قوله فى حديث خيار المجلس حيث قال بعد ذكره: وليس لهٰذا عندنا حد معروف ولا أمر معمول به۔ فيه إشارة إلىٰ أن المجلس مجهول المدة ولو شرط أحد الخيار مدة مجهولة لبطل إجماعا فكيف يثبت بالشرع حكم لا يجوز شرطا بالشرع؟ فقد رجع إلىٰ أصل إجماعى۔ وأيضا فإن قاعدة الغرر والجهالة قطعية وهى تعارض هٰذا الحديث الظنى

- - -

ومن ذلك أن مالكاً أهمل اعتبار حديث من مات وعليه صيام صام عنه وليه، وقوله أرأيت لو كان علىٰ أبيك دينٌ الحديث لمنافاته للأصل القرآنى الكلى نحو قوله: ألا تزر وازرة وزر أخرىٰ وأن ليس للإنسان إلا ما سعىٰ۔ كما اعتبرته عائشة فى حديث ابن عمر وأنكر مالك حديث إكفاء القدور التى طبخت من الإبل والغنم قبل القسم

حواشی

تعویلاً علیٰ أصل رفع الحرج الذی یعبر عنه بالمصالح المرسلة فأجاز أکل الطعام قبل القسم لمن احتاج۔

وفی مذهبه من هٰذا کثیر۔

(الموافقات للشاطبی، ج ۳ ص ۱۹ – ۲۳)

اِس مسئلہ کی اصل سلف صالحین کے ہاں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے حدیث {إن المیت لیعذب ببکاء أهله ''یقیناً مردے کو اپنے گھر والوں کے رونے کے سبب سے عذاب ہوتا ہے''} کو رد کیا تو وہ اِسی اصل کی بنیاد پر، کیونکہ قرآن میں اللہ کا فرمان ہے: {ألا تزر وازرة وزر أخریٰ وأن لیس للإنسان إلا ما سعی ''کہ نہیں اٹھائے گی کوئی اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ، اور یہ کہ نہیں ہے واسطے انسان کے وہی جس کی اُس نے خود سعی کی''}۔ نیز حضرت عائشہؓ نے شب اسراء کو نبی ﷺ کے دیدارِ خداوندی کرنے سے متعلق حدیث کو رد کیا، اِس آیت کی بنا پر کہ {لا تدرکه الأبصار ''آنکھیں اُس کو پا نہیں سکتیں''}۔ نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ دونوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اِس خبر کو رد کیا جس میں ہاتھوں کو برتن میں ڈالنے سے پہلے دھونے کا حکم ہے۔ عائشہؓ وابن عباسؓ نے ایسا دین کے ایک اصل قطعی کا سہارا لیتے ہوئے کیا، یعنی دین سے حرج کو اور اُس چیز کو جس کی انسان کو طاقت نہیں انسان سے رفع کر دینے والا قاعدہ۔ اسی وجہ سے عائشہؓ وابن عباسؓ نے یہاں پر یہ سوال اٹھایا کہ آدمی (مہراس) پانی کی ہودی پر ہو تو کیا کرے؟ نیز عائشہؓ نے عبد اللہ بن عمرؓ کی شؤم (نحوست) والی حدیث رد کی (یعنی مکان میں، اور سواری میں اور عورت میں نحوست ہوتی ہے) اور یہ توجیہ بیان کی کہ اصل میں نبی ﷺ جاہلیت والوں کی بات نقل فرما رہے تھے (نہ کہ نبی ﷺ خود یہ قاعدہ بیان فرما

حواشی

رہے تھے) ☆۔ یہ اس لئے کہ یہ چیز (مکان میں، یا سواری میں، یا عورت میں نحوست ہونا) ایک اصلِ قطعی کے خلاف جاتی ہے، اور وہ یہ کہ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے اور یہ کہ کسی چیز کے اپنے بس میں کچھ نہیں، اور یہ کہ اسلام میں لا طیرۃ و لا عدویٰ "نہ کوئی بدشگونی ہے اور نہ چھوت چھات"۔

..................(پھر تھوڑا آگے چل کر شاطبی لکھتے ہیں)

شریعت میں اِس باب سے خاصا کچھ ہے۔ اور سلف سے اِس بات کا اعتبار کرنے میں بہت کچھ نقل ہوا ہے۔

اِسی چیز کو مالک بن انسؒ نے کثیر مقامات پر بنیاد بنایا ہے، کیونکہ اِس قاعدہ کا اعتبار کیا جانا (از روئے دین) صحیح وثابت ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں وہ حدیث جس میں کتے کے منہ ڈالے ہوئے برتن کو سات بار دھونے کا کہا گیا ہے اُس کی بابت امام مالک کہتے ہیں: حدیث آئی ہے مگر میں نہیں جانتا اِس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ مالک اِس حدیث کی تضعیف کیا کرتے تھے۔

☆ یعنی کسی عالم کی نظر میں ایک حدیث کے مقابلے پر اُس سے قوی تر کوئی شرعی دلیل پائی جاتی ہے اور اِس وجہ سے وہ اس حدیث کو احتجاج کی بنیاد نہیں بناتا، جیسا کہ اوپر عائشہ رضی اللہ عنہا کے اِس واقعہ میں ہے......تو وہ اِس باب سے نہیں ہوتا کہ 'رسول اللہ ﷺ نے تو واقعتاً یہی بات کی ہے اور اِس سے آپ ﷺ کا مطلب اور مراد اور منشا بھی عین یہی ہے مگر میں اِسکو نہیں مانتا'! ام المومنینؓ کی بابت ایسی کوئی بات ظاہر ہے سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ امام مالک یا امام ابوحنیفہ یا دیگر معروف فقہائے امت کی بابت بھی یہ بات سوچی نہیں جا سکتی۔ دراصل یہاں پر اِن ہستیوں کی مراد یہی ہوتی ہے کہ حدیث کو سننے والے سے اُسکا پورا سیاق وسباق اور منشا و مراد نقل ہونے سے ضرور کہیں رہ گیا ہے، یا کوئی ایسا ابہام پیدا ہو گیا ہے جو اِس حدیث کو اِن معنوں کے ساتھ لینے میں مانع ہے (اس سے ایک قوی تر دلیل پائے جانے کے باعث)، یا راوی سے اسکا بیان ہونے میں کوئی ایسی چیز چھوٹ گئی ہے جو اس کے معنیٰ کو زیادہ واضح کر سکتی اور شریعت کے کچھ محکم تر امور سے اسکا تعارض باقی نہ رہنے دیتی۔ وغیرہ وغیرہ۔ تبھی ام المومنینؓ اِس حدیث کی یہ توجیہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جاہلیت کا ایک اعتقاد نقل کرنے کے سیاق میں فرمائی ہے نہ کہ خود کسی شرعی حقیقت کا بیان فرمانے کیلئے۔

حواشی

ان کا کہنا تھا: اُس کا (یعنی کتے کا) پکڑا ہوا شکار کھا لیا جائے گا (**فکلوا مما أمسکن علیکم**) تو اس کا لعاب کیونکر پلید ٹھہرایا جائے گا؟ خیارِ مجلس☆ سے متعلق امام مالکؒ کا جو قول معروف ہے وہ بھی درحقیقت اِسی معنیٰ کی جانب لوٹتا ہے۔ چنانچہ مالکؒ نے اِس حدیث کو ذکر کیا تو اُس کے بعد رقمطراز ہوئے: اِس (خیارِ مجلس) کی ہمارے ہاں کوئی مقررہ حد نہیں ہے۔ نہ ہی اِس پر عمل ہمارے (اہل مدینہ کے) یہاں کا دستور ہے۔ امام مالک کے اِس قول میں اِس جانب کو اشارہ ہے کہ مجلس ایک مجہول المدت چیز ہے؛ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ کوئی شخص اگر ایک مجہول (نامعلوم) مدت کیلئے خیار کی شرط لگائے تو یہ چیز بالاجماع باطل ہوگی۔ تو پھر شرع سے ایک ایسا حکم کیونکر ثابت ہوسکتا ہے جو ایک باقاعدہ شرط کے طور پر فریقین کے مابین طے ہو تو بھی وہ از روئے شرع ناجائز ہو؟ چنانچہ یہاں امام مالک کا مرجع ایک ایسا اصل ہے

☆ بخاری ودیگر کتب میں وارد حدیث: البیعان بالخیار ما لم یتفرقا۔ ''سودا کرنے والے ہر دو فریق (سودا ختم کر دینے کا) اختیار رکھتے ہیں تاوقتیکہ وہ الگ نہ ہو جائیں''۔ دیگر فقہاء اِس حدیث سے خیارِ مجلس کو ثابت کرتے ہیں؛ اور جو کہ صحیح تر ہے۔ البتہ امام مالک اِسکو تعاملِ اہل مدینہ کے ساتھ معارض پاتے ہیں، نیز اسکو بعض شرعی کلیات کے بھی معارض پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اِس حدیث سے احتجاج نہیں کرتے۔

یہاں یہ ذکر کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ معلوم ہو، مالک بن انسؒ ایسے امامِ سنت کسی خبر کو ایسی صورت میں احتجاج کی بنیاد نہیں ٹھہراتے جب ان کی نظر میں اُس سے قوی تر کچھ شرعی دلائل اور قواعد اُس خبر کے خلاف پڑ رہے ہوں۔ یہ دراصل شریعت کی ایک دلیل کو رد کرنا نہیں ہوتا، نہ ہی یہ اپنی عقل کو شریعت پر مقدم کرنا ہوتا ہے؛ بلکہ یہ شریعت کی ایک دلیل کو دوسری کے مقابلے میں فائق ٹھہرانا ہوتا ہے۔ دیگر ائمہ ان سے اِس مسئلہ پر اختلاف کرتے ہیں چاہے جتنا بھی بھرپور اختلاف کرلیں، مگر اِس پر اُنکے لتے نہیں لیتے۔ اور نہ ہی انکے ساتھ وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو وہ معتزلہ، مرجئہ اور جہمیہ ایسے ''نصوص کے انکاری'' ٹولوں کے ساتھ پوری شد و مد کے ساتھ اختیار کیا کرتے تھے۔ ائمہ واہل سنت کے معاملہ کو اہل بدعت سے جدا رکھنا کس قدر ضروری ہے، صرف یہی بات ذہن نشین کرانا یہاں ہمارے پیش نظر ہے۔

جو اجماع سے ثابت ہے۔ علاوہ ازیں غرر اور جہالۃ کو ممنوع ٹھہرانے والا شریعت کا قاعدہ قطعی ہے، جبکہ شریعت کا یہ قاعدہ بھی اِس حدیثِ ظنی کے ساتھ معارض ہے۔

.................(پھر تھوڑا آگے چل کر شاطبی لکھتے ہیں)

اِسی باب سے: امام مالک نے اِس حدیث کو نظر انداز کیا ہے کہ جو شخص مر جائے اور اُس کے روزے رہتے ہوں تو اُس کے والی وارث اُس کی جانب سے روزے رکھیں۔ نیز یہ حدیث (جو کہ حج کی بابت آتی ہے) کہ اگر تیرے باپ پر کوئی قرض ہوتا تو ادا نہ کرتا؟ (اِن دونوں حدیثوں کو اِس لئے نظر انداز کیا) کیونکہ ان کے نزدیک یہ قرآن سے ثابت ایک اصل اور ایک قاعدہ کلیہ کے منافی ہیں جو کہ اِس آیت سے ثابت ہے: {**ألا تزر وازرة وزر أخریٰ وأن ليس للإنسان إلا ما سعى** ''کہ نہیں اٹھائے گی کوئی اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ، اور یہ کہ نہیں ہے واسطے انسان کے وہی جس کی اُس نے خود سعی کی''} بالکل اُسی طرح جس طرح حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ والی حدیث کی بابت موقف اختیار کیا تھا۔ علاوہ ازیں اُس حدیث کا بھی اعتبار نہیں کیا جس میں اُن ہانڈیوں کو الٹ دینے کا حکم ہے جن میں (امیر کے ہاتھوں) تقسیم ہو جانے سے پہلے ہی غنیمت کے اونٹ اور بکرے ذبح کر کے پکا لئے گئے ہوں۔ امام مالک کا یہ موقف اُس شرعی اصل پر بنا کرتا ہے جس کی رو سے حرج کو امت سے مرفوع ٹھہرایا گیا ہے اور جس کو کہ مصالح مرسلہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام مالک نے ایسے شخص کے حق میں تقسیم غنیمت سے پہلے کھانے کو جائز کہا ہے جس کو کھانے کی احتیاج ہو چکی ہو۔

یہ چیز امام مالک کے مذہب میں اچھی خاصی ہے۔

(شاطبیؒ کی عبارت ختم ہوئی)

حواشی

ظاہر ہے امام مالکؒ کے سب سے ہونہار شاگرد، جو کہ خود بھی ایک مذہب کے مؤسس ہیں، یعنی امام شافعیؒ، باوجود امام مالکؒ کی نہایت تعظیم اور توقیر کے اور ان کی شان میں نہایت عظیم الشان کلمات بولنے کے، اِن مسائل میں امام مالک کے ساتھ شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ نہ تعامل اہل مدینہ کے ساتھ تعارض کے باعث خبر واحد کو رد کرتے ہیں اور نہ اُن قواعد سے ٹکرانے کے باعث جن کا امام مالک نے اعتبار کیا ہے۔ امام شافعیؒ نے امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے اِس طرح کے کئی اصولوں کا نہایت زوردار رد کیا ہے، **اِسکے باوجود، اشارے کنائے میں بھی امام مالکؒ یا امام ابوحنیفہؒ کو 'حدیث کو رد کرنے والے ٹولے' میں شامل نہیں کیا ہے۔** یہاں تک کہ ان بزرگوں کی تعظیم میں کمی تک نہیں آنے دی اور ان کے حق میں تا زندگی نہایت عظیم الفاظ بولتے رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ جو لوگ مالکؒ یا ابوحنیفہؒ والے اصول اختیار کر کے رہے اُنکے خلاف بھی کبھی کوئی 'تحریک' نہیں چلائی۔ یعنی یہ ایک معلوم امر ہے کہ حنفیہ و مالکیہ کے ساتھ اِس باب میں شدید اختلاف رکھنے کے باوجود، شافعیؒ اِس اختلاف کو ایک علمی اختلاف کے دائرہ ہی میں رکھتے تھے اور اِسکو اُس اختلاف کے ساتھ خلط نہ ہونے دیتے تھے جس میں شدید درشت ہو جانا وہ ایمان کا حصہ جانتے تھے۔ مثلاً علم کلام والوں کی بابت شافعیؒ کا اِس حد تک درشت ہو جانا کہ: حكمي في أهل الكلام أن يضربوا بالجريد والنعال، ويطاف بهم في العشائر والقبائل، ويقال: هذا جزاء من ترك الكتاب والسنة وأقبل على الكلام (از مقدمہ شرح عقیدہ طحاویہ، مؤلفہ ابن ابی العز) ''اہل کلام کی بابت میرا فتویٰ ہے کہ کھجور کی چھڑیوں اور جوتوں سے ان کی درگت بنائی جائے اور ان کو بستی بستی لے کر پھرا جائے،

حواشی

ساتھ یہ اعلان کیا جا رہا ہو: یہ ہے سزا اُس شخص کی جو کتاب اور سنت کو چھوڑ کر کلام کی طرف رخ کرے''۔

شافعیؒ ہوئے یا احمد بن حنبلؒ یا مدرسۂ اہل الحدیث کا کوئی اور سرخیل، کتاب اور سنت سے منہ موڑنے والوں کی بابت یہ لوگ آخری حد تک بے لحاظ ہو جاتے تھے، جیسا کہ شافعیؒ کے درج بالا قول (بابت اہل کلام) سے مترشح ہے، اور جیسا کہ احمد بن حنبلؒ خلقِ قرآن ایسے ایک مسئلے پر ان متکلمین کے ساتھ پوری ایک جنگ کھڑی کر لیتے ہیں۔ مالکیہ یا حنفیہ کو بھی (اُن اصولوں کی بابت جن میں سے بعض کا اوپر شاطبی کے کلام میں ذکر ہوا) اگر یہ لوگ 'کتاب اور سنت سے منہ موڑنے والی صنف' میں باور کرتے تو ان کے ساتھ بھی یہ لوگ ویسی ہی جنگ کھڑی کرتے جیسی جنگ اِن لوگوں نے اہل بدعت کے خلاف کھڑی کر رکھی تھی۔ حق یہ ہے کہ مالکیہ اور حنفیہ کے ساتھ اِن لوگوں کی یہ وحدت اور یگانگت ہمارے آج کے 'دانشوروں' کے ہاں پائی جانے والی 'رواداری' کے باب سے نہ تھی۔ اُن لوگوں کے منہج میں ایسی ہی کوئی 'رواداری' ہوتی تو معتزلہ و متکلمین کیلئے وہ کھجور کی چھڑیاں اور جوتے تجویز کر کے نہ دے رہے ہوتے۔ معاملہ یہ ہے کہ یہ سب ائمۂ سنت واقعتاً اُس دائرہ سے واقف تھے جس کے اندر کے لوگوں کے ساتھ وحدت اور یگانگت کا اسلوب اختیار کر کے رکھا جاتا ہے، خواہ مسئلہ بعضِ اخبارِ آحاد کو احتجاج کی بنیاد نہ بنانے تک کیوں نہ چلا گیا ہو، اور جو کہ اہلسنت کا دائرہ ہے، جبکہ اس دائرے کے باہر کے لوگوں کے ساتھ وحدت اور یگانگت کا یہ اسلوب نہیں رکھا جاتا بلکہ ان کے خلاف شدت اختیار کرنے اور عامۃ الناس کو اُن کے شر سے خبردار کرنے میں اہلسنت کو آخری حد تک چلے جانا ہوتا ہے۔

حواشی

یہ میزان ہی کسی وجہ سے آج ہمارے یہاں مفقود ہوگیا ہے۔اسکی بحالی ہوجانا مسلم برصغیر کے تحریکی عمل کے حق میں خدا کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہوگا۔

اِس سلسلہ میں زیادہ تفصیلات علماء کے سمجھنے کی ہیں، جبکہ یہ کتاب علماء کیلئے نہیں لکھی جا رہی۔ جہاں تک ہمارے تحریکی نوجوانوں کا تعلق ہے تو اُن کے سمجھنے کی ایک موٹی بات یہ ہے کہ:

اخبارِ آحاد کے قبول ورَدّ کے معاملہ میں جتنا سا اختلاف مذاہبِ اربعہ کے مابین پایا گیا ہے، اُتنے سے اختلاف کیلئے آپ کو بھی اپنا دائرہ کھلا رکھنا ہوگا۔ ایسے اختلاف کی بنیاد پر اگر مالکؒ اور شافعیؒ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں نہیں ہوتے، نہ ہی اِن دونوں کے فقہی وابستگان ☆ آپس میں دست وگریباں ہوتے ہیں.. تو ہمارے آج کے متبع حق نوجوان بھی ایک دوسرے کو یا ایک دوسرے کے ائمہ کو ایسے کسی اختلاف کی بنیاد پر دائرۂ حق سے خارج کرتے اور 'کتاب وسنت سے منہ موڑنے والا' قرار دیتے نہیں پھریں گے۔

(اِس دائرہ اہلسنت کے اندر) دوسرے کے امام نے کسی نص کی توجیہ اس طرح کردی ہے جو آپ کے یا آپ کے امام یا عالم کے نزدیک درست نہیں ہے،تو اُس کے ساتھ **کھل کر علمی اختلاف رکھئے، علمی دائرے میں کھل کر اُس کے خلاف دلائل دیجئے، لیکن اس کو اہل حق اور اہل باطل کی جنگ نہ بنائیے۔ عامۃ الناس کو اِن جھگڑوں میں فریق مت بنائیے۔** اِس دائرہ کی وحدت اور شیرازہ بندی قائم رکھنے کو وقت کا ایک اہم ترین فریضہ جانئے، اور اِس کی مجتمع قوت کو یہاں پر اہل باطل اور اہل بدعت کے خلاف ایک نہایت موثر و فاعل قوت بنائیے۔

☆ سوائے آخری ادوار کے مقلدین کے، جن کی ائمہ سنت کی طرف سے بے حد مذمت ہوئی اور اُنکے اِس لڑنے جھگڑنے کو تعصب کا نام دیا گیا۔

یہ ایک جماعت ہے، فرقۂ ناجیہ اور زمین پر اصحابِ رسول اللہ کا تسلسل۔ اِس کی وحدت کو توڑنا اُس بند کو توڑنا ہے جو فساد فی الارض کی قوتوں کی راہ میں عہدِ صحابہ سے لے کر بندھا چلا آتا ہے، خواہ یہ کام کوئی شاطر دشمن کرے یا کوئی نادان دوست۔

(حاشیہ ٦)

ہاں کسی شخص یا کسی گروپ میں _ اضافی طور پر_ کوئی شرکیہ یا کوئی الحادی رویہ پایا جائے یا وہ کسی مہلک بدعت کا شکار ہو تو اور بات ہے۔ مثلاً برصغیر میں ''احناف'' سے منسوب بعض گروہوں، انڈونیشیا وغیرہ میں ''شوافع'' سے منسوب بعض گروہوں اور مراکش وموریطانیا وغیرہ میں ''مالکیہ'' سے منسوب بعض طبقوں کا قبر پرستی اور اولیاء پرستی وغیرہ ایسے شرکیہ امور کے اندر ملوث ہونا یا باطنی تصوف کا شکار ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔ حق یہ ہے کہ ایسے کسی شرکیہ رویے کا کسی کے ''فقہی مسلک'' سے دور نزدیک کا کوئی تعلق نہیں۔ نہ مذہب حنفی میں ایسے کسی شرک کی کوئی اجازت یا گنجائش پائی جاتی ہے اور نہ مذہب شافعی میں اور نہ مذہب مالکی میں۔ اوپر جو بات ہو رہی ہے وہ ''مصدر تلقی'' کے حوالے سے ہے، جس میں _ ہمارا کہنا یہ ہے کہ _ مذاہب اربعہ، ظاہریہ واہلحدیث وغیرہ ایسے سب فقہی طوائف ایک ہی اصل پر ہیں۔

بنا بریں، کسی شخص یا گروہ کے ہاں کوئی اضافی انحراف یا بدعت ہو تو اور بات ہے، اور جس کا الگ سے رد بھی ضرور ہونا چاہیے؛ البتہ کسی کا محض حنفی یا شافعی یا مالکی یا حنبلی یا ظاہری یا اہل حدیث وغیرہ ہونا بجائے خود کوئی ایسی چیز نہیں جو اُس کو ''اہل سنت'' کے اِس دائرہ سے خارج کر دے۔

3

برصغیر میں ہمارا اصل سرمایہ

یہاں ☆ سے ہمارے اصل مقصود طبقہ کا تعین ہو جاتا ہے...... یعنی:

وہ حلقے جو ایک تو اپنی ''تاریخی وابستگی'' کے لحاظ سے، اور دوسرا ''مصادرِ دین'' کے لحاظ سے...... ''اہل سنت'' شمار ہوتے ہیں...

یہی ہے طائفۂ حق......، اور اسی کے عمل میں وحدت اور یکسوئی لانا ہماری تالیف کی اصل غرض و غایت۔

☆☆☆☆☆

رہ گئے وہ طبقے جو نصوصِ وحی کو ــــ اُن معیارات کا پابند رہتے ہوئے جو اہلسنت کے معروف مدارس کے یہاں قائم چلے آئے ہیں ــــ اپنے لئے ہدایت اور تلقی کا مصدر نہیں مانتے.. مانند روافض، خوارج، معتزلہ، صوفیہ کے باطنی مذاہب [(۱)]، منکرین حدیث (وجدت پسند)، نیچرسٹ اور سیکولر وغیرہ.. اور جو کہ ''مصادرِ دین'' پر ہی درحقیقت ☆ ہمارے ساتھ متفق نہیں......

تو یہ طبقے ہماری گفتگو کے اولین مخاطب تو بہر حال نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے اور ان کے مابین ایک اصولی و بنیادی اختلاف کی دیوار حائل ہے (صحابہؓ سے چلی آنے والی ایک حقیقت کو ہمارا ماننا اور اُن کا نہ ماننا) اور کسی ایک فریق کے اس دیوار

☆ یعنی پچھلی فصل میں ہم جو گفتگو کر آئے ہیں۔

☆ اگرچہ وہ کتاب وسنت کی اپنی خودساختہ تعریف کی رو سے یہ دعویٰ کریں کہ وہ تو کتاب وسنت کو مانتے ہیں

کو پار کیئے بغیر مفاہمت ممکن نہیں۔ اس فریق کے ساتھ گفت وشنید کی ضرورت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے؛ مثبت سوچ کے حامل افراد کی ایک کثیر تعداد اس طبقہ میں بھی یقیناً پائی جاتی ہے؛ نیز بہت سے اسباب ایسے ہوئے ہیں کہ ہمارا اور اُن کا تبادلۂ افکار آج خاص طور پر ضروری ہو گیا ہے۔ پھر بھی ''مصدرِ دین'' کو باقاعدہ موضوع بنا کر اس طبقہ کے ساتھ بات چیت کرنے کیلئے.. ایک قدرے مختلف اپروچ درکار ہو گی؛ جو کہ حالیہ کتاب میں ممکن نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے بیان میں ان حضرات کے غور وفکر کیلئے بھی بہت کچھ ہو گا۔

☆☆☆☆☆

اِس کتاب کا اصل مخاطب پس یہاں کے اہلسنت طبقے ہوئے۔

اِنہی کو___ ان کے اندرونی اختلاف کو چھیڑے بغیر، مگر کچھ اساسی امور پر کھڑا کر دینے کی صورت میں ___ ایک بڑی سطح پر متحد وصف آرا کر دینا اِس کتاب کا اصل ہدف ہے۔

تاہم ایک خاص صنف اس پورے طبقہ کے اندر ایسی ہے جو ہماری توجہ سب سے بڑھ کر لے گی، اور یہ ہیں:

یہاں کے وہ سنجیدہ، تعلیمیافتہ، دیندار اصحاب ...... جن کیلئے، برصغیر کے روایتی دیندار حلقوں کے اندر پایا جانے والا جمود، غیر معمولی حد تک پریشان کن ہے۔

سچ یہ ہے کہ اپنے تعلیمیافتہ طبقوں کی یہ پریشانی کچھ ایسی بے جا نہیں۔

ہمارے یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اسلام کے ساتھ آج بھی وہ لگاؤ رکھتے ہیں کہ دین اور دینی حلقوں سے جڑے رہنا اِن کی سب سے بڑی خواہش ہو گی۔ مگر یہاں

کے بیشتر روایتی طبقوں کی پسماندگی اور جمود اور تنگ نظری جو کہ ''دین'' کے نام پر اختیار کر رکھی گئی ہوتی ہے، اِن کی اِس خواہش کا سوسو بار خون کرتی ہے۔نوبت اِس وقت یہاں پہنچی ہوئی ہے کہ:

۱- دین سے لگاؤ رکھنے والے اِس اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقے کی ایک خاصی بڑی تعداد ایسی ہے جو ــــ ایک نیم مردہ دلی کے ساتھ، اور وقت پاٹنے کیلئے ــــ اس جامد طبقے کا ہی دامن تھام کر کھڑی رہنا چاہتی ہے، کیونکہ **اِس روایتی مذہبی طبقے کا متبادل، جدت پسندوں کے سوا، بالعموم نہیں پایا جاتا۔**

۲- البتہ ایک تعداد اب ایسی ہے جو اِن جدت پسندوں کو ــــ متبادل کے طور پر ــــ کچھ نہ کچھ توجہ دینے بھی لگی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ جدت پسند، یہاں کے جامد روایتی حلقوں کے پیدا کردہ اِس خلا کا ہی ایک بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

۳- اِس موخر الذکر صنف میں سے کوئی فرد اِس وقت کہیں پر کھڑا ہے تو کوئی کہیں پر...... شاید اِن میں سے کوئی دو شخص ایسے نہ ہوں گے جو فکری معاملہ میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہوں۔ یعنی ایک آخری درجے کی فکری طوائف الملوکی۔

۴- البتہ اِن میں کی ایک بڑی تعداد اِس کیفیت سے دوچار ہے کہ یہ 'روایتی طبقوں' کو چھوڑ دینے پر شرح صدر بھی نہیں پاتی اور 'جدت پسندوں' کو گلے لگا لینے میں ایک دھڑکا محسوس کیئے بغیر بھی نہیں رہتی۔ بلکہ اپنی سلامتِ فطرت کے بموجب، اسلام کی ایک نرالی unprecedented تعبیر سن کر ایک جھرجھری سی بھی بہرحال لیتی ہے۔ چاہے اِن جدت پسندوں کے 'دلائل' اِن کو مسحور کن لگیں اور چاہے ان 'دلائل' کا کوئی جواب بھی فوری طور پر اِن کے پاس نہ ہو، پھر بھی کوئی چیز اندر سے بول کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ اِن جدت پسندوں کا معاملہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہے

اور عاقبت خراب ہو جانے کا قوی تر اندیشہ بھی۔ چنانچہ وہ ''مصادرِ اَدِلّہ'' جو اہل سنت کے ہاں از عہد صحابہؓ تا امروز حجت اور سند چلے آتے ہیں اُن ''مصادرِ اَدِلّہ'' کے ساتھ ہمارے اِن لوگوں کی وابستگی تو الحمد للہ ختم نہیں ہو پائی، تاہم اِن مصادر پر اعتماد اور وثوق کی وہ کیفیت جو ہونی چاہیے بہرحال متاثر ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ: ہمارے یہ سلیم الفطرت اصحاب، یہاں کے جدت پسندوں سے مطمئن بھی نہیں ہیں تاہم ان سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حق کی راہ میں آگے بڑھنے کیلئے جو ایک زور اور یکسوئی درکار ہوتی ہے، اُس پُرعزم کیفیت کے رکھنے میں تو بہت پیچھے ہیں۔

یہ پورا طبقہ...... سمجھئے ہماری اس گفتگو کا اہم ترین مخاطب ہے۔

(حاشیہ ۱)

دوبارہ عرض کر دیا جائے: مراد ہے صوفیہ کے وہ طبقے جو 'شریعت اور طریقت' میں فرق کرتے ہوئے 'طریقت' کو 'شریعت' پر مقدم کرتے ہیں۔ البتہ وہ صوفیاء جو پابند شریعت ہیں اور جو ''وحدۃ الوجود'' اور ''حلول'' وغیرہ ایسے عنوانات کے تحت خالق اور مخلوق کی حقیقت کو خلط نہیں کرتے اور عابد اور معبود کو یکجا نہیں ٹھہراتے اور توحیدِ عبادت کو بعثتِ انبیاء کا مقصد جانتے ہیں، بلاشبہ اہلسنت میں آتے ہیں۔

''مصدرِ تلقی'' کے حوالے سے ''اہل انحراف'' اور ''ہل اتباع'' کے مابین تمیز پر پچھلی فصل میں ایک بیان گزر چکا ہے۔

حصہ دوم: # تشخیص

- مراجعِ فہم......؟
- سلف سے استغناء.. مگر بیشتر استدلالات درست!
- انبیاءؑ اور اصحابؓ کا راستہ اپنائے بغیر اھواء سے دور ہونے کا دعویٰ سب سے بڑا جھوٹ ہے
- ایک الجھن، تین رویے
- جمود کی کہانی
- استشراق کی سوغات......: "مطلق رواداری"!
- ایک بے قابو مجمع!
- مسلمات کی ضرورت

4

فہم کے مراجع......؟

آپ کا فہمِ دین کا مصدر کیا ہے؟

اس کا سیدھا جواب کچھ قابل احترام طبقوں کی طرف سے یہ ملتا ہے کہ:

''قرآن اور حدیث''۔

قرآن اور حدیث سے بڑھ کر حق بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ دین بلاشبہ قرآن وحدیث ہی ہے۔تاہم زیادہ واضح ہونے کیلئے ہم یہ سوال یوں رکھ لیتے ہیں کہ:

''آپ نے قرآن اور حدیث کو کہاں سے سمجھا ہے؟''

یہ سوال البتہ قابل غور ہے۔

'قرآن اور حدیث تو خود بخود واضح ہیں۔ اس کو ''کہیں'' سے سمجھنے کا کیا سوال......؟' یہ ایک اندازِ فکر ہے اور اس کی تہہ میں جانا کئی لحاظ سے ضروری(1)۔

''تفسیرِ دین'' کے موضوع پر کیسے کیسے معرکے ہماری تاریخ کے اندر ہوئے ہیں؛ اور کیسے کیسے نقب عین اِس جگہ سے ہمارے گھر میں لگے ہیں (اور لگ رہے ہیں)؟...... یہ سب کچھ اگر ہم سے اوجھل نہیں ہے تو اِس سوال کو سرسری لینا بے حد تشویشناک ہو جاتا ہے۔ دین کو سمجھنے کے درست مراجع اختیار کروانا امت کا ایک نہایت حقیقی مسئلہ ہے اور حالیہ صورتحال میں تو یہ ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

فہم کے مستند مراجع کی ضرورت: چند مثالیں

چند مثالیں شاید آپ کو اندازہ کروا دیں کہ ''فہم کے درست مراجع'' کوئی ایسا غیر اہم سوال نہیں:

- مثلاً جب کوئی شخص ''حلول'' کا عقیدہ ثابت کرنے کیلئے حدیث سے یہ الفاظ لے کر آئے:

وما يزال عبدى يتقرب إلىَّ بالنوافل حتىّٰ أحبَّه، فإذا أحببته كنت سمعَه الذى يسمع به، وبصرَه الذه يبصر به، ويدَه التى يبطش بها، ورجلَه التى يمشى بها (صحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب إن حقا على الله أن لا يرفع شيئا من الدنيا إلا وضعه)

''میرا بندہ نفلی وظائف کے ذریعے میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ میں اُس کو محبوب ٹھہرا لیتا ہوں۔ پھر جب میں اُس کو محبوب ٹھہرا لیتا ہوں تو میں اُس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اُس کی بینائی بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھنے کا کام لیتا ہے، اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اُس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے''۔

- کتنے ہی لوگ ہیں جو اِس طرح کی کسی نص کے تحت اللہ رب العزت کیلئے (معاذ اللہ) بعض نقص کے پیرائے بیان کر جاتے ہیں اور ٹوکنے پر 'حدیث' کا حوالہ دینے سے نہیں چوکیں گے، بلکہ الٹا آپ کو کہیں گے کہ آپ تاویل کرتے ہیں:

وما ترددت عن شىءٍ أنا فاعله ترددى عن نفس المؤمن يكره الموت وأنا أكره مساءته (بخاری کا مذکورہ بالا حوالہ)

''اور میں نہیں متردد ہوتا کسی چیز میں جسے میں کرنے والا ہوتا ہوں جس طرح میں متردد ہوتا ہوں مومن کا نفس (قبض کرنے) میں، کہ اُس کو موت ناپسند ہے اور مجھے اس کو خفا کرنا ناپسند''

- اِس حدیثِ مبارکہ سے بھی ''حلول'' اور نہ جانے کیا کیا گمراہی ثابت کر لیتے ہیں؛ اور آپ کو ایسے آدمی کے ساتھ کئی گھنٹے ''بحث'' کی ضرورت پڑتی ہے، پھر بھی بات کم ہی کسی کنارے لگتی ہے، اور آخر میں ایک 'فہم' اُس شخص کا ہوتا ہے اور ایک 'فہم' آپ کا، البتہ ''فہم'' کیلئے کوئی اسٹینڈرڈ حوالہ پھر بھی مفقود:

یا ابن آدم مرضتُ فلم تعدنی۔ قال: یا رب کیف أعودك وأنت رب العالمین؟ قال أما علمت أن عبدی فلانا مرض فلم تعده أما علمت أنك لو عدته لوجدتنی عنده .... (صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض..)

''اے ابن آدم، میں بیمار ہوا تو تو نے میری عیادت نہ کی۔ وہ کہے گا: پرودگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا، جبکہ تو رب العالمین ہے۔ وہ فرمائے گا: کیا تجھے پتہ نہ چلا تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی، کیا تجھے پتہ نہ چلا تھا کہ اگر تو نے اُس کی عیادت کی ہوتی تو تو نے مجھے اسی کے ہاں پایا ہوتا۔ ....''

- انسان کو معاذ اللہ خدا کی صورت اور خدا کا پرتو کہنے پر 'دلیل' لاتے ہیں:

إذا قاتل أحدکم أخاہ فلیجتنب الوجه، فإن اللہ خلق آدم علیٰ صورته

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الوجه..)

''جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے ساتھ لڑ پڑے تو چہرے (پر مارنے) سے بچے، کیونکہ اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے''

- کتنے ہی لوگوں کو آپ نے اِس حدیث اور اِس سے ملتی جلتی کچھ دیگر نصوصِ دین کے تحت ''عقیدۂ جبر'' بیان کرتے ہوئے دیکھا ہوگا:

ثم یکون مضغة مثله، ثم یبعث إلیه الملَك فیؤذن بأربع کلمات، فیکتب رزقه وأجله، وعمله، وشقی أم سعید، ثم ینفخ فیه الروح۔ فإن أحدکم لیعمل

بعمل أهل الجنة حتىٰ لا يكون بينها وبينه إلا ذراع، فيسبق عليه الكتاب، فيعمل بعمل أهل النار فيدخل النار، وإن أحدكم ليعمل بعمل أهل النار، حتىٰ ما يكون بينها وبينه إلا ذراع، فيسبق عليه الكتاب، فيعمل عمل أهل الجنة فيدخلها (صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب قوله تعالىٰ: ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين)

''پھر اُسی طرح (یا اتنی ہی دیر) وہ لوتھڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر اس کی طرف فرشتہ بھیجا جاتا ہے اور اس کو اذن دیا جاتا ہے کہ وہ چار باتیں لکھے: اس کا رزق۔ اس کی اجل۔ اس کا عمل اور یہ کہ آیا وہ بد بخت ہوگا یا خوش بخت۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس تم میں سے کوئی شخص عمل کرتا رہتا ہے اہل جنت والے یہاں تک کہ جنت اور اُس کے مابین اتنا ہی فاصلہ رہ جاتا ہے جتنا کہ ایک ہاتھ، تب اُس پر نوشتۂ (تقدیر) غالب آ تا ہے اور تب وہ عمل کرنے لگتا ہے اہل دوزخ والے، تب وہ دوزخ میں جا داخل ہوتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی شخص عمل کرتا ہے اہل دوزخ والے، یہاں تک کہ دوزخ اور اُس کے مابین اتنا ہی فاصلہ رہ جاتا ہے جتنا کہ ایک ہاتھ۔ تب اُس پر نوشتہ غالب آ تا ہے، تب وہ اہل جنت والے عمل کرنے لگتا ہے، تب وہ جنت میں جا داخل ہوتا ہے۔

- اسی طرح یہ آیت:

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكُوا (الأنعام: ۱۰۷)

''اللہ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے''

- اور یہ آیت:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ (یونس: ۱۰۰)

''اور نہیں ہے کوئی نفس ایمان لانے کا مگر اللہ کے اِذن سے''۔

- اور اِس آیت مبارکہ کا حوالہ دے کر تو آپ نے لوگوں کو کیا کیا اوٹ پٹانگ مفہومات بیان کرتے ہوئے نہ سنا ہوگا......:

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ.... (النور: ۳۵)

''اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق جس میں چراغ ہو، چراغ فانوس میں ہو، اور وہ فانوس ہو گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ جلایا جاتا ہو زیتون کے ایک ایسے برکت والے پیڑ کے تیل سے جو نہ پورب کا ہو اور نہ پچھّم کا، کہ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو اگر چہ آگ اس کو نہ چھوئے۔ نور پر نور ہے۔ اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے انسانوں کیلئے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔....''

- اِسی طرح یہ آیت:

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (ص: ۷۲)

''پھر جب میں اُسے (یعنی آدم کو) پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ''

- اِسی طرح یہ آیت:

وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (الأنعام: ۳)

''وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور زمین میں، جانتا ہے وہ تمہارا سر اور علانیہ''

وغیرہ وغیرہ [۲]

- اور ذرا اِس آیت مبارکہ ہی کو ایک نظر دیکھ لیں جس میں **محکمات** کا بھی ذکر آتا ہے اور **متشابهات** کا بھی، اور **فتنة** اور **تاویل** کا بھی، اور **زیغ** کا بھی، اور **الراسخون فی العلم** اور **اولو الالباب** کا بھی...... کہ **الراسخون فی العلم** (جو کہ صحابہؓ اوران کے طریق پر پائے جانے والے اصحاب علم ہی ہو سکتے ہیں) کی راہ کا پابند ہوئے بغیر، محض اپنی ہی 'اقُول' سے آپ اِس آیت کا معنیٰ ومفہوم کس طرح بیان کر کے دیتے ہیں اوراس کی تطبیق کس طرح:

هُوَ الَّذِیَ أَنزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْکِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِیْنَ فیْ قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاء الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاء تَأْوِیْلِهِ وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهُ إِلاَّ اللّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِیْ الْعِلْمِ یَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ کُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ إِلاَّ أُوْلُواْ الأَلْبَابِ رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنکَ رَحْمَةً إِنَّکَ أَنتَ الْوَهَّابُ(آل عمران:۷-۸)

''وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری۔ اِس میں بعض آیتیں محکم ہیں، اور وہ کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہ ہیں۔ سوجن دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ کتاب کے اُن حصوں کے پیچھے جاتے ہیں جن میں اشتباہ ہے، فتنہ کی طلب میں اوراس کی تاویل کی طلب میں۔ اورنہیں جانتا ان کی تاویل کوئی مگر اللہ۔ اور راسخون فی العلم کہتے ہیں: ہمارا اِس پر ایمان ہے، سب ہمارے پرودگار کے پاس سے ہے۔ اورنہیں بات کو پاتے مگر اولوالالباب۔'' اے ہمارے پروردگار! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر دیجئو بعداس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔ اوربخش دے ہمیں اپنے پاس سے رحمت۔ بے شک تو بڑا دینے والا ہے''۔

☆☆☆☆☆

قرآن اور حدیث دین کا مصدر ہیں؛ بلکہ دین ہیں۔ اور دین کا یہ منبع محکم ہے اور اپنے آپ میں بے انتہا واضح۔ مگر پھر بھی اس کی ''تفسیر'' اور اس کا ''بیان'' اور اِس سے ''استدلال'' اور ''استنباط'' کرنا ایک با قاعدہ علم ہے اور اس علم کو درست طور پر جاننے اور سمجھنے والے تاریخی طور پر کچھ متعین لوگ۔

اصول فقہ کیوں بنے؟

یعنی...... ایسا بہرحال نہیں ہے کہ ''قرآن و حدیث'' کو جس نے بھی سمجھا، صحیح ہی سمجھا۔ سمجھنے والوں نے کہیں پر قرآن و حدیث کو صحیح سمجھا ہے تو کہیں پر غلطی بھی کھائی ہے۔ کسی نے چھوٹی غلطی کھائی ہے تو کسی نے بہت بڑی غلطی بھی کھائی ہے۔ امت کے جہابذۂ علم نے ''اصولِ فقہ'' بے مقصد یا بلا ضرورت وضع نہیں کر دیے، اور جو کہ علم کی ایک با قاعدہ فرع ہے۔ علم کی یہ جو فرع ہے __ یعنی ''اصول فقہ و مطالعۂ نصوص'' __ وہ کسی اور چیز کو نہیں ''قرآن و حدیث'' کو سمجھنے کیلئے ہی وجود میں لائی گئی ہے اور ظاہر ہے اِسی وجہ سے وجود میں لائی گئی ہے کہ اِسکے بغیر قرآن و حدیث کو __ علمی و فقہی سطح پر __ سمجھا نہیں جا سکتا۔ کیا یہ عجب ماجرا نہیں کہ قرآن اور حدیث کو درست طور پر سمجھنے کیلئے اتنے بڑے بڑے علماء کو تو ''اصولِ فقہ و استدلال'' ایسے علومِ آلہ کی ضرورت ہو، اور اِن آلات کے رکھنے اور انکے استعمال کا طریقہ سیکھ چکے ہونے کے باوجود، کسی وقت ان علماء و ائمہ کی سانس پھول جاتی ہو، مگر ہمارے یہ نوجوان پلک جھپکتے میں آپ کو سب حدیثیں سمجھ کر اور سب لاینحل عقدے حل کر کر دکھا دیں! قرآن و حدیث اگر آپ سے آپ سمجھ آ جاتے ہیں (اُس معنیٰ میں جو اِس وقت یہاں کے نو آموز نوجوانوں کو باور کرایا جا رہا ہے، اور جس کے اندر سطحیت حد سے زیادہ ہے) تو ''اصولِ فقہ'' ایسا ایک با قاعدہ علم وجود ہی میں کیوں لایا گیا......؟ ظاہر ہے، ''اصولِ فقہ''

ایک ضرورت کی چیز تھی نہ کہ کوئی شوقیہ ایجاد۔ پھر اہل علم کے ہاں یہ تک کہا گیا کہ فقہ تو کوئی بھی شخص پڑھ لے اور ایک پڑھی ہوئی اور حفظ کی ہوئی فقہ کو بے شک آگے بھی پہنچا دے، مگر اصولِ فقہ میں عبور پانا اور مسائل میں ''اصولِ فقہ'' کی تطبیق کر کے دکھانا تو ایک اعلیٰ سطح کا کام ہے اور ایک بلند تر سطح کی فنی استعداد کا ضرورتمند۔

اصول عقیدہ کا تقرر معمولی بات نہیں

پھر قرآن وحدیث کے وہ حصے تو اور بھی اہم ہیں جن سے ''اصولِ دین'' اخذ ہوتے ہیں اور جن میں سرفہرست: عقیدہ کے مباحث ہیں۔ انکے فہم کا معاملہ اور بھی شدید اور سنگین ہے۔ اور ظاہر ہے، دین کے یہ جوانب بھی فہم اور تفسیر کے انحرافات سے محفوظ نہیں رہے۔ بلکہ یہاں تو بڑوں بڑوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان میں سے بہتوں نے اپنی عاقبت بھی خراب کی ہے، اور اپنے دور کے ترجمانِ حق ائمہ سے اِس پر سرعام نکیریں بھی سنیں۔ پس دین کے اِن اہم تر جوانب کو بیان کرنے کیلئے تو ''فقہ'' اور ''اصولِ فقہ'' ایسے مراجع بھی کفایت نہیں کرتے، بلکہ اِس کیلئے آپ کو ''اصولِ عقیدہ'' کے کچھ خاص مراجع درکار ہوتے ہیں؛ جو کہ امت کے کچھ مستند ترین ائمۂ علم نے سلف کے دور سے چلتے چلے آنے والے ایک معروف طرزِ عمل کی تثبیت اور تدوین کے دوران قلم بند کئے ہوتے ہیں، اور جن کو نظرانداز کرنے والے لوگ عموماً ایسے ایسے گڑھوں میں گرتے دیکھے گئے ہیں کہ کوئی نجات کا فکرمند ہو تو صبح شام ان سے پناہ مانگے۔

پس قرآن وحدیث کا واضح ہونا اِس بات کو لازم نہیں کہ اِنکو سمجھنے کیلئے کچھ درست ترین اور مستند ترین معیارات کی پابندی کو غیرضروری ٹھہرایا جائے۔ اور نہ ہی یہ اِس بات سے متعارض ہے کہ _ تاریخی طور پر _ قرآن وحدیث کو درست طور پر سمجھنے والا ایک خاص متعین طبقہ ہو، اور اِسکو درست طور پر سمجھنے کیلئے اُسی طبقہ سے رجوع کرنا لازم ہو۔

ہر علم کے لئے (الف) کچھ معین معیارات کا پایا جانا اور (ب) کچھ معین رجال کا پایا جانا.. ضروریاتِ عقل سے ہے۔

☆☆☆☆☆

پہیہ دوبارہ ایجاد کرنا!

یوں تو خدا کی یہ کائنات بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ ان کو بھی کتاب اللہ میں خدا کی آیات کہا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک واضح کتاب ہے۔ ہر کوئی اس کو پڑھ سکتا اور اس سے فوائد کشید کر سکتا ہے۔ کسی پر بھی پابندی نہیں۔ کتابِ کائنات سے فوائد کشید کرنے کے بے شمار پہلو ہیں۔ کچھ ایمانی ہیں اور کچھ واقعاتی۔ کائنات کو واقعاتی انداز میں پڑھنے کا ایک پہلو 'سائنس' کہلاتا ہے۔ 'سائنس' کائنات کی بابت کئے گئے انسانی تجربات اور مشاہدات کا نام ہے۔ مگر 'کائنات' سے 'سائنس' کی کشید کے معاملے میں بھی کیا سب لوگ برابر ہیں؟ کیا سائنس کا علم بے حد واضح ہونے کے باوجود، (بلکہ سائنس کا تو معاملہ ہی دو اور دو چار کی طرح ہے؛ کیونکہ اِس میں اَھواء کو کوئی دخل ہی حاصل نہیں، جیسا کہ تھوڑا آگے چل کر بات آئے گی)، کچھ مخصوص مصادر سے لیا جانا ضروری نہیں؟ بے شک فزیکل سائنس ایک سامنے کی چیز ہے، پھر بھی کیا ''تجربے'' اور ''مشاہدے'' کی بابت کچھ خاص متعین اصول اور اسٹینڈرڈز انسانیت کے ہاں ڈیویلپ نہیں ہو چکے؟ سائنس کی وادی میں آ کر کیا ہر کسی کو اپنا ''پہیہ'' ایجاد کرنا ہوتا ہے یا 'پہیے' کی بابت پہلے سے چلے آنے والے عمل کو لے کر ہی آگے بڑھانا ضروری ہوتا ہے؟

''علمِ سائنس'' (جو کہ سامنے کی چیز ہے اور ہر کسی کی دسترس میں ہے) کی بابت بھی آدمی کو کیا کسی تاریخی تسلسل کا حصہ نہیں بننا ہوتا؟ یا پھر اس سے الگ تھلگ

رہ کر ہی کائنات کے حقائق کو 'از سرنو' دیکھنا اور پرکھنا ہوتا ہے؟ کائنات تو وہی کائنات ہے جو دس ہزار سال پہلے تھی۔ مگر کائنات کو پڑھنے کا عمل ایک تاریخی تسلسل ہے اور اب اسکے کچھ خاص قواعد وضوابط ہیں اور کچھ متعین مراجع، جن سے منقطع رہنا ہرگز کوئی علمی رویہ نہ کہلائے گا۔

ضروری نہیں یہ مثال ''دین کے علم'' کے معاملہ سے سوفیصد مطابقت رکھتی ہو۔ مگر یہ اس سے سوفیصد معارض بھی نہیں۔ ان دونوں معاملوں کا مشترکہ پہلو ہی دراصل اس مثال سے ہمارا مقصود ہے[۳]۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(حاشیہ ۱)

ہم سمجھتے ہیں اِس اپروچ کو فہمِ سلف کا ذرا سا ایک پَچ ملنا باقی ہے؛ البتہ جذبۂ اتباعِ حق اللہ کے فضل سے یہاں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

(حاشیہ ۲)

اِن مثالوں وغیرہ کے سلسلہ میں بعض طبقوں کے یہاں آپ ایک فنکاری دیکھتے ہیں کہ منہجِ سلف کی پابندی کو غیر ضروری جاننے کے باوجود کوئی ایسا خطرناک اعتقاد اُن کے یہاں بالعموم دیکھنے میں نہیں آ رہا ہوتا؛ اور اس بات کو یہ لوگ دلیل کے طور پر بھی پیش کر لیتے ہیں کہ دیکھ لو کام تو منہج سلف کا پابند ہوئے بغیر بھی چلتا ہے! اِس حوالہ سے چند باتیں آئندہ فصل میں آ رہی ہیں۔

(حاشیہ ۳)

ہماری اِس بات پر جو ایک سوال عموما اٹھ سکتا ہے، اُس پر کچھ گفتگو فصل ششم کے حاشیہ (۲۰) کے تحت آئے گی۔

5

سلف سے استغناء
مگر بیشتر استدلالات درست!

وہ حضرات جو قرآن و حدیث کو سمجھنے کے مستند مراجع (سلف اور سلف کے وضع کردہ معیارات و نظائر) کی پابندی کو ایک غیر ضروری چیز، اور کسی وقت تو 'تقلید' اور 'بدعت' قرار دیتے ہیں...... ان میں سے ایک فریق ایسا ہے جو خود تو اتنا 'سمجھدار' (اور فی الواقع چالاک) ہے کہ سلف کی راہ سے ہٹ کر کوئی خطرناک مفہوم اخذ کرنے سے اچھا خاصا ہوشیار رہتا ہے.. البتہ ایک 'تجاہل عارفانہ' سے کام لیتے ہوئے بضد اِسی بات پر نظر آتا ہے کہ اس کا اور سلف کا ایک بات کو ''صحیح طور پر'' سمجھنا محض ایک اتفاق 'co-incidence' ہے! گویا اِن گمراہیوں اور اِن گڑھوں سے بچنے کیلئے ''فہمِ سلف'' کی کوئی نظیر پہلے سے ہونا اِن حضرات کیلئے کوئی ایسا ضروری نہ تھا؛ یوں کہ ''فہمِ سلف'' کی کوئی رپورٹ متعلقہ موضوع پر اِنکو کہیں سے دستیاب نہ ہوتی تو بھی محض عربیِ مبین وغیرہ کی مدد سے اِنکو دین کی یہ سب باتیں ویسے ہی اور اتنے ہی واضح انداز میں سمجھ آجاتیں جتنی کہ اِنہوں نے اب سمجھ کر دکھا دی ہیں!!! حالانکہ بہت سے ٹریک اِس پورے عمل میں خود اِن حضرات نے بھی ہو بہو ویسے ہی اختیار کئے ہوتے ہیں جو سلف کے ہاں اختیار کئے گئے تھے اور وہ بھی

taken for granted۔ پھر؛ بہت سے مہلک گڑھوں سے یہ لوگ ''خبردار'' بھی محض اس لئے ہوتے ہیں کہ اُنکی سنگینی پر سلف کے ہاں اچھا خاصا کلام ہو چکا ہے۔ لیکن اِس بات کو صاف تسلیم کر لینا اِسلئے اِنکے وارے کا نہیں کہ اِس سے منہج سلف کی خوامخواہ ایک تعظیم ہو جاتی ہے اور اس راہ کا پابند ہونے کی ایک بنیاد بھی پیدا ہو جاتی ہے جو پھر بعض خاص جگہوں پر 'آزاد' ہو جانے میں رکاوٹ بھی ہونے لگتی ہے! پس زیادہ بہتر یہی ہے کہ کن انکھیوں سے دیکھا تو سلف کی راہ کو ہی جاتا رہے مگر اس کا سب حوالہ خود اپنی ہی اَقُول سے دیا جاتا رہے! اِس سے ایک تو آدمی کی کوئی ایسی بڑی غلطی نہیں پکڑی جائے گی، سوائے اُن چند جگہوں کے جہاں سلف کی راہ چھوڑنا کچھ خاص اَھواء کے باعث آدمی کے ہاں عمداً 'ضروری' ہو گیا ہو۔ دوسرا، یہ ثابت کر کے دکھا دیا جائے کہ سلف کی راہ سے آزاد رہ کر بھی دین کے ایک بہت بڑے حصے میں آدمی عین اُنہی نتائج پر بڑے آرام سے پہنچ لیتا ہے جن پر سلف 'بھی' کسی طریقے سے پہنچ گئے تھے، اور یوں بڑی آسانی کے ساتھ سلف کی بابت وہ عظیم الشان تاثر اور وہ پرشکوہ تصور کہ یہ نہ ہوتے تو فہمِ دین کا کوئی درست و مستند راستہ ہوتا ہی نہ، غیر ضروری اور 'تقلیدی رجحانات' کا شاخسانہ بنا کر پیش کر دیا جائے!!!

چنانچہ ایک عام آدمی اِس فنکاری سے کم از کم ''متاثر'' ضرور ہوتا ہے کہ سبحان اللہ، سلف کی راہ کی پابندی بھی کہیں نہیں ہے مگر بے شمار معاملات میں عین وہی نتائج جو کسی زمانے میں سلف کی 'تحقیق' سے ''بھی'' سامنے آ گئے تھے اِدھر آپ سے آپ آ رہے ہیں!!! یہاں تک کہ ''اعتقاد'' وغیرہ سے متعلق کچھ نازک ترین مقامات پر بھی، دامن غلطیوں اور گمراہیوں سے یوں بچا چلا جاتا ہے کہ اب یقین آیا یہاں تباہی و بربادی سے بچنے کیلئے 'عربِ مبین' وغیرہ کے سوا درحقیقت کسی بھی چیز کی ضرورت نہ تھی! رہ گئے وہ

سب خطرناک عواقب جو سلف کی راہ سے منحرف ہونے والوں کے حق میں آج تک ذکر ہوتے آئے تھے اور وہ سب خوفناک ہوّے اور ڈراوے جو اِس باب میں ہم نسل در نسل سنتے آئے تھے.. تو نجانے وہ کن کم عقلوں کیلئے تھے، یہاں تو سوائے 'نیک نیتی' اور 'مثبت ذہن' اور 'عقل عام' وغیرہ کے التزام کے، ضرورت ہی کسی بات کی نہ تھی؛ کتاب و سنت آپ سے آپ یوں سمجھ آتی چلی جاتی ہے کہ کہیں کوئی رکاوٹ ہی پیش نہیں آتی!!!

عین جس طرح _ انبیاء سے مستغنی طبقوں کی نگاہ میں _ بہت سے اخلاقیات اور سماجیات، بلکہ انسانی زندگی کے بہت سے اشد ضرورت کے امور، اور حق و باطل اور معروف و منکر کے بہت سے بنیادی مسائل، انبیاء کے بغیر بھی انسانوں کو سمجھ آ جاتے ہیں.. اور کوئی ایسی رکاوٹ نہیں کہ جس کیلئے معاملہ ''انبیاء'' پر موقوف رکھا جائے!!!

بنا بریں، سلف کے منہج کا التزام کئے بغیر سلف سے 'خاصی حد تک ملتے جلتے' تحقیقی نتائج دے دینے کے دعوے بے شک ایک بڑی محنت اور کاوش کے غماز ہوں، لیکن حقیقت میں دیکھیں تو یہ ایک نہایت سطحی، سرسری اور جعلی اسلوب پر قائم ہیں؛ جن کے اندر دیانت بھی شدید حد تک مفقود ہے۔

اور کچھ بھی نہیں تو ایک ''صفاتِ خداوندی'' اور ''تقدیر'' کے مسئلہ پر ہی کوئی شخص منہجِ سلف کی ہیبت سے بے نیاز ہو کر ''حق'' کا بیان کر دے تو دنیا اُس کی حقیقت دیکھ لے۔ یا تو ایسا آدمی گمراہیاں بیان کر کے دے گا (البتہ ایک تیز طرار شخص بالعموم اپنے لئے ایسی مصیبتیں کھڑی نہیں کرے گا)۔ اور یا پھر آپ صاف دیکھیں گے کہ وہ ایک ایک گڑھے سے، جن سے سلف خبردار کرتے چلے گئے ہیں، پوری بیداری اور انتباہ کے ساتھ بچتا چلا جا رہا ہے البتہ اِس چیز کو اپنے ہی فہم سے منسوب اور اپنے ہی زورِ بازو کا کمال باور کراتا جا رہا ہے۔ یعنی یہ پورا عمل وہ نہایت توجہ اور باریک بینی کے ساتھ سلف

کے دیے ہوئے پراسیس سے گزر کر چلے گا، مگر ایک فضل کو اُس کے اہل سے منسوب کرنے میں اچھی خاصی بددیانتی برتے گا۔ اس کا معاملہ ایسے شخص سے مختلف نہ ہوگا جو ایک پہلے سے بنے ہوئے جہاز کے نقشے پر ہی ایک 'نیا' جہاز بنا دے اور اُن سب باتوں کی بابت نہایت متنبہ رہے جو اُس کے اصل صانع کے یہاں پیر پیر پر مدنظر رہی ہیں (ہاں اس کے اندر اگر کوئی تھوڑی بہت تبدیلی کرے تو وہ البتہ خاصی اوٹ پٹانگ ہو) مگر دعویٰ یہ کرے کہ اُس نے خود اپنا کوئی پراسیس اختیار کیا ہے اور یہ کہ ہر دو فریق کا عمل آپ سے آپ ایسا ہے کہ اس کے نتیجے میں ہمیشہ ''جہاز'' ہی بنتا ہے!

آپ اِن چند مثالوں ہی کو لے لیں جو پچھلی فصل میں (ص۔٦٧ تا ۷۱) دی گئی ہیں.. اِن مثالوں کے اندر پائے جانے والے خطرناک و نازک مقامات کا خطرناک ہونا ہمارے اِن لوگوں کو معلوم تک نہ ہوتا اگر سلف کے ہاں اِس طرح کی باتوں پر چہرے لال پیلے نہ ہوئے ہوتے۔

اِس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ فہم کے پیمانے کہیں پر اگر کچھ صحیح ہیں تو وہ لئے ہی سلف سے گئے ہیں اور سلف کے علاوہ وہ کہیں سے ملنے والے ہی نہ تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے مگر اس حقیقت کا صاف اعتراف کر لینے سے کہیں کہیں پر _ جہاں سلف کو گم گشتہ قرار دینا 'ضروری' نظر آتا ہو_ اپنی ھوائے نفس کی تحکیم دشوار ہو جاتی ہے!

بہرحال گزشتہ فصل میں گزرنے والی اِن مثالوں پر ہی اگر ذرا غور فرما لیا جائے کہ قرآن وحدیث کی اِس جیسی بے شمار نصوص سے، اور باقاعدہ اِن نصوص کا حوالہ دے کر، بعض گمراہ دعوتیں کیسے کیسے غلط مفہومات نکال کر لوگوں کو دیتی رہی ہیں اور کس کس طرح یہاں پر مسلمانوں کو گمراہ کرتی رہی ہیں، تو لازماً آپ اِس بات کی ضرورت محسوس کریں گے کہ مسلم معاشروں کو ایک اصل پر باقی رکھنے کیلئے ضروری

ہے کہ فہمِ نصوص کے معاملہ میں یہاں پر ایک واضح، اسٹینڈرڈ اور معلوم انداز کے نظائر ہوں، جو نہ صرف محکم اور محفوظ ہوں بلکہ وہ اِس امت کے اندر عین شروع سے ہی چلے آ رہے ہوں۔ اور اُن کا باقاعدہ حوالہ دے کر اُن کی پابندی ہو۔ نیز یہ کہ دین کے کچھ بنیادی اور واضح اور معلوم امور میں: نئی نئی بولیوں کی نہ تو گنجائش ہو اور نہ اِن نئی نئی بولیوں کو ایسا کوئی اصولی رخنہ حاصل ہو کہ ہر نئی بولی کے آنے پر امت کو طویل و عریض بحثوں اور جواب در جواب الجھنوں میں جا پڑنا ہو، یا جب تک ایک نئی بولی کا ''رد'' سامنے نہ لائے امت اُس کی مقروض اور دیندار مانی جائے!

اگر یہ بات درست ہے تو اِس کی عملی صورت آپ اِس کے سوا اور کوئی نہ پائیں گے کہ نصوصِ شریعت کو سمجھنے کے معاملہ میں لوگوں کو عین قرونِ سلف سے چلے آنے والے اُس ٹکسالی فہم پر قانع کروایا جائے؛ دین کے اصول و مبادی کو اُنہی پرانی بنیادوں پر من وعن باقی رکھا جائے، اور نصوص کے نئے نئے مطلب نکالنے کا راستہ کھول کر ہرگز نہ دیا جائے۔

چونکہ **''آسمانی امت'' وہ چیز ہے جس کو ایک بچھی بچھائی پٹڑی پر، ایک بھاری بھرکم ٹرین کی صورت، زمانے کی رفتار سے، پیش قدمی کرنی ہوتی ہے اور پورے جہان کو اپنے عمل کی زد میں لانا ہوتا ہے**؛ یوں اس زوردار عمل کی اپنی طبیعت ہی اِس بات کی متحمل نہیں کہ یہ (امت) آوارۂ صحرا ہوتی اور رک رک کر راستے جھانکتی اور ایک کے بعد ایک اپروچ کو آزماتی اور ترک کرتی پھرے... یعنی **''آسمانی ملت'' ایک نہایت کشادہ اور معلوم اور پہلے سے تیار و طے شدہ، پختہ اور ناقابل تبدیل شاہراہ پر رواں دواں عمل سے عبارت ہے**...... لہٰذا بعض خرانٹ ذہنوں نے اِس حقیقت کو بھانپتے ہوئے یہیں سے اِس کے پیچ ڈھیلے کرنا شروع کر دیے؛ چنانچہ اب یہ اہل اسلام کا ایک ''امت'' ہونا ہی مشکوک ٹھہرانے لگے ہیں۔ اِس کے بعد تو ظاہر ہے آپ اِسکے ساتھ جو مرضی کریں!

6

مراجع فہم کے حوالے سے ایک ضروری بحث

انبیاؑء اور اصحابؓ کا راستہ اپنائے بغیر

اھواء سے دور ہونے کا دعویٰ سب سے بڑا جھوٹ ہے

اور اب وہ موضوع جو ''علم شرع'' کو (اور اس سے متصل ''سماجی علوم'' کو بھی) عام طبعی علوم سے ممیّز کر دیتا ہے......

أھواء کا علاج: انبیاء سے موروثہ علوم اور اصحاب سے موروثہ مناھج

جیسا کہ بعض اہل علم نے اِس بات کی نشاندہی کی:

خدا نے وہ علوم ویسے ہی انسانوں پر چھوڑ دیے ہیں جن کے اندر اَھـواء کو کوئی دخل نہیں۔ مثال کے طور پر یہ کشش ثقل ہے، حرکت کے قوانین ہیں، اشیاء کے کیمیائی خواص ہیں، خلیوں کی ساخت ہے، زمین کی گردش ہے، وغیرہ وغیرہ.. یہ سب انسان پر چھوڑ دیے گئے ہیں؛ کہ جب بھی معلوم کرنے ہوں خود ہی کر لے۔ اِن اشیاء میں انسانی اَھواء کو کوئی دخل نہیں؛ ہر کوئی بالآخر ایک سے ہی نتیجے پر پہنچ جائے گا۔

البتہ خدا نے انبیاء کو اُن علوم کے ساتھ بھیجا ہے جن کے اندر انسانی اَھـواء کو ایک خاص دخل ہوتا ہے۔ کوئی علم ایسا نہیں جس میں انسانی اَھواء اور رجحانات اور میلانات و خواہشات وجذبات دخل انداز ہو سکتے ہوں اور اُس علم کے اصول basics خدا نے آپ اپنی جناب سے شرائع کے ذریعے نہ دیے ہوں۔ توحید اور

اصولِ ایمان سے لے کر عبادات وغیرہ ایسے امور تو خیر ہیں ہی توقیفی[(۱)]، آپ دیکھتے ہیں وہ امور بھی جن میں عقول کو ایک گونہ دخل ہے اور اسی کے بقدر وہ انسان کی تحقیق اور تدبیر پر چھوڑ بھی دیے گئے ہیں مانند معیشت، سیاست اور معاشرت وغیرہ[(۲)].. اِن علوم کے بھی جو اصول اور مبادی basics ہیں وہ شرائع ہی دیتی ہیں اور شرائع ہی دے سکتی ہیں[(۳)]۔

چنانچہ اصولِ ایمان و عبادات ہی نہیں، اصولِ معیشت، اصولِ سیاست اور اصولِ معاشرت وغیرہ تک میں:

- حق کو کھونے کے حوالہ سے اَھــــواء کو اور دل کے ٹیڑھ کو بے حد وحساب دخل حاصل ہے[(٤)]..

- دوسری جانب ــــ حق کو پانے کے حوالہ سے ــــ تقویٰ اور اِنابت اور استقامت کو بھی اُسی بقدر دخل حاصل ہے۔ اور سب سے بڑھ کر خدا کی جانب سے ملنے والی توفیق اور سینے کا کھلنا۔

قرآن سے یہ بات مختلف انداز میں کھل کر سامنے آتی ہے اور یہی چیز پھر احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ''ضلال'' کی ہمیشہ دو صورتیں رہی ہیں:

ا) ایک وہ جب نبی اور کتاب ملے ہی نہ ہوں اور آدمی گم گشتگی کی زندگی گزار رہا ہو۔ یا نبی و کتاب کے ملنے پر بھی آدمی نے اُس کو رد کر دیا ہو۔ یہ أھــــــواء کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ خدا نے اِس دنیا میں باقاعدہ گنجائش چھوڑ رکھی ہے کہ نبی اور کتاب کو صاف رد کر دینے کے بعد بھی آدمی اپنے آپ کو دانش کی معراج پر جانے، خوب فلسفے بگھارے، علوم کے ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا نظر آئے۔ 'معروضیت' کا ٹھیکیدار بن کر رہے۔ بلکہ انبیاء کے پیروکاروں کو 'biased' قرار

دے اور اشیاء کو 'عقلی'، 'منطقی' بنیادوں پہ لیا جانے کیلئے اودھم مچاتا پھرے! غرض یہ دنیا ایسی بنائی گئی ہے کہ نبی اور کتاب کو ٹھکرا دینے کے بعد بھی ضروری نہیں آدمی کے سر پر سینگ نظر آنے لگیں اور وہ اپنی اِس ہیئت کے باعث شرم سے چھپتا پھرے! یہاں جو ''مہلت'' اُس کو حاصل ہے وہ اِس معنیٰ میں بھی ہے کہ کفر پر مصر رہ کر بھی وہ اپنا پندار قائم رکھ سکے اور اپنا یہ زعم کہ اُس کا فیصلہ ایک نہایت 'صحیح' بنیاد پر ہے جتنی دیر چاہے برقرار رکھے۔ اصل امتحان دراصل کسی اور چیز کا ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اُس کے دل کا برتن عین اُس سیدھی حالت میں رکھا جاتا ہے کہ جس میں ''ہدایت'' کی خیرات انڈیلی جا سکے۔ أھواء دراصل دل کا اُس حالت سے لڑھک جانا ہے جو ہدایت کو اُس کے اندر راستہ پانے کیلئے درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اپنی بدترین حالت میں آدمی کو مکمل طور پر اندھا اور اوندھا کر دیتی ہے درحالیکہ وہ اپنے آپ کو بہترین بنیاد پر جانتا ہے، بلکہ بعض کو اِس سمت میں خاصی خاصی ترقی دی جاتی ہے۔

اھواء کی یہ قسم جو کہ شدید تر ہے، آدمی کے انبیاء کے راستے پر آنے میں مانع ہوتی ہے۔

۲) اھــواء کی دوسری قسم وہ ہے جو آدمی کے، انبیاء کے "حــواریــون و أصــحاب" کے راستے پر آنے میں مانع ہوتی ہے؛ جبکہ وہ 'مہلت' اور 'گنجائش' جو اُس کی 'معروضیت' کا زعم نہ ٹوٹنے دے، اس کو یہاں پر بھی دستیاب ہوتی ہے......!

ضلال کی یہ دوسری صورت وہ ہے جس کے حوالے سے **مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ**، یا **مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ** ایسے لفظ آتے ہیں۔ ضلال کی اس دوسری صورت کے سیاق میں عموماً ''اختلاف'' یا ''افتراق'' کا لفظ بھی آتا ہے۔ یہ افتراق نبی و کتاب کے نسبت یافتگان کے مابین ہوتا ہے؛ پھر اس کے ساتھ ایک اور نہایت

اہم لفظ: **بغیاً بینھم**۔ اور اس کے ساتھ؛ **أھواء** سے بچنے کی شدید تاکید بھی بلکہ وعید بھی۔ حدیث میں یہ بات تک ملتی ہے کہ ''اَھواء'' اور فتنوں (۵) وغیرہ کو قبول کرتے چلے جانے والوں کے دل ٹیڑھے بلکہ کسی وقت الٹے کر کے رکھ دیے جاتے ہیں اور یہ بھی کہ ایسا دل پھر شرعی حقائق کو نہ صرف صحیح طور پر دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے بلکہ وہ حقائق کو الٹا بھی دیکھنے لگتا ہے۔ ہوتے ہوتے، بلاشبہ ایک دل کا معاملہ ایسی حالت کو پہنچتا ہے کہ وہ ایک حق ہی کو باطل دیکھنے لگے اور ایک باطل ہی کو حق (۶)؛ اور اپنی اس گمراہی پر وہ ''شریعت'' کے اندر بھی پھر ڈھیروں دلائل دیکھے (۷)۔ خوارج، معتزلہ اور دیگر بہکے ہوئے فرقوں میں سے بہت سے لوگ اچھے خاصے مخلص بھی ہوتے تھے اور ذہین بھی اور محنتی بھی، مگر دراصل یہ ''اَھواء'' ہوتی ہیں جو ایک 'برسات کے اندھے' کو پھر ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھانے لگتی ہیں (یہاں تک کہ لوگ صحابہؓ کے خلاف ہتھیار اٹھا کر کھڑے ہو جاتے رہے ہیں) اور واقعتاً ایسے آدمی کو یہ تعجب تک ہونے لگتا ہے کہ وہ بات جو شریعت کے اندر اس کو اتنی 'واضح' اور 'جلی' ہے، آخر دوسروں کو نظر آ کیوں نہیں رہی!

لفظ ''أھواء'' کی بابت: عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہ محض کوئی مال و جائیداد کی خواہش، یا طلبِ اقتدار یا شہوتِ جنس وغیرہ قسم کی چیز ہے! حالانکہ اصولِ عقائد کی کتب دیکھیں تو لفظ ''اَھواء'' کا جس قدر اطلاق کسی ایسی ''فکری لت'' پر ہوتا ہے جو ایک آدمی کو نشے کی طرح لگ جاتی ہے اور بالآخر اس کو اندھا کر کے رکھ دیتی ہے اُتنا اِس لفظ کا اطلاق بطن و فرج کی خواہشات پر نہیں ہوتا۔ ھوی: وہ کوئی بھی چیز جو آدمی کو 'چڑھ جائے' اور چھپ چھپ کر آدمی کی سوچوں thoughts، آدمی کے لہجوں tones، آدمی کے استنتاجات derivations اور اس کے فکری میلانات

intellectual tendencies کے اندر موثر طور پر کارفرما ہو۔ **حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے آدمی ذہنی اور فکری طور پر ایک ''رُوٹ'' اختیار کرتا ہے اور اس کے بعد جا کر ہی ''مسائل'' اور ''دلائل'' وغیرہ کو ہاتھ ڈالنے کی نوبت آتی ہے۔ ''أھواء'' کا ایک بہت بڑا اثر اِس سب سے پہلے مرحلے پر ہی ہو چکا ہوتا ہے، یعنی ایک فکری رُوٹ اختیار کرتے وقت ہی۔** یہاں پر ہم سلف کے منہج کی بابت پائے جانے والے اِس بیان سے حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کو ''قرآن سے پہلے ایمان''[8] سکھایا جاتا تھا!

پس ایک یہ ''اَھواء''...... اور پھر اس پر مستزاد **بغیاً بینھم** ......[9]۔ اہل حق[10] کی راہ کے ساتھ آدمی کو ایک ضد یا ایک نفور سا ہو جانا۔ ان کی راہ کو بڑھیا جاننے کے تصور کو 'کچھ غیر ضروری سا' ثابت کر دینے اور اس کے بعض جھول اور نقص ڈھونڈ نکال لانے کی اَن دیکھی سی رغبت کا آدمی کے کسی نہاں خانے میں جنم لے لینا اور پھر رفتہ رفتہ اُس کے درون میں سرایت کرتے چلے جانا۔ یہ بھی بغی میں ہی شامل ہے[11]۔ یوں بہت سے دیدہ و نادیدہ اسباب ایسے ہو جاتے ہیں جو اِس معاملہ میں باقاعدہ ایک مہمیز کا کام دیں کہ آدمی اپنے اختیار کردہ ایک خاص ''روٹ'' پر ہی چلتا چلا جائے؛ اور رک کر کہیں دیکھنے کا نام نہ لے۔ اُس راہ کے اندر اُس کو ایک ایسی دلجمعی ملتی ہے کہ کسی کسی وقت وہ اُس کو 'خدا کی توفیق' لگتی ہے۔ مگر، ھیھـــــــات! سلف (حواریون و أصحاب، اور ان کے تلامذہ وتوثیق شدگان، ووابستگان) کی راہ سے ہٹ کر کسی راہ پر دلجمعی ویکسوئی پانا کونسی خدائی توفیق اور کونسا شرحِ صدر؟! یہ محض استدراج ہوتا ہے...... اور تب آدمی کا دماغ باقاعدہ ایک جہت میں 'کام کرنا' شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہو جائے، **اور جو کہ اِس عمل کا اہم ترین مرحلہ ہے**، تو پھر اس شخص کو

''اصول'' بھی نئے سے نئے ملتے چلے جاتے ہیں اور ''فروع'' بھی۔ یہاں تک کہ پوری شریعت اُس کو ایک نئی ہی ترتیب میں نظر آنے لگتی ہے اور تب ایسی ایسی 'دریافتیں' ہوتی ہیں کہ خود وہ بھی دنگ رہ جاتا ہے اور ان پر سر دھننے والے بھی! ایسی ایسی 'سامنے کی چیزیں' سامنے آنے لگتی ہیں کہ کوئی آدمی اُس شخص کے ہاں باقی ہر سوال کا جواب پا لے تو بھی اِس ایک سوال کا جواب نہیں پاتا کہ اِن اتنی 'واضح' باتوں کو دیکھ نہ سکنے کے معاملہ میں ''پہلوں'' کی عقل آخر چلی کہاں گئی تھی؟!

مگر...... بجائے اِس کے کہ یہ ایک سوال (کہ ''پہلوں'' کی عقل اِس معاملہ میں کہاں چلی گئی تھی؟) اُس کے کان کھڑے کر دے، جس سے اس راہ میں اُس کے سرپٹ بھاگتے قدم ذرا ٹھٹھک جائیں، وہ اس کو اپنے اوپر خدا کا ایک ایسا فضل دیکھتا ہے جو خدا نے اُس سے پہلوں پر نہیں کیا؛ اور ظاہر ہے خدا کو اُس کی دین پر کون پوچھ سکتا ہے!

پس یہ ایک بہت بڑا اور بظاہر نظر نہ آنے والا فیکٹر ہوتا ہے جو آدمی سے ہدایت اور صواب کا دامن چھڑوا دینے کا باعث بنتا ہے۔ مگر اَھواء کی مار کوئی عام سی مار نہیں ہوتی؛ اِس کا اصل وار ہی یہ ہے کہ یہ آدمی کو 'دلائل' وغیرہ کے زعم سے تہی دست نہ ہونے دے!

''اَھواء''.. اور بغیاً بینھم .. دراَصل ہے ہی ایک ایسا ذہنی وفکری ونفسیاتی روٹ جو انسان کے اندر باقاعدہ چھپ کر کام کرتا ہے اور خود اُس کے اپنے ضبط میں تو آنے والی یہ چیز ہی نہیں۔ یہ اُس کے کسی زیغ کی سزا ہوتی ہے جو پھر اُس سے بھی بڑے کسی زیغ کی صورت میں اُس کے سامنے آتی ہے [۱۲]۔ یہ نفس کا اندھاپن ہے؛ اور حق یہ ہے کہ اِس کی بھی انسان کے اندر بے حد وحساب گنجائش رکھی گئی ہوتی

ہے؛ کہ وہ جس قدر چاہے اِس کو بڑھا لے۔ البتہ اِس کا کوئی ایک درجہ نہیں؛ کہیں یہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ انبیاء اور کتابیں اور معجزے سامنے ہوں تو نظر نہیں آتے اور آدمی اپنی ہی رفتار سے چلتا چلا جاتا ہے، اور جو کہ کفار کی ایک صنف کی حالت ہوتی ہے اور باقاعدہ قرآن سے ثابت ہے (۱۳).. اور کہیں اس کی شدت صرف اِس قدر ہوتی ہے کہ حواریون و أصحاب کا راستہ روپوش ہونے لگتا ہے، اور جو کہ خوارج اور معتزلہ اور اِسی طرح کے دیگر اهل الأهواء کی حالت رہی ہے۔ البتہ عدل یہ ہے کہ اِس (موخرالذکر) کو ایک ہی درجہ نہ مانا جائے؛ کسی سے حواریون و أصحاب کا راستہ ایک زیادہ بڑی اور زیادہ سنگین صورت میں چھوٹتا ہے اور کسی سے نسبتاً ایک کم سنگین صورت میں۔ یہیں سے اہل بدعت کی درجہ بندی ہوتی ہے؛ البتہ ہر کسی کے ابتداع اور حق سے بُعد کو ماپنے کیلئے جو پیمانہ scale اور جو نقطۂ حوالہ referring point ہوتا ہے وہ مدرسۂ حواریین و أصحاب ہی ہوتا ہے۔ چونکہ سیاق یہاں پر ''نبی کی پہچان'' اور ''شریعت کا مصدر'' نہیں بلکہ ''فہم'' کی معیاریت ہے، لہٰذا پیمانہ اور نقطۂ حوالہ یہاں پر ''نصوص'' نہیں بلکہ وہ ''مدرسہ'' ہوتا ہے جس نے نبی سے وہ دین پڑھا اور آگے پڑھایا ہوتا ہے۔

''فہم'' کی بابت پائے جانے والے ''اَھواء'' اور بغیاً بینھم ایسے ایک (پوشیدہ، منہ زور، غیر منضبط اور ہدایت کو پانے یا کھونے کے معاملہ میں ایک موثر ترین) عامل کو ضبط میں رکھنے کا ایک ابتدائی و بنیادی پیمانہ اِس کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص مدرسۂ حواریین و أصحاب کی اِس حیثیت کو دیکھنے سے قاصر ہے...... اُس کیلئے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

چونکہ أھـواءایک نہایت خفیہ وموثر وشدید ترین عامل ہے، اوراپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے ایک غیر منضبط چیز۔ (بات فہم و اصولِ فہم وضع کرنے کی ہو رہی ہے) جس کوکسی قاعدہ و دستور میں رکھنا بھی بہر حال لازم ہے...... یہی وجہ ہے کہ:

پہلی تلقین: "پھلوں کی راہ"

ا) سلف میں ایک تو اِس بات پر بے اندازہ زور دیا جاتا رہا کہ "پہلوں" کا راستہ ہرگز نہ چھوٹنے پائے[١٤]، کیونکہ "پہلوں" کا راستہ ہی وہ واحد چیز ہوتی ہے جس کی بابت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حق ہے؛ آسمان کی کوئی شہادت ہوتی ہے تو صرف اُنکے حق میں { **اُن کے خود صاحبِ نبوت کی نظر کے سامنے پروان چڑھا ہونے کے باعث اور اُنکو صاحب نبوت کی جانب سے باقاعدہ تزکیہ اور توثیق حاصل ہونے کے ناطے** }۔ اور یہی وجہ ہے صاحبِ نبوت کی ادا کردہ مہم کے حوالے سے قرآن میں وہ پورا پیکیج بھی ذکر کیا جاتا ہے، یعنی:

الف: تلاوتِ آیات، اور یہ وہ کام ہے جو نبی نے بنفس نفیس خاص اُن اصحاب کے نفوس کے اوپر کیا ہوتا ہے (**یتلو** میں فاعل = نبی + اور **علیھم** میں ھُم کی ضمیر = اصحاب)... اور یہ بات کسی اور کو حاصل نہیں۔

ب: اور تزکیہ (**یزکی** فاعل = نبی + **ھم** کی ضمیر = اصحاب)۔ تزکیہ جو کہ "نفوس" کی پوری اِعداد ہے، اور جس کے اندر اُن کو سوچ اور فکر کے کچھ خاص سانچوں میں ڈھال دینا بھی آتا ہے (باقاعدہ نبی کے اپنے ہاتھوں)... اور یہ بات تو بالکل ہی کسی اور کو حاصل نہیں۔

ج: اور پھر تعلیمِ کتاب وحکمت کے ایک باقاعدہ پراسیس سے بھی اُن کو نبی کے

ہاتھوں ہی گزارا جانا (**یُعَلِّمُ** = نبی + **هُم** اصحاب + **الکتاب** + **والحکمة**)۔اور یہ بات بھی ہرگز کسی اور کو حاصل نہیں۔

د: پھر اِس پورے پراسیس سے گزار کر آخر میں ان کو سند دے دی جاتی ہے: **رضی الله عنهم ورضوا عنه** ۔آسمان کی چھپی ہوئی سند۔ جو کہ اُن کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی؛ کہ یہ سند چھپنا ہی اب بند ہو چکی ہے!

یوں سمجھو، واقعاتی حوالے سے، جہاں نبی نے اتنے سال لگا کر اپنے زمانے پر ایک حجت قائم کر دی ہوتی ہے (گو وہ حجت ما بعد کے زمانوں کیلئے بھی ویسی ہی valid ہوتی ہے).. وہاں ___ **رہتے زمانوں کیلئے** ___ **اتنے سال کی محنت سے نبی نے فہم اور تلقی اور اتباع کا ایک باقاعدہ سند یافتہ "پیمانہ" بھی ایجاد کر دیا ہوتا ہے،** جس کو کہ "حواریون وأصحاب" کہا جاتا ہے......:

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:

ما من نبيٍّ بعثه الله فی أمة قبلی إلا كان له من أمته حواريون وأصحاب يأخذون بسنته ويقتدون بأمره، ثُمَّ إنها تخلف من بعدهم خلوف يقولون ما لا يفعلون، ويفعلون ما لا يؤمرون، فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن، ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن، وليس وراء ذلك من الإيمان حبَّة خردل۔[(١٥)]

(صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب كون النهى عن المنكر من الايمان)

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے، کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

کوئی نبی ایسا نہیں جسے اللہ نے مجھ سے پہلے مبعوث فرمایا ہو، مگر یہی ہوتا رہا کہ امت میں اُس کے حواری اور اصحاب ہوتے۔ جو کہ اُس کی سنت کو اختیار کرتے

اور اس کے حکم وہدایت کی اقتدا کرتے۔ پھر یہ ہوتا کہ اُن کے بعد کچھ نا خلف آ جاتے۔ جو کہ اُن چیزوں کے قائل ہوتے جن کے وہ فاعل نہ تھے (عملی انحراف)، اور اُن چیزوں کے فاعل ہوتے جن کی اُن کو ہدایت نہ تھی (فکری انحراف)۔تو پھر جو شخص اُن سے لڑائی کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ وہ مومن ہوا، اور جولڑائی کرے ان سے زبان کے ساتھ وہ مومن ہوا، اور جولڑائی کرے اُن سے دل کے ساتھ وہ مومن ہوا۔ اور اس سے کم البتہ ایمان نہیں ہے رائی کے دانے کے برابر بھی۔

یہ ضمانت کہ اُنہوں نے اُس نبی کی سنت پر چل کر دکھایا ہے اور اُس کے حکم و ہدایت کی اقتداء کر کے دکھائی ہے، (اور جو کہ پورا ایک اسکیچ بنتا ہے، اور جس میں تلقی بھی آتی ہے اور تلقی کا منہج بھی، عقیدہ بھی، فکر بھی اور عمل بھی، تہذیب بھی اور سماج بھی)... یہ ضمانت اُس پوری امت میں سے صرف اور صرف ''حواریون و أصحاب'' ہی کو ملی ہوتی ہے۔ اور یہ ہرگز کوئی معمولی شہادت نہیں ہے۔ نبی کے مدرسہ سے نکلے ہوئے اِن ''حواریون و أصحاب'' کا پھر اپنے تابعین میں سے اپنے اُن حلقہ بگوشوں کو ــــ جو سالہا سال جان مار کر اُن (حواریون و أصحاب) سے وہ کچھ لیتے رہے ہوں جو وہ نبی سے لیتے رہے تھے ــــ سند دینا ویسا نہیں جیسا آج کے آڈیٹوریمز کے سامعین، یا جلسوں کے حاضرین، یا میڈیا کے ناظرین کا کسی کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ 'لگتا تو بڑا زبردست عالم ہے'!

اصل چیز ''منہج'' ہے، ''استدلال'' تو پھر اس ''منہج'' کو اختیار کرنے کے بعد ہوتا ہے! نبی کے اصحاب سے سب سے پہلے جو چیز لی جاتی ہے وہ یہ ''منہج'' ہی

ہے۔ اور یہ منہج ''حواریون وأصحاب'' سے اور ان کے تلامذہ سے ہی لیا جائے گا؛ کوئی اور ہے ہی نہیں جس کے پاس دینے کیلئے کوئی ''منہج'' ہو۔ اور ہے کون جس نے آسمان سے مبعوث کسی نبی سے اپنا تزکیہ کروایا ہو؟ نبی کے ہاتھوں، اور وہ بھی سالہا سال کے عمل سے، اپنے قلب و ذہن اور اپنے اندازِ فکر کی باقاعدہ ایک ساخت کروائی ہو؟ فکر وعمل کے معاملہ میں نبی کے ہاتھوں وہ باقاعدہ ایک ''سانچے'' کی صورت میں ڈھل گیا ہو، اور پھر نبی سے اس چیز کی باقاعدہ سند بھی پائی ہو؟ پس نبی کے براہ راست تلامذہ اور یا پھر ان کے تلامذہ کے سوا کسی اور کے پاس امت کو دینے کیلئے کوئی ''منہج'' ہو، ''تلقِّی'' کا کوئی فارمیٹ ہو.. سب سے بیہودہ کوئی بات ہوسکتی ہے تو وہ یہی۔ یہ منہج اور یہ فارمیٹ صرف اور صرف حواریون وأصحاب اور ان کے سند یافتہ تلامذہ کے ہاں ہی ڈھونڈا جائے گا اور جو کچھ اُن کے ہاں سے مل جائے اُسی کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت جانا جائے گا اور اُسی پر پورے شرح صدر کے ساتھ کفایت کی اور کروائی جائے گی۔ اور اُسی کو بنیاد بنا کر آگے بڑھا جائے گا۔

یہاں سب سے بڑھ کر حیرت آپ کو اُن لوگوں پر ہوگی جو آپ کو فہم اور استدلال سے پہلے فہم و استدلال کے ''مبادی'' ہی خود اپنے پاس سے دے رہے ہوتے ہیں! (اِس مضحکہ خیز دعویٰ کے ساتھ کہ اپنے یہ مبادی وہ ہمیں کتاب اور سنت اور 'عقل عام' سے نکال کر دے رہے ہیں!): خاصے صغریٰ اور کبریٰ ملا کر یہ حضرات آپ کو بیان کر کے دے رہے ہوتے ہیں کہ آپ کو ''نصوصِ شریعت'' کو سمجھنا ہے تو کس ''منہج'' سے اور ان نصوص سے مسائل کا استنباط کرنا ہے تو کس ''طریقے'' سے![۱۹] یعنی نصوصِ شریعت سے ''استدلال'' کرنا اور کروانا ابھی باقی ہے، اور اِس

''استدلال'' کیلئے جو ''منہج'' درکار ہے اور جو کہ بنیاد ہے ایک **''صحیح استدلال''** کی، اُس بنیاد کا تعین کرنے کیلئے ''استدلال'' پہلے ہی ہو رہا ہوتا ہے! حالانکہ اِس کام کیلئے تو ابتداء صحابہؓ سے کئے بغیر چارہ ہی نہیں، آگے چاہے آپ مدرسۂ حدیث کے ''تقید'' کو اختیار کریں (اُس کے تمام تر ألــوان manifestations سمیت) یا مدرسۂ رأي کے ''توسع'' کو (اُس کے تمام تر ألوان سمیت)۔ مگر ابتداء کرنے کیلئے تو اصولِ صحابہؓ کو بنیاد مانے بغیر چارہ ہی نہیں(۱۶)۔ (ورنہ تو ''استدلال'' کے مبادی کو بھی ثابت کرنے کیلئے آپ کو ''استدلال'' ہی چاہیے اور ''استنباط'' کے معیارات کو بھی طے کرنے کیلئے ''استنباط'' ہی چاہئے، اور جو کہ درحقیقت ایک لطیفہ ہے، مگر اِس وقت ہو رہا ہے!)......

یہاں بھی اگر آپ فکری بحثوں میں پڑنے کی بجائے ایک ''نفسیاتی تجزیہ'' کرنا چاہیں تو اِس نبیؐ کے ''حـواریـون وأصحابؓ'' سے ایک استغناء، کہ 'کام اُن کے بغیر بھی چلتا ہے'...... یہاں پھوٹ پھوٹ کر بولتا ہے۔ (بلکہ یہ کہ: کام اُن کے بغیر ہی چلے تو صحیح ہوتا ہے! بلکہ یہ تاثر کہ: کام اُن ''حـواریـون وأصـحـابؓ'' کے بغیر تو بدرجۂ اتم چلتا ہے البتہ اِن 'عباقرہ' کے بغیر نہیں چلتا!)۔ ورنہ کوئی تو وجہ ہو کہ تلقی واستدلال کے مبادی میں اگر کہیں پر سلفِ امت کے ساتھ 'موافقت' نکل آئے تو وہاں پر بھی ''اصول اور معیارات'' کے نقطۂ ابتدا کے طور پر سلف کا ذکر نہ ہو! کیونکہ یہ حیثیت سلف کی ہے ہی نہیں کہ دین کے فہم وتلقی کی بابت امت کو درکار ''اصول'' و ''معیارات'' کیلئے وہ سرے سے کوئی ''حوالہ'' ٹھہریں! ورنہ.. سلف جہاں پر 'صحیح' ہیں چلئے وہاں پر ہی، کم از کم اُتنی سی عقیدت کے ساتھ، جتنی عقیدت کے ساتھ بیسویں صدی کے پچاس ساٹھ سال پرانے اپنے کسی امام یا بزرگ کے

حوالے دے لئے جاتے ہیں، ''سلف'' کے حوالے دے لئے جائیں! مگر ہم دیکھتے ہیں......اُن مقامات پر بھی جہاں سلف 'غلط' نہیں ہیں لہجوں کا **استغناء اور کِبر** صاف بول رہا ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں، سلف نے بھی ایک 'صحیح' بات کر دی ہے تو کیا ہے یہ بات تو ویسے ہی عقل سلیم میں آ جاتی ہے، اور آنی چاہیے تھی! البتہ اِس 'عقل سلیم' کا سارا ٹھیکہ اپنے ہی پاس رہتا ہے؛ سلف کہیں اِس پر پورا اتر جاتے ہیں تو کہیں بیچارے اِس پر پورا اترنے سے رہ جاتے ہیں! 'غلط' نکلیں، پھر تو ان کو چھوڑنا ہی چھوڑنا ہے، 'صحیح' نکلیں تو بھی یہ کوئی قابل ذکر بات تھوڑی ہے! یعنی، صحابہ وسلف کا ذکر ہونا ہی سرے سے کیا ضروری ہے[۱۷]، کونسا کام ہے جو ان کے بغیر رکا ہوا ہے!!؟

....

مختصر یہ کہ ''اَھواء'' ایک خطرناک اور بھیانک روٹ ہے اور ہزار رنگ میں آپ کے سامنے آتا ہے؛ یہ کوئی آج پہلی بار ایسا نہیں ہوا کہ ایک 'گہرے غور وخوض کے نتیجے میں' کسی عبقری نے امت کو 'سیدھا راستہ' منکشف کر کے دے دیا ہو؛ ساڑھے تیرہ سو سال سے یہاں ہزارہا لوگ اِس ذہنی وفکری حالت سے دوچار ہوتے رہے ہیں، البتہ ان سب لوگوں کا ایک مشترکہ وصف رسول اللہ ﷺ کی تیار کردہ کھیپ کو اِس قابل نہ جاننا رہا ہے کہ فہم دین کے اصول و معیارات خاص اُنؓ سے لئے جائیں؛ اور جو کہ **بغیاً بینھم** کی ایک بدترین صورت تھی۔ اِس سے بچنے کیلئے ہم جس چیز پر سلف کے یہاں صبح شام زور دیا جاتا دیکھتے ہیں وہ یہ کہ: **''پہلوں'' کا راستہ لازم پکڑ کر رکھا جائے**۔ بعد والوں کے ساتھ اَھواء نے کیا کیا کھیل کھیلے ہیں، اس کا اندازہ ایک نہایت مشکل کام ہے، بلکہ اِن کے راستوں پر وقت صرف کرنا ہی

اصولاً ایک فضول کام ہے۔ آپ کو یہاں صرف ایک کام کرنا ہے؛ پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ ''پہلوں کا راستہ'' پکڑ کر رکھئے اور زمانے میں آگے سے آگے بڑھتے جایئے، ان شاء اللہ آپ کبھی نہیں بھٹکیں گے، کیونکہ آپ کے ''پہلے'' وہ ہیں جو نبی ﷺ سے پڑھے ہیں اور جن کو رسول اللہ ﷺ واضح طور پر ایک ''راستے'' پر پہنچا کر گئے تھے۔ عبداللہ بن مسعودؓ عراق تشریف لائے، تو تلامذہ کو اکثر اُن سے یہ نصیحت سننے کو ملتی:

اتبعوا ولا تبتدعوا، فقد كفيتم۔

''پیروی کرو، خود کوئی طریقے مت نکالو، بس یہ سمجھ لو کہ تمہیں کفایت کر دی گئی ہے''۔

نیز ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ و دیگر بزرگانِ سلف کی یہ نصیحت:

من كان مستنا فليستنَّ بمن قد مات۔ أولئك أصحاب محمد ﷺ، كانوا خير هذه الأمة، أبرها قلوبا، وأعمقها علما، وأقلها تكلفاً، قوم اختارهم الله لصحبةِ نبيه ﷺ، ونَقلِ دينه، فتَشَبَّهُوا بأخلاقهم وطرائقهم، فهم أصحاب محمد، كانوا على الهدى المستقيم

''جس کو کسی کی راہ پکڑنی ہو اس کو چاہیے اُن ہستیوں کی راہ پکڑے جو گزر چکیں۔ وہ ہیں اصحابِ محمد ﷺ۔ امت میں برگزیدہ ترین ہستیاں، قلوب میں سب سے بڑھ کر نیک، علم میں سب سے گہرے، تکلف میں سب سے کم؛ بس یہ سمجھو کہ ایک ایسا گروہ جس کو اللہ نے چنا اپنے نبی ﷺ کی صحبت کیلئے، اور اُسؐ کے دین کو آگے منتقل کرنے کیلئے، پس اُنہی کی مشابہت کرو اخلاق میں بھی اور طریقوں میں بھی۔ وہی ہیں محمد ﷺ کے صحبتی۔ وہ سیدھی ہدایت پر ہی تھے۔''

۲) دوسری چیز جو سلف کے ہاں نہایت ضروری جانی جاتی...... وہ یہ کہ ''دلائل'' اور ''مسائل'' وغیرہ کو ہاتھ ڈالنے سے پہلے.. وہ لوگ، سنت کے ائمہ واساتذہ سے باقاعدہ ایک فیضِ صحبت لیتے۔ یہ نہ صرف اُن کیلئے ایک قلبی وروحانی تربیت کا درجہ رکھتا بلکہ ان کی سوچ اور فکر کے سانچوں کو بھی ایک خاص جہت دے دیتا، اور جو کہ عین وہ جہت ہوتی جو علم اور استدلال کے معاملہ میں اُن سے پہلوں کے یہاں پائی جاتی تھی...... سچ پوچھیں تو یہ بات منہجِ سلف میں سب سے پہلے ہے، اور باقی سب کچھ اِس کے بعد آتا ہے۔ ''تعلمنا الإيمان ثم تعلمنا القرآن ''(۱۸) کا یہ بھی ایک اہم حصہ ہے۔ اصل چیز قرآن ہی ہے اور ایمان بھی آدمی کو وہیں سے لینا ہے، مگر اُن لوگوں کے ہاتھوں جو قرآن کو روزِ اول سے سمجھتے اور پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں باقاعدہ ایک grooming کروا لینا بھی درکار ہوتا ہے۔ (ویسے ہر دبستان یہی کام کرتا ہے؛ اور یہ وہ پہلی چیز ہوتی ہے جو اُس سے لی جاتی ہے)۔ راہِ سنت میں تو یہ چیز حد سے بڑھ کر اہم و موثر substantial ہے؛ کیونکہ ''سنت'' ہے ہی ایک چلا ہوا اور پٹا ہوا راستہ۔ ایک تسلسل سے کٹ کر، جب آدمی کسی چیز کو دیکھنے اور سمجھنے لگتا ہے تو اس کا زاویۂ نگاہ ضرور اُن لوگوں سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتا ہے جو اُس تسلسل کا حصہ چلے آئے ہیں؛ جبکہ استدلالات واستنباطات کے اندر بڑے بڑے لطیف مقامات بھی ہوتے ہیں۔ نیز ''رائے'' بنانے کے پیچھے بے شمار موثرات کام کر رہے ہوتے ہیں؛ خصوصاً ''اصول'' اور ''معیارات'' وضع کرنے کے معاملہ میں۔

اُن اساتذہ سے جو ''پہلوں کی راہ'' پر ہوں اپنی فکری ساخت کروانا

اِس چیز کو نظر انداز کر دینا ایسا ہی ہے کہ ایک ڈاکٹر یا ایک جراح محض کتابوں

اور اپنے پڑھے ہوئے پر اعتماد کرتے ہوئے میدان میں اتر کھڑا ہو؛ حالانکہ علاج میں ایسے ایسے نازک مقامات آتے ہیں جن کیلئے ایک خاص درجے کی حذاقت ہی کام آتی ہے اور ایک چھوٹا سا ہاتھ ہولا یا ہاتھ بھاری رکھنے سے مریض کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی کو جس درجہ کی طبابت کرنی ہو اُسی درجہ کے طبیبوں اور جراحوں کے زیر نگاہ ایک طویل عرصہ گزار چکا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اُس کی اِس اہلیت پر اپنی تسلی بھی ظاہر کر چکے ہوں۔

اوپر کی یہ مثال واضح ہو.. تو......علومِ شریعت کے حوالے سے یہاں پر ایک خصوصی شرط یہ ہوگی کہ آدمی کے وہ اساتذہ اور مربی **پہلوں کی راہ پر ہوں**، کیونکہ علومِ شریعت و نبوت میں کوئی ارتقاء نہیں ہے[۱۹]۔

لہٰذا یہ بات بھی نہایت اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ: **اصحابِ شریعت کا شریعت کی چیزوں کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا داخلی طور پر جو ایک طریقہ پیچھے سے چلا آیا ہے، اور مقبول اور معروف رہا ہے، پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ آدمی اُسی کو اختیار کرے اور اُسی کی تربیت لے۔** یہ تو خیر سوچ بھی نہ کہ یہ راستہ خود اس کو بنا کر دینا ہے؛ البتہ اُس تسلسل کو آگے بڑھانے کی اگر وہ اپنے اندر طاقت اور مقدرت پاتا ہو تو بھی سب سے پہلے وہ یہ کرے کہ پہلے سے چلے آنے والے اُس تسلسل کا حصہ بنے (**والذین جاؤوا من بعدھم**)۔ اور اِس بات کے جہاں

نیز اہل زیغ سے دور رہنا

اور کئی ایک تقاضے ہیں وہاں یہ بھی باقاعدہ ایک تقاضا ہے کہ آدمی پہلوں سے صرف اصول اور مبادی ہی نہ لے بلکہ **اپنے قلب وفکر ونظر کیلئے پہلوں سے وہ باقاعدہ ایک جہت بھی لے، اور اس کیلئے اُن سے تربیت بھی حاصل کرے۔** یہاں تک کہ کثیر اہل علم نے اِس

بات پر بھی بے حد وحساب زور دیا کہ وہ **اہل زیغ سے دوری اختیار کر کے رکھے**؛ **کیونکہ "قلوب" ایک کمزور چیز ہیں، اثر لے لیتے ہیں۔**

....

یہ دونوں باتیں (پہلوں کے راستے کی پابندی + اِس راستے پر پائے جانے والے اساتذہ سے اپنی فکری ساخت کروانا، نیز اہل زیغ سے دور رہنا) ہو جائیں تو بھی کوئی ضمانت نہیں کہ "اَھواء" سے تحفظ حاصل کرلیا گیا ہے؛ کیونکہ "اَھواء" ہے ہی ایک ایسی ڈر کر رہنے کی چیز، اوراس کیلئے تو بہر حال تقویٰ، استقامت، فکر آخرت، زہد فی الدنیا، تعظیمِ خداوندی، سلاطین و اصحابِ نفوذ وثروت سے استغناء، حق کی نصرت اور اقامت کیلئے قربانی اور فدائیت، نبی ﷺ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قلبی و ذہنی لگاؤ اور کثرتِ درُود، پاسبانانِ حق ائمۂ سنت سے ایک علمی و جذباتی و تاریخی وابستگی، خدا سے توفیق ملنے کیلئے مسلسل دعا وفریاد والتجاء.. سب کچھ درکار رہتا ہے......**لیکن کسی کے حق میں اگر یہ دو بنیادی کام ہی پورے ہونے سے ابھی رہ گئے ہوں اور وہ چل پڑا ہو امت کو اصول اور فروع دینے کی راہ پر**، اُس کا تو خدا ہی حافظ ہے، اور اُس سے بڑھ کر اُن لوگوں کا جو اُس سے یہ اصول اور فروع لینے چل پڑے ہوں!

☆☆☆☆☆

پس ہر علم کے اندر ہی کچھ خاص معیارات اور کچھ خاص رجال کا پایا جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ اُس علم کو اُس کے مسلمہ معیارات اور اُس کے مسلمہ رجال سے الگ کر کے دیکھنے پر بضد ہونا، کسی وقت اناڑی پن ہو سکتا ہے تو کسی وقت واردات کر جانے کا کوئی پیش خیمہ۔

لہٰذا یہ بات واضح رہے، ہر علم کے پڑھنے پڑھانے اور تعبیر و تفسیر و تطبیق کرنے کے حوالے سے:

۱) اُس علم کے **کچھ خاص معیارات** بھی ہوں گے اور اُس وقت سے ہوں گے جب سے وہ علم پایا جاتا ہے [۲۰]، (اُس میں کچھ ڈویلپمنٹ بھی ہوگی تو وہ اس کے اُس خاص تسلسل کا حصہ بن کر ہی ہوگی)..

۲) نیز یہ کہ اُس علم کے **کچھ خاص رجال** بھی ہوں گے......

یعنی معیارات بھی اور رجال بھی۔ اِن ہر دو کے بغیر آپ ہمیں دنیا کا کوئی علم اور کوئی سائنس لا کر دکھا دیں۔

جس کو بھی ہمیں مارنا ہے، نہایت ضروری ہے کہ پہلے وہ یہ دو چیزیں ہمارے ہاتھ سے رکھوا لے: علم شریعت کے سلسلہ میں چودہ سو سال سے چلتے چلے آنے والے ہمارے معیارات اور رجال۔ پھر چاہے جیسے مرضی وہ ہم پر کسریں نکالے؛ اور تب یقیناً اُس کو یہ حق بھی ہوگا۔ اِدھر ہمارا بھی اگر مار کھانے کا ارادہ ہو تو ضروری ہے کہ یہ دو چیزیں ہی پہلے ہم اپنے ہاتھ سے دے دیں!

پس ایک شرعی علم میں مانے ہوئے معیارات کو پیچھے کر کے، یا اُن کو سرے سے نظرانداز کر کے، یا یہ صغریٰ باندھ کر کہ 'فقہاء کو یہ غلطی لگی ہے'،...... خاص اپنے معیارات لا کر دھر دینا.. اور امت کو صلائے عام دینا کہ پچھلی چیزوں کو بھول کر اب وہ اِن معیارات کو قبول کرلے... علاوہ ازیں، اس علم (شریعت) کے مانے تانے رجال کو ''غیر موجود'' کے حکم میں رکھتے ہوئے اور ایک باقاعدہ ایسا خلا پیدا کرتے ہوئے کہ چودہ صدیاں قریباً سائیں سائیں کرتی ہوئی نظر آئیں.. اور پھر اس مہیب خلا کو پر کرنے کیلئے جہاں کہیں 'حوالوں' کی کوئی فارمیلٹی پوری کرنے کی ضرورت پڑ

ہی جائے وہاں اپنے ہی کسی ایک آدھ مردہ کو کافی جاننا... اور یہ باور کرانا کہ اِس راہ سے امت کو ''معیارات'' بھی دے دیے گئے ہیں اور ''رجال'' بھی، اصول بھی اور فتاویٰ بھی، استدلال و استنباط کے لئے مطلوب فارمیٹ بھی اور مضامین بھی ...... اِس امت کے ساتھ ایک مذاق ہے اور اس کی شریعت کے ساتھ ایک کھلواڑ.. یہ بات ہر دور میں ہی صادق آئے گی لیکن آج جب آپ نظر اٹھا کر ایک خاص ''جہانی عمل'' 'an alarming global development' کو بھی حرکت میں دیکھتے ہیں، تو.. یہ اِس امت کے ساتھ ایک بہت بڑی واردات بھی ہے، خاص ایسے وقت پہ جب اِس گھر میں ہر طرف سے نقب ہی لگ رہے ہیں۔

حواشی

(حاشیہ ۱، ۲)

اشکال: علوم کی مروجہ تقسیم

علوم کی مروجہ تقسیم کے حوالے سے چند ضروری امور واضح نہ کئے جائیں تو ''دین'' کے فہم اور حصول سے متعلق کچھ بنیادی اشیاء تشنہ رہ جائیں گی؛ اور ''دین و دنیا کی تقسیم'' کے حوالے سے افراط و تفریط کے بعض رویے بھی ناقابلِ فہم رہیں گے:

اول الذکر کو ہمارے معاشرے میں ''مذہبی علوم'' theology سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ثانی الذکر کو ''سماجی علوم'' social sciences سے، جو کہ اسلام کے لحاظ سے کوئی بہت جامع یا مانع تقسیم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو سماجی علوم ''شریعت'' کے دائرے سے باہر ہیں اور نہ شرعی علوم ''سماج'' سے غیر متعلقہ۔ پھر علم اور آگہی کا ایک شعبہ ''طبیعیات'' physical sciences بھی کہلاتا ہے اور وہ بھی ''دین'' سے الگ تھلگ نہیں۔ البتہ اِس موضوع پر پائی جانے

والے ایک افراط اور ایک تفریط نے معاملے کو کچھ الجھا بھی رکھا ہے؛ اور جس کا ازالہ ضروری ہے۔

اہل سنت علمائے عصر نے ایک طرف ہمیں حسی (حواس خمسہ پہ سہارا کرنے اور ان سے نتائج کشید کرنے والے علوم) وغیبی (وحی پر سہارا کرنے والے) علوم کی تقسیم کر کے دی ہے اور دوسری جانب توقیفی (جن امور میں آدمی کو خود اپنی اختراع سے کچھ نہیں کرنا، مانند عقائد وعبادات) وتوفیقی (جن امور کے اندر آدمی اشیاء کے اکتشاف اور اختراع میں خدا سے توفیق پاتا ہے، مانند مالی وسیاسی وسماجی معاملات) کے مابین تقسیم کر کے دی ہے۔ اِس لحاظ سے:

حسی علوم

۱) ایک قسم ''حسی علوم'' کی بنتی ہے جن کو آپ فزیکل سائنسز بھی کہتے ہیں۔ اِن میں ھویٰ کو بالعموم کوئی دخل نہیں لہٰذا یہ شعبہ خالصتاً انسانی عقل و داعیہ پر چھوڑ دیا گیا ہے (اپنے اکتشاف و اختراع کے معاملہ میں نہ کہ اپنے محرکات motives یا اپنے اغراض وغایات objectives کے معاملہ میں؛ کیونکہ یہ محرکات اور غایات تو کسی طبعی علم کو ''دین'' ہی دے سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ ''دین'' باطل ہو یا حق)۔

خالص شرعی علوم

۲) دوسری قسم خالص شرعی علوم کی بنتی ہے؛ مثل عقائد وعبادات، اور جو کہ اپنے تقرر و اکتشاف کے معاملہ میں خالص وحی پر سہارا کرتے ہیں، نہ کسی کے وہم وگمان (اور فلسفے) پر، نہ کشف پر، اور نہ کسی کے اندازے اور ڈھکوسلے پر، اور نہ کسی کے آباؤ اجداد کی راہ پر اور نہ کسی کو کوئی بات اپنے آپ میں مستحسن نظر آنے پر۔ اِن علوم میں ھـویٰ سو فیصد دخل انداز ہوتی ہے لہٰذا یہ علوم (اپنے اکتشاف یا تقرر کے معاملہ میں) ''عقل''

حواشی

پر ذرہ بھر موقوف نہیں رکھے جاتے۔ ہر چیز خدا کے اپنے ہی جناب سے طے کر کے دی جاتی ہے اور اس کی خبر اُس کے کسی بھیجے ہوئے رسول پر اتار دی جاتی ہے؛ جبکہ رسول کے جملہ اعمال وتصرفات اُس وحی کی خبر دینے ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔عقول کا کام البتہ اُس وحی کے فہم اور استیعاب سے متعلق ہے، اور جو کہ ایک نہایت وسیع میدان ہے۔

اِس ''توقیف'' کے باوجود البتہ اہل سنت کے نزدیک (فکر اشاعرہ کے برعکس) تحسین اور تقبیح (اشیاء کے حسن اور قبح کا تعین ہونا) ''شرعی'' کے ساتھ ساتھ ''عقلی'' بھی ہوتا ہے۔یعنی ایک بہت بڑے دائرے میں شرع جو چیز بتاتی ہے، انسان کی عقل بھی شہادت دیتی چلی جاتی ہے کہ 'گویا یہ بھی میرے دل میں تھا'۔ (نبوتوں کا اعجاز)۔البتہ عقل مستقل بالذات حیثیت میں یہاں پر مرجع نہیں مانی جاتی۔

یہاں پر مکمل ''توقیف'' ہے۔یعنی اصل یہ ہے کہ ہر بات اور ہر چیز ممنوع ہے جب تک کہ وہ شرع کی اپنی ہی جانب سے نہ بتا دی جائے۔ اِس میدان میں.. وہ چیز جو شرع کی جانب سے بتائی نہیں گئی، اگر خاص اپنے عقل اور استحسان سے چلا دی جاتی ہے تو اُس کو ''بدعت'' یا ''ابتداع'' کہا جاتا ہے، اور جو کہ بربادی اور ہلاکت ہے۔''بدعت'' کی سب سے سنگین صورت وہ ہے جو ''عقائد'' میں ہو (یہاں تک کہ یہی چیز علمائے سلف کے یہاں غالب استعمال کے طور پر مشہور ہو گئی ہے؛ چنانچہ لفظ ''بدعات'' کا استعمال عموماً اُن بدعتی ٹولوں پر ہی ہوتا ہے جو اسلام میں کسی نئے عقیدے یا کسی نرالے تصور کا اجراء کرتے ہیں)۔اس سے کم سنگین درجہ میں وہ بدعت ہوتی ہے جو ''عبادات'' کے اندر ہو۔

علمائے سلف کے استعمال کی رو سے وہ شخص جو عین اُنہی عقائد وتصورات وعبادات پر رہتا ہے جنہیں امت نے اپنے نبی سے لیا اور سمجھا ہوتا ہے، اُس شخص کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ ''سنت'' پر ہے۔ لفظ ''سنت'' کا سب سے زیادہ استعمال علمائے سلف کے یہاں اِسی معنیٰ پر ہوا ہے، یعنی پورا دین اپنی اُس اصل ہیئت کے ساتھ جو بعد کی سب تبدیلیوں، سب تحریفات، سب اختراعات اور انسانی اپج کے جملہ مظاہر سے پاک اور صاف ہو اور عین اُس حالت میں ہو جس حالت میں صحابہؓ نے اس کو اپنے نبیؐ سے لے کر اپنے مابعد نسلوں کو منتقل کیا۔ خود عرباض بن ساریہؓ والی وہ حدیث جو آنحضور ﷺ کی ایک طرح کی الوداعی تقریر ہے (فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِی وَسُنَّةِ الخلفاء الراشدین المهديين، وعضوا عليها بالنواجذ، وإياكم ومحدثات الأمور، فإن كل محدثةٍ بدعةٌ، وكل بدعةٍ ضلالةٌ – { رواه احمد، وأبو داود، والترمذی، وابن ماجة، والحاکم، والدارمی، وابن حبان، وصححه الکثیرون من المحدثين، واللفظ لأحمد}) اپنے پورے سیاق کے ساتھ واضح ہے کہ یہاں زبانِ رسالت پر ''سنت'' کا یہی خاص استعمال وارد ہوا ہے، اور جو کہ بعد ازاں علمائے عقیدہ (وعام مصلحین وداعیوں) کے ہاں زبان زدِ عام ہو گیا۔ (گو یہ درست ہے کہ کچھ خاص فنون مانند علمِ حدیث یا علمِ فقہ یا علمِ اصول فقہ کے اندر لفظ ''سنت'' کا استعمال اپنے اِس عمومی مفہوم کی نسبت اخص ہے، مگر لفظ ''سنت'' کا یہ خاص استعمال علم کے اُسی خاص شعبے کے اندر ہوتا ہے، نہ کہ سنت کا عمومی مفہوم)۔

تاہم واضح رہے، یہ چیز جس کیلئے ہم نے ''خالص شرعی علوم'' کا لفظ استعمال کیا ہے اور جس میں بالعموم ''عقائد'' اور ''عبادات'' کا ذکر ہوتا ہے،

حواشی

''شریعت'' البتہ اِن کے اندر محصور نہیں ہے۔ یہ لفظ ہماری اِس عبارت میں دراصل شریعت کے اُن خاص جوانب پر دلالت کی غرض سے استعمال ہوا ہے جن میں مکمل توقیف پائی جاتی ہے۔ جبکہ ''شریعت'' اور ''دین'' کا دائرہ اِس سے وسیع تر ہے۔ ''طبعی علوم'' physical sciences بھی اپنے بواعث اور غایات کے حوالہ سے ''دین'' میں آ جاتے ہیں۔ جبکہ سماجی علوم social sciences تو ہیں ہی ''دین''۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سماجی علوم کے اندر توقیف نہیں بلکہ توفیق ہوتی ہے (اور جس کو ہم اگلے پوائنٹ میں بیان کریں گے)۔ البتہ یہاں یہ ہوا کہ اُن چند فروق differences کے باعث جو شریعت کے اِن ہر دو علوم کے مابین پائے جاتے ہیں کچھ لوگوں نے تو محض اپنی جہالت اور استشراقی تربیت کے سبب سے، اور کچھ زنادقہ نے ایک خاص خبثِ باطن سے کام لیتے ہوئے، ''شریعت'' اور ''دین'' کو ''روحانیات'' وغیرہ ایسے عنوان کے تحت اول الذکر (یعنی ''عقائد وعبادات'' وغیرہ) ہی میں محصور کر دیا۔ یوں سماجی علوم کو بھی قریب قریب طبعی علوم ہی کی طرح ''مکمل طور پر انسانی عقول پر چھوڑ دی جانے والی چیز'' بنا کر پیش کرنے لگے! اُدھر ''ہیومن ازم'' ایسے کفر کا دور دورہ تھا جو کہ سماجیات کے اندر انسانی عقل کے مکمل طور پر خودکفیل وخودمختار ہونے کا اپنا ایک پورا نظریہ اور عقیدہ قائم کر کے ساری دنیا کو فتح کرنے اور عین اِسی کفر میں غرق کرا دینے کی ابلیسی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی أھــــــواء کا وہ بدترین درجہ جو خدا کی شریعتوں اور رسولوں کے ساتھ صاف تصادم کی راہ پر ہوتا ہے، آج اپنے عمل وسرگرمی کیلئے خاص اِس میدان ہی کو منتخب کر کے رہا ہے جس کو کہ ہمارے بےعلم طبقے اور ہمارے یہاں کے زنادقہ ویسے ہی شریعت کے دائرہ سے باہر گردانتے ہیں!

۳) تیسری قسم میں وہ چیز آتی ہے جس کو ہم ''سماجی علوم'' کہتے ہیں۔ اِس کے اندر أھواء کو بھی ایک دخل ہے اور انسانی عقل و تدبیر و اکتشاف و اختراع کو بھی اِس میں ایک مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ مثل معیشت، و سیاست وحکومت وغیرہ۔ لہٰذا اِس میدان میں شریعت بیک وقت أھواء کی جڑ بھی کاٹتی ہے اور عقول کو عمل پر بھی اکساتی ہے۔ یوں یہ شرعی علوم کا ایک نہایت دلچسپ میدان بن کر سامنے آتا ہے، گو اِس پر ہمارے یہاں کام فی الوقت نہ ہونے کے برابر ہے۔

سماجی علوم

(اِس وضاحت کے بعد، امید ہے واضح ہو گیا ہو گا کہ پچھلی صنف کو ہم نے ''خالص شرعی علوم'' کیوں کہا ہے۔ کیونکہ یہ سماجی علوم بھی درحقیقت ''شرعی علوم'' ہی ہیں مگر اِن میں انسانی تحقیق و اختراع کا بھی شریعت آپ ہی ایک اچھا خاصا اعتبار کرتی ہے۔ جبکہ پچھلی صنف کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔)

پس اِس میدان میں شریعت ایک تو یہ کرتی ہے کہ کچھ بنیادی اصول و احکامات کی صورت میں انسانی عقل کو اپنے عمل و سرگرمی کیلئے ایک فریم ورک دیتی ہے، جس کے اندر رہتے ہوئے اُس کو اپنی صلاحیتوں کے بہترین جوہر دکھانا ہوتے ہیں، نیز شریعت کے دیے ہوئے اِس فریم کے اندر رہتے ہوئے اپنی ضرورت کے ''نظام'' کی عملی و واقعاتی تفصیلات خود طے کرنا ہوتی ہیں اور اپنی اِس آزادی کو ایک نہایت صالح معنیٰ کے اندر استعمال کرنا ہوتا ہے (اور جو کہ اِس کی خلافتِ ارضی کا باقاعدہ ایک حصہ ہے)۔ دوسرا کام اِس شعبہ میں شریعت یہ کرتی ہے کہ: (عمومی اصول basics اور بنیادی احکامات commandments دینے کے بعد)، شریعت اپنی ''ممنوع کردہ اشیاء'' کو تو انسان پر نہایت معین کر کے واضح کر دیتی ہے البتہ اپنی ''مباح کردہ اشیاء'' کا

حواشی

دائرہ ویسے ہی پوری طرح کھلا رکھتی ہے؛ یعنی اِس شعبہ کے اندر حرام وہ ہے جسے شریعت معین طور پر بتا دے کہ حرام ہے (اور جو کہ کچھ محدود اشیاء ہیں)۔ باقی، اس کے سوا سب کچھ مباح ہے (اور جو کہ ایک وسیع دائرہ ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اصول ہمیں یہ قاعدہ بتلاتے ہیں کہ: الأصل فی العبادات التحریم، والأصل فی المعاملات الإباحة یعنی ''عبادات کے اندر اصل یہ ہے کہ ہر چیز حرام ہے جب تک کہ شریعت آ کر اُس کو حلال اور مشروع نہ ٹھہرا دے۔ جبکہ معاملات کے اندر اصل یہ ہے کہ ہر چیز مباح اور مشروع ہے جب تک کہ شریعت آ کر اُس کو حرام نہ ٹھہرا دے''۔ علاوہ ازیں، معاملات کے اندر علمائے مقاصد یہ قاعدہ دیتے ہیں (اور ظاہر ہے یہ قاعدہ عبادات پر لاگو نہیں ہوتا) کہ: العبرة بالمعانی لا بالأسماء والمبانی یعنی ''اصل اعتبار کسی چیز کے مضمرات اور معانی کا ہے نہ کہ خالی عبارات کا اور نہ محض ہیئتوں کا''۔

چنانچہ یہ ضرور ہے کہ ''معاملات'' (جو کہ عموماً ''سماجی علوم'' کا موضوع ہے) کے اندر شریعت کے مقتضا کا تعین کرنے میں ''عبادات'' کی نسبت قدرے مختلف اپروچ اختیار کی جاتی ہے (اور بلا شبہ یہ فرق یہاں کے بعض سطحی و کوتاہ نظر دینی طبقوں پر بڑی حد تک روپوش ہے)......مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض اِس اِتنے سے فرق کی بنا پر ہم اپنی شریعت کے ساتھ تاریخ کی وہ سب سے بڑی واردات ہو جانے دیں جو سماجی شعبوں کے اندر انسان کو خدائی کے مرتبے پر فائز کرا دینا چاہتی ہے، اور ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مسئلہ کوئی ''عبادات'' کا تھوڑی ہی جو ہم اِس پر ''طاغوت'' ہونے کی فردِ جرم لگائیں!

اور جہاں تک ''سنت'' کی بات ہے تو بلا شبہ اس کا دائرہ ''معاملات'' (سماجیات) کو بھی محیط ہے۔ شرائعِ دین کے بیان پر مشتمل حدیث یا فقہ کی کوئی

کتاب کھول لیں، ''عقائد'' و ''عبادات'' کے فوراً بعد آپ ''بیوع'' و ''معاملات'' کے ابواب ہی کھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہاں پر ''سنت'' اور ''بدعت'' کا تعین کرنے کا طریقہ ''عبادات'' میں اختیار کئے جانے والے طریقے کی نسبت مختلف ہے؛ جس طرح ''عبادات'' کے اندر بغیر دلیل کسی بات کو ایجاد کرنا ''بدعت'' بنا تھا، اسی طرح ''معاملات'' میں بغیر دلیل کسی چیز کو ممنوع و مذموم ٹھہرانا ''بدعت'' بنے گا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے سلف کے ہاں صوفیہ کے بعض ایسے طبقوں کو ''بدعت'' سے منسوب کیا گیا ہے جو مباحات پر قدغنیں لگانے کو تقرب خداوندی کا ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔ دین کو اُس کی اصل ہیئت پر باقی رکھنا ''سنت'' کی روح ہے۔

بنا بریں، ''سنت'' وہ فریم ہے ___ میکرو سطح پر بھی اور مائکرو سطح پر بھی ___ جس میں اسلام کے وہ جملہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، احوال اور اصولِ معاشرت ودولت وغیرہ آتے ہیں، جو اِس امت کو اس کے نبی سے ملے ہیں۔ ''سنت'' کی بار بار تاکیدیں جو کہ قرونِ سلف میں کسی گونج کی طرح سنائی دیتی ہیں، اور خود احادیث میں بے حد وحساب پائی جاتی ہیں، اِسی معنی میں ہیں اور اِسی معنی میں ہوسکتی ہیں، نہ کہ اسلام کے چند گنے چنے اعمال کے معنی میں۔

(حاشیہ ۳)

سماجی علوم کے اندر اگر ''اھواء'' نہیں!

ہمارے اپنے زمانے (بیسویں صدی) میں کرۂ ارض پر پائے جانے دو دیوہیکل کیمپ کوئی صدی بھر برسر جنگ رہتے ہیں بلکہ پوری دنیا کو اپنی دھینگامشتی کا اکھاڑا بنا کر اور مسلسل جنگ کے دھانے پہ کھڑا کر کے رکھتے ہیں؛ ایک طرف کیپٹل ازم کا بلاک، دوسری

حواشی

طرف سوشل ازم کا بلاک۔کوئی ہمیں بتلائے، اس پورے فسانے کا عنوان کیا رہا تھا؟ بے شک اس کے پیچھے مفادات کی ایک لمبی کہانی ہو (ویسے ارضی مفادات کی کہانی کہاں نہیں ہوتی!)، مگر اِس جنگ کا سامنے کا عنوان کیا یہی نہ تھا کہ ''دولت'' کے مکاسب کیا اور کیونکر ہوں اور ''دولت'' کی تقسیم کس طرح ہو؟ یہ چیزیں اگر کشش ثقل اور جیالوجیکل حقیقتوں کی طرح محض ''عقول'' کی مدد سے طے کر لی جانے والی ہوتیں، تو اِن دو کیمپوں میں اِس طرح کا ایک اختلافِ لامتناہی ہو کس طرح سکتا تھا؟ بنی آدم کے پاس آخر ''عقول'' ہیں تو سہی! اور کوئی پوچھے، 'war of ideas' کی یہ جو اصطلاح ہے اس کی نوبت ہی کیوں آئی ہے (اور جوکہ ویسے ہمیشہ سے ہے)؟ معاملہ یہی ہے کہ اِن امور میں ''أھواء'' کو دخل ہے اور ان کا فیصلہ شریعت ہی کر سکتی ہے۔ **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي** (الشوریٰ:١٠)

(حاشیہ ٤)

اصل امتحان: اتباع و اھتداء

یوں معاملہ سیدھا سیدھا ''ایمان اور کفر'' اور ''اتباع اور ابتداع'' کا ہو جاتا ہے اور باقی بہت سی چیزیں (جو طرفین میں بحث و جدال کا موضوع بنتی ہیں) اپنے اصل کے اعتبار سے بیچ سے نکل جاتی ہیں۔ خدا نے کسی کو ''ایمان'' اور ''اتباع'' سے بہرہ یاب کرنا ہوتا ہے تو اُس کو انبیاء بھی نظر آنے لگتے ہیں اور انبیاء کے ''حواریون و اصحاب'' بھی؛ اور وہ اُن کا دامن جا پکڑتا ہے۔ البتہ جس کو محروم رکھنا ہوتا ہے، (اور جس کی وجہ اُس شخص کی اپنی ہی پیدا کردہ ہوگی، اور جوکہ عین وہاں پر نہیں تو کہیں 'پیچھے' پائی گئی ہوگی)، تو اُس کو یا تو انبیاء نظر نہیں

آتے (اور جو کہ ہدایت سے محرومی کی سب سے آشوب ناک صورت ہے) اور یا انبیاء کے "حواریوں و اصحاب" (**صراط الذین أنعمتَ علیھم**) نظر نہیں آتے، اور یا دھندلے ہو جاتے ہیں اور اُسی بقدر اُس کی وابستگی اُن کے ساتھ کمزور یا معدوم ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اِس قافلے سے اکیلا ہوتا چلا جاتا ہے۔

پس ہدایت اور غوایت کی اصل کہانی بس اتنی ہے؛ باقی سب "جدال" اور "امورِ خلاف" کسی موضوع پر جتنے بھی اہم ہوا کریں، اپنے اِس اَصل کے اعتبار سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ فاللّٰھم ألھِمْنا رُشدنا وأعذنا من شرورِ أنفسنا۔

عقول کو اَھواء سے علیحدہ کرنا... اِس سونے کو اِس میں گڈمڈ کھوٹ سے جدا کر کے، حقیقی انسانی منفعت کے قابل بنانا، اور یوں زمین پر ایک صالح حیات کی پرورش کرنا.. صرف اور صرف "شرائع" کے بس کی بات ہے۔

شرائع.. اپنے اُس اصل ٹھیٹ منہج اور پیکیج کے ساتھ جو کسی بھی زمانے کے فکری رجحانات سے اثر نہ لینے والا ہو؛ اور جو شرائع کے نزول کے وقت ہی زمین پر اپنایا گیا تھا، بلکہ جس کی تاسیس ہی خود صاحب شریعت کے ہاتھوں ہوئی تھی اور ایک بڑی خلقت کو اُس منہج پر صاحب نبوت کے اپنے ہی ہاتھوں تربیت بھی ملی تھی اور سند توثیق بھی۔

آج بھی دنیا میں war of ideas کی بحثیں ہیں، یا مسائل جہانی کے حل کی، یا سماجیات ایسے بظاہر 'غیر مذہبی' میدان میں انسان کو راہنمائی دینے کی، یا امن عالم کے کسی 'صحیح فارمولہ' کی دریافت کی...... سب عقدے بظاہر سادہ اور محض "عقول" کی مدد سے حل ہو جانے والے ہیں مگر ایک صاحبِ

بصیرت بچشم سر دیکھتا ہے کہ 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'۔ بات وہی ہے: ہدایت اور غوایت کی کہانی دراصل اور ہے۔ ''اَھواء'' انسان کا ایک حقیقی مسئلہ ہیں اور زمین کو فساد سے بھر دینے کی یقینی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ''أھواء'' کی یہ پیچیدہ فطرت ہی ہے کہ ''اصلاح'' کا زعم بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ (**وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لاَ تُفْسِدُواْ فِي الأَرْضِ قَالُواْ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ أَلا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَـكِن لاَّ يَشْعُرُونَ**)۔ انسان کے اندر سے ''اِھتداء'' اور ''اِتباع'' کا مادہ برآمد کرانے کیلئے اِس دنیا کا نقشہ بظاہر سادہ مگر درحقیقت لاینحل رکھا گیا ہے جب تک کہ (**فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى**) والی صورت اپنے پورے ایک پیکیج کے ساتھ اختیار نہ کر لی گئی ہو۔ پس یہ مسئلہ مجرد ذہانت کا نہیں بلکہ ایمان اور اتباع کا بنا دیا گیا ہے (جس کی اصل بنیاد قلب کی استقامت ہے)؛ کہ انبیاء اور اُن کے ساتھ پائے جانے والے صادقین کے ساتھ جا شامل ہونے کے سوا آدمی کہیں پر اور کسی راہ میں کوئی خیر نہ دیکھے، اگرچہ کہیں پر ڈھیروں حسن نیت اور بھلائی کا جذبہ کیوں نہ پائے۔

(حاشیہ ٥)

دلوں کا بگاڑ... کسی حدیث کو تو نہیں ٹھکرایا تھا؟

امام احمد ''فتنہ'' سے ڈراتے ہوئے:

قال الإمام أحمد فی روایة الفضل بن زیاد: نظرت فی المصحف فوجدت طاعة الرسول صلى الله علیه وسلم فی ثلاثة وثلاثین موضعا، ثم جعل یتلو **فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ** ..الآیة، وجعل یکررها ویقول: وما الفتنة؟

الشـرك۔ لعله إذا رد بعض قوله أن يقع فی قلبه شیءٌ من الزيغ فيزيغ قلبه فيهلكه۔

''امام احمد کہتے ہیں، بروایت فضل بن زیاد:

میں نے مصحف قرآنی میں نگاہ دوڑائی تو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا ذکر ۳۳ مقامات پر پایا۔ پھر امام احمد یہ آیت پڑھنے لگے: {فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ ''رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ وہ کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائیں (آیت کے آخر تک) } تب امام احمد اسی آیت کو دہراتے جاتے اور کہتے جاتے: اور فتنہ کیا ہے؟ شرک۔ مبادا کہ جب وہ نبیؐ کی بات کے کسی حصہ کو رد کر بیٹھے تو اُس کے دل میں ایک ٹیڑھ واقع ہو جائے، تب اُس کا دل ہی ٹیڑھا ہو جائے اور یہ چیز اُسے ہلاک کروا دے''

(**بحوالہ:** الصارم المسلول ص: ٥٥، فصل مواضع الطاعة المأمورة للنبی صلی الله عليه و سلم فی القرآن۔ مطبعة دار المعارف حيدرآباد)

(حاشیہ ٦)

دلوں کا الٹا دیا جانا

تُعـرَض الفتنُ على القلوبِ كعرض الحصير عودا عودا، فـأيُّ قـلـبٍ أشربها نُكتت فيه نكتةٌ سوداء، وأيُّ قلبٍ أنكرها نُـكتت فيه نكتةٌ بيضاء، حتىٰ تعودَ القلوبُ علىٰ قلبين: علىٰ أبيضَ مثلِ الـصـفـا، فـلا تـضره فتنةٌ ما دامت السماواتُ والأرضُ، والآخرُ أسود مـرباداً كالكُوز، مجخياً لا يعرف معروفا ولا ينكر منكرا، إلا ما أُشرِبَ مِن هواهُ.

(**صحیح مسلم عن حذیفہ رضی اللہ عنہ:** كتاب الإيمان، باب بدأ الإسلام غريباً وسيعود غريباً)

''قلوب کا فتنوں کی زد میں آنا اس طرح ہے جس طرح کھجور کی چٹائی ایک

حواشی

ایک تنکا کر کے بنی جائے۔ جو دل فتنے کو جذب کر جائے اس میں ایک سیاہ نشان لگ جاتا ہے۔ جو دل فتنے کو پاس نہ آنے دے اس پر ایک سفید نشان لگ جاتا ہے۔ ہوتے ہوتے قلوب کا معاملہ دوطرح کا ہو رہتا ہے: یا تو ایک نہایت سفید کورا دل جیسے کوئی چٹیل چٹان ہو، کہ جس کا رہتی دنیا تک کوئی فتنہ کچھ نہ بگاڑ سکے' اور یا پھر ایک بالکل کالا سیاہ دل، اس کوزے کی طرح جو الٹا کر دھرا گیا ہو، نہ معروف اس کو معروف لگے اور نہ منکر اسے منکر لگے، سوائے انہی اھواء وافکار کے جو اس نے جذب کر رکھے ہوں۔

(حاشیہ ۷)

خوارج کی حالت

سیخرج بعدی من أمتی قومٌ یقرء ون القرآن، لا یجاوز حلاقیمهم، یخرجون من الدین کما یخرج السهم من الرمیة۔

(صحیح مسلم، عن أبی ذر، کتاب الزکاة، باب الخوارج شر الخلق والخلیقة)

میرے بعد میری امت کے اندر ایسے لوگ نکلیں گے جو قرآن بہت پڑھیں گے، مگر وہ ان کے حلقوں سے آگے نہ جائے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکلیں گے جیسے تیر ہدف سے نکلتا ہے۔

جیسا کہ کثیر علمائے سنت نے بیان کیا: خوارج اِس امت میں ظاہر ہونے والی وہ پہلی فکری اپروچ تھی جو صحابہؓ کی راہ سے ہٹ کر دین کی تعبیر وتفسیر کرتی تھی (یعنی اسلام میں پہلی بدعت)، باوجود اس کے کہ نیک جذبہ کی کمی نہ رکھتی تھی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ صحابہؓ نے ان سے قتال میں پہل نہیں کی بلکہ جواباً اُن سے قتال کیا۔ (''فاشزم'' اور ''فکری تشدد'' ہمارے سلف کی سنت نہیں)۔ البتہ صحابہؓ کا ان کو گمراہ اور منحرف سمجھنا ایک معلوم امر ہے، محض اِن کے قتال کے باعث نہیں بلکہ ان کی اُس فکری اُپج کے باعث۔

(حاشیہ ۸)

"فتعلمنا الإيمان قبل أن نتعلم القرآن، ثم تعلمنا القرآن فازددنابه إيماناً۔ (ابن ماجة، عن جندب بن عبد الله صححه الألبانی) اِس کو صحابہؓ کے ایک باقاعدہ منہج کے طور پر بیان کرنے سے متعلق ابن عمرؓ کا بیان بھی مستدرک حاکم ودیگر کتب میں بیان ہوا ہے۔عقیدہ واصولِ سنت کی کتب میں بھی اِن آثار کو نہایت اہمیت دے کر بیان کیا گیا ہے۔

(حاشیہ ۹)

تفسیر ابن کثیر:
"بغياً بينهم"

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إلا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْياً بَيْنَهُمْ (آل عمران:۱۹) ''اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انہوں نے صحیح علم ہونے کے بعد آپس کی ضد کے باعث اختلاف کیا''

(ترجمہ مولانا احمد علی)

اِس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر لکھتے ہیں: أی بغیٰ بعضهم علي بعض فاختلفوا فی الحق لتحاسدهم وتباغضهم وتدابرهم فحمل بعضَهم بُغضُ البعضِ الآخر علیٰ مخالفته فی جميع أقواله وأفعاله وإن كانت حقا۔ ''یعنی انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ضد کر لی، تو حق کے معاملہ میں اختلاف کرنے لگے، آپس کے حسد، آپس کے بغض اور آپس کی جفا کے نتیجہ میں۔ تو ایک دوسرے کے بغض نے ان کو اس حد تک پہنچایا کہ ایک فریق سبھی اقوال اور افعال میں دوسرے کے برعکس راستہ اختیار کرنے لگے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہوں''

(دیکھئے تفسیر ابن کثیر بابت سورۃ البقرۃ آیت ۱۹)

حواشی

(حاشیہ ۱۰)

یہاں اِس سیاق میں ’’اہل حق‘‘ سے ہماری مراد ہے: کسی امت کے ’’سلف‘‘ جس کے اساتذہ کی پہلی کھیپ اُس کے نبی کے اپنے زیرنگرانی پروان چڑھی ہوتی ہے۔ اوران کی اُس راہ کے، جس پر وہ عملاً گامزن ہوتے ہیں، صحیح وقابل اعتماد ہونے کی توثیق نبی خود کر کے گیا ہوتا ہے۔

(حاشیہ ۱۱)

’’اھواء‘‘ اور ’’بغیاً بینھم‘‘ یا ’’معروضیت‘‘؟

قرآن کے متعدد اردو تراجم میں ہم دیکھتے ہیں، بَغْیاً بَیْنَہُمْ کا مطلب ’’آپس کی ضد‘‘ کیا گیا ہے؛ جوکہ نہایت خوب ہے۔

اِس ذہنی حالت کی ایک آخری ترین صورت کے طور پر مغرب، اور مغرب کا چربہ یہاں کے فلاسفہ کے حوالے سے ایک فائدہ کی بات: ہمارے کئی ایک مسلم مفکرین (مانند سید قطبؒ وغیرہ) نے جدید یورپ کے صورت گروں کے حوالے سے ایک چیز کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے: جدید یورپ کی صورت گری کرنے والے دماغوں کا ایک نفسیاتی تجزیہ کر لینا بھی اِس پورے مغربی فنامنا کو سمجھنے میں آپ کو بہت مدد دیتا ہے۔ کلیسا یقیناً دین انبیاء کی نمائندگی نہیں کرتا تھا اور نہ آج کرتا ہے، پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ملحد عباقرہ کے جملہ فکری تصرفات میں کلیسا کے ساتھ ایک ضد اور ایک نفور مسلسل اور واضح انداز میں بولتا آیا ہے۔ انبیاء اور شرائع کو معاشرے سے باہر کرنے کا تصور ان کے ہاں محض ایک ’نظریہ‘ ہی نہیں بلکہ یہ ان کی کسی چھپی ہوئی رگ کو بے حدوحساب ’سکون‘ پہنچانے والی ایک چیز بھی ہے۔ ان کا ایک نفسیاتی تجزیہ کرنے والا شخص ادنیٰ ترین شک نہیں پاتا، ’اینٹی

چرچ' موومنٹ کا جو ایک مومنٹم تھا وہ ان کو باقاعدہ چلاتا آ رہا ہے، اگرچہ یہ کتنا ہی معروضیت objectivity کا دعویٰ یا زعم رکھیں۔ حقیقت بھی یہی ہے، ''فکری مومنٹم'' ایک نہایت زور آور چیز ہے اور اس کے دھارے پر ''عقول'' کو تنکوں کی طرح بہتے دیکھا گیا ہے، اگرچہ 'تنکے' اِس حرکت کی تمام تر نسبت خود 'اپنی' طرف کر رہے ہوتے ہیں! حقیقت یہی ہے، سوائے کسی حد تک فزیکل سائنسز کے میدان کے، 'معروضیت' کا دعویٰ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ''سوچ کے پیرائے'' کہیں نہ کہیں سے لئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہ پیرائے یا تو آپ انبیاء اور ان کے ان ''حواریون وأصحاب'' (جنہیں وہ سند توثیق دے کر گئے ہوتے ہیں) سے لیں، اور یا پھر انبیاء کے خصوم سے، یعنی ایمان اور یا کفر۔ اتباع اور یا شقاق۔ دنیا کے اندر یہ صرف دو ہی منہج ہیں۔ ہاں اِن دونوں کے بیچ پھر بے شمار مناہج ہیں؛ کوئی انبیاء و اصحابِ انبیاء کی طرف کو قریب تر ہے تو کوئی خصومِ انبیاء و خصومِ اصحابؓ کی طرف کو قریب تر۔ لوگوں کے حق سے قرب یا حق سے بُعد کو ماپنے کا صرف یہ ایک پیمانہ ہے۔ فاللّٰھم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه۔

(حاشیہ ۱۲)

''زیغ'' کی سزا ایک ''بڑا زیغ''

قرآن نے بنی اسرائیل کے اہل زیغ کے حوالے سے ذکر فرمایا:

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (الصّف:۵)

پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا ہی کر دیا

معلوم ہوا، ایک ٹیڑھ (زیغ) وہ ہوتا ہے جو انسان سے ظاہر ہوتا ہے، اور

حواشی

جو کہ اتباع میں مانع ایک خاص رویہ ہوتا ہے، __ (جبکہ وہ لوگ جو اِس مانعِ اتباع رویہ سے بالیقین بچے ہوتے ہیں، وہی ہوتے ہیں جن کو نبی کے ہاتھوں صحتِ اتباع کی سند ملی ہو)، __ اور ایک ٹیڑھ (زیغ) وہ ہوتا ہے جو اُن کے اُس پہلے والے ٹیڑھ کے نتیجے میں پھر خدا کی جانب سے اُن کے دلوں میں پیدا کر دیا جاتا ہے، اور یوں یہ معاملہ ''ملٹی پلائی'' ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔

یہ زیغ (ٹیڑھ) ہی ہوتا ہے جو پھر کتاب خداوندی میں متشابہات کے مقام پہ جا کر شیر ہو جاتا ہے اور وہاں سے ڈھیروں فتنے اور تاویلات لا لا کر دیتا ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاء الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاء تَأْوِيلِه (آل عمران: ۷)

جن دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ کتاب کے اُن حصوں کے پیچھے جاتے ہیں جن میں اشتباہ ہے، فتنہ کی طلب میں اور اس کی تاویل کی طلب میں۔ اور نہیں جانتا ان کی تاویل کوئی مگر اللہ۔

اور یہاں پر وہ رویہ جو نبی کے توثیق شدہ ''راسخون فی العلم'' کے یہاں اختیار کر رکھا گیا ہو راہِ نجات کا رہبر اور رہنما بن جاتا ہے:

وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُوْلُواْ الألْبَابِ رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ

اور راسخون فی العلم کہتے ہیں: ہمارا اِس پر ایمان ہے، سب ہمارے پرودگار کے پاس سے ہے۔ اور نہیں بات کو پاتے مگر اولوا الالباب۔ ''اے ہمارے پروردگار!

ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر دیجئو بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔ اور بخش دیجئو ہمیں اپنے پاس سے رحمت۔ بے شک تو بڑا ہی دینے والا ہے“۔

(حاشیہ ۱۳)

دلوں اور دیدوں کا اوندھا کر دیا جانا

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْراً وَإِن يَرَوْاْ كُلَّ آيَةٍ لاَّ يُؤْمِنُواْ بِهَا حَتَّى إِذَا جَآؤُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُواْ إِنْ هَذَا إِلاَّ أَسَاطِيرُ الأَوَّلِينَ (الانعام: ۲۵) ”اور اُن میں کوئی وہ ہے جو تمہاری طرف کان لگاتا ہے۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف کر دیے ہیں کہ وہ اسے نہ سمجھیں اور ان کے کانوں کے اندر گرانی۔ یہ ہر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی ایمان لا کر نہ دیں۔ یہاں تک کہ جب یہ تمہارے پاس آئیں گے تم سے بحث کریں گے، کافر کہیں گے کہ یہ تو کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں“ **وَأَقْسَمُواْ بِاللّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الآيَاتُ عِندَ اللّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءتْ لاَ يُؤْمِنُونَ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُواْ بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلآئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلاً مَّا كَانُواْ لِيُؤْمِنُواْ إِلاَّ أَن يَشَاءَ اللّهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ** (الانعام: ۱۰۹-۱۱۱) ”انہوں نے اللہ کی قسمیں بڑے زور زور کی کھائیں کہ اگر کوئی نشانی آ جائے تو وہ لازماً اُس پر ایمان لے آئیں۔ کہو، نشانیاں سب اللہ کے پاس ہیں۔ مگر تم کیا جانو، جب وہ نشانی آ جائے تب بھی یہ ایمان نہ لائیں۔ اور ہم اُن کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے (تو) جیسے

حواشی

یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے (ویسے پھر نہ لائیں گے) اور ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی میں بہکتے رہیں۔ اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور مردے اُن سے باتیں کرنے لگتے اور ہر ہر چیز کو ہم ان کے سامنے لا موجود کرتے، تو بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے مگر یہ کہ خدا چاہتا، لیکن ان میں سے اکثر جہالت کی بات کرتے ہیں''

(حاشیہ ١٤)

اور ''راستے'' کے بغیر یہ سب تلقی اور استدلال اور استنباط وغیرہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ تلقی واستدلال کا ایک نیا ''راستہ'' نکالنے کیلئے بھی آپ کو استدلال اور استنباط وغیرہ ہی کرنا ہوگا اور اپنے اُس استدلال اور استنباط کے حدود و قیود اور قواعد وضوابط کا تعین بھی، جو کہ پورا ایک پیکیج ہوتا ہے اور جس میں آپ کے پاس ایک اپنی 'اَقُول' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اِس پر کچھ بات چند صفحے آگے چل کر بھی آ رہی ہے۔

(حاشیہ ١٥)

اِس حدیث سے عین یہ استدلال ابن ابی العزحنفی نے شرح طحاویہ میں کیا ہے۔

(حاشیہ ١٦)

بلکہ حیرت کی حد ہو جاتی ہے جب وہ اپنی عقل سے آپ کو یہ منہج بھی نکال کر دیتے ہیں کہ نصوصِ شریعت کا تعین ہی کس طرح کرنا ہے؛ کس نص کو ''شریعت'' ماننا ہے اور کس کو اِس منصب سے محروم رکھنا ہے۔ یہ بات صحابہؓ سے پوچھ لی جائے کہ آخر وہ کس چیز کو ''شریعت'' سمجھتے رہے تھے اور کس چیز کو

نہیں، کم از کم اِس بات ہی کا قائل ہونا کہ سب سے پہلے اِس بات کا جواب صحابہؓ کے ہاں تلاش کیا جائے اور جو ''ضروری'' بات اُن کے ہاں نہ ہی ملے چلیئے اُس کی بابت اپنی عقل کو حکم ٹھہرا لیا جائے اور اگر صحابہؓ کے یہاں ایسے کسی مسئلہ پر کوئی تعددِ رائے پایا گیا تو وہاں پر صحابہؓ کی ایک رائے کو صحابہ ہی کی کسی دوسری رائے پر ترجیح دے لی جائے اور پھر بے شک اپنی اُس رائے کو جی بھر کر نشر کر لیا جائے......؟ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی۔ ایک استکبار ہے جو صحابہ کے برابر بیٹھنے پر ہی مصر ہے۔

اِس رجحان کا زیادہ تعلق چونکہ ''مصادرِ شریعت'' کے تعین سے بھی ہے، اور جس پر ہم کتاب کے حصۂ اول میں کلام کر آئے ہیں، لہٰذا اس کا تذکرہ یہاں نہیں کیا جا رہا۔

(حاشیہ ۱۷)

امام ابوحنیفہ صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتے

راہِ سنت پر قائم ہمارے ائمۂ فقہ میں سب سے زیادہ ''رائے'' کی طرف میلان رکھنے والے بالعموم امام ابوحنیفہؒ مانے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول جو وہ اپنے اصول بیان کرتے ہوئے ذکر فرماتے ہیں، ذرا ایک نظر دیکھ لیجئے:

''ما جاء نا عن رسول الله ﷺ قبلناه على الرأس والعينين، وما جاء نا عن أصحابه رحمهم الله تخيرنا منه، ولم نخرج عن قولهم، وما جاءنا عن التابعين فهم رجال ونحن رجال۔''

(كتاب ''الانتقاء'' لابن عبد البر ص ٢٦٦ ۔ طبعة: مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب)

''رسول اللہ ﷺ سے ہمیں جو کچھ پہنچے گا وہ ہمارے سر آنکھوں پر، اُسے ہم قبول

حواشی

کریں گے۔ جو کچھ آپؐ کے اصحاب سے ہم تک پہنچے گا، ہم اُس میں سے کوئی ایک قول اختیار کریں گے؛ البتہ اُن کے اقوال سے باہر نہیں جائیں گے۔ اور جو کچھ ہمیں تابعین سے پہنچے گا تو وہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔

واضح رہے، تابعین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کے امام ابوحنیفہؒ خود بھی ہم عصر ہی بنتے ہیں، بلکہ بعض نے تو امام ابوحنیفہؒ کو تابعی بھی ثابت کیا ہے، گو یہ بات محل نظر ہے۔ مگر صحابہؓ کی بابت یہ واضح ہے کہ امام ابوحنیفہ ان کے اقوال کے اندر رہتے ہوئے ہی ایک قوی تر قول کو اختیار کریں گے مگر مجموعی طور پر صحابہؓ کے قول سے نکلیں گے نہیں۔ واضح رہے، یہ بات بھی مسائل کی بابت ہو رہی ہے۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے تو اِس معاملہ میں تو یہ سب کے سب ائمہ بلا شک وشبہ اور بلا اختلاف صحابہ کے راستے کو ہی دین کے فہم وتلقی کے معاملہ میں اصل بنیاد مانتے ہیں۔

(حاشیہ ۱۸)

یہاں بعض جدت پسندوں کے اِس وتیرہ سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ کسی کسی وقت ان کے ہاں بھی ائمۂ سنت کے اقوال اور مواقف سے متعلق ایک 'سیر حاصل' بیان دیا گیا ہوتا ہے، البتہ اس کا سیاق دیکھیں تو یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہ سب اس لئے نہیں کہ خود اِن کے ہاں اِن ائمہ کی کوئی حیثیت ہے، بلکہ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ اِن کے خصوم کے ہاں ائمہ کی کوئی حیثیت ہوتی!

اِس کی ایک حالیہ مثال: پاکستان میں اہل سنت چونکہ زیادہ احناف ہیں، مگر ان حضراتِ احناف کے ایک وسیع طبقہ نے اِس مسئلہ پر کہ 'اگر ایک ذمی توہین رسالت کا مرتکب ہو تو اس کی کیا سزا ہو'، امام ابوحنیفہؒ کی بجائے جمہور کا

قول اختیار کیا ہے جس کے بیان پر امام ابن تیمیہؒ کی ''الصارم المسلول'' ایک حوالہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس مقام پر، پاکستان کے احناف کی یادداشت میں یہ بات لانے کیلئے کہ اِن کا اختیار کردہ یہ موقف امام ابوحنیفہؒ والا نہیں ہے، جدت پسند طویل وعریض مقالے اِس موضوع پر سپرد قلم فرما رہے ہیں کہ 'توہین رسالت پر ایک ذمی کی سزا امام ابوحنیفہؒ کے ہاں کیا ہے؟'۔ جدت پسندوں اِن کے وقیع بیانات سے متاثر ہو کر اگر آپ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چلئے یہ امام ابوحنیفہؒ کا موقف تو کم از کم اختیار کرتے ہیں، اور یہ کہ چلئے ''سلف'' کے حوالے اِن کی زبانوں پر بھی آئے تو سہی، تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اِن کا 'اپنا' موقف دیکھنا ہو تو وہ تو نہایت صاف اور واضح ہے: شرعی سزا کے معاملہ میں، توہین رسالت کرنے والے کا آپ بال بھی بیکا کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ تو پھر یہ امام ابو حنیفہؒ کے موقف (کہ توہین رسالت کے مرتکب، اور وہ بھی ایک ذمی کو، جو سزا دی جائے وہ **موت سے کم** ہو) کی ترجمانی میں آخر اتنے طومار کیوں لکھ ڈالے گئے؟ ہاں یہ اِس لئے نہیں کہ اِن کے اپنے یہاں ابوحنیفہؒ کے قول کی کوئی حیثیت ہے، بلکہ احناف کو یاد دلانے کیلئے کہ وہ بوحنیفہؒ کی راہ سے ہٹ رہے ہیں!

(حاشیہ ۱۹)

نبی صرف ''بیج'' دے کر نہیں، ''فصل'' اگا کر جاتا ہے

یہ مبحث قدرے تفصیل کے ساتھ ہم اگلے حاشیہ میں بیان کریں گے۔ تاہم یہ بات یہیں پر ذکر کرتے چلیں کہ جس طرح نبوت کسی ''تحقیق'' اور ''کھوج'' کا نتیجہ نہیں ہوتی اسی طرح نبی کا اپنے معتمد اصحاب کی ایک خاص انداز کی فکری پرورش کرنا اور ان کو

حواشی

ایک خاص ''محجة'' (route) پر چڑھا جانا اور اُن کو کچھ خاص مزاج اور کچھ خاص علمی رویے دے دینا بھی ___ اپنے عمومی معنی میں ___ ایک الہامی نبوی عمل ہوتا ہے۔ بنابریں، اصحاب کا نبی پر اتری ہوئی وحی کا ''اتباع'' بھی، (جس کے سانچے نبی کے اپنے ہی زیرنگرانی وجود میں لائے گئے ہوتے ہیں) ''تحقیق'' اور ''کھوج'' کی نسبت ''تلقی'' اور ''تربی'' کا ایک بے ساختہ انداز لئے ہوئے ہوتا ہے جوکہ نہایت گہرا اور علم سے پر ہوتا ہے **مگر تکلُّف اور تنطُّع** سے پاک۔ یہاں کچھ ایسے فطری رویے ہوتے ہیں جن کی تشکیل اور تراش خراش صاحب نبوت کے اپنے ہاتھوں ہوئی ہوتی ہے اور جوکہ درحقیقت وحی کی تلقی کے شایان ہوتے ہیں؛ اور جو کہ خالی 'تحقیق' اور 'کھوج' کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

یوں سمجھئے آسمان کی جانب سے ''بیج'' ہی نہیں ڈالا گیا ہوتا، ''زمین'' بھی تیار کر کے دے دی گئی ہوتی ہے۔ اور باقاعدہ ایک ''فصل'' اگا کر دی گئی ہوتی ہے۔ ''بیج'' اس کا صرف ایک فیکٹر ہے (اور گو سب سے اہم ہے)، البتہ ''زمین'' کی تیاری بذاتِ خود ایک پراسیس ہے، اور پھر اُس سے ''فصل'' لینا الگ سے ایک کام ہے۔ نبی نے خدا کی نگرانی میں یہ سارے ہی کام کر دیے ہوتے ہیں۔ (اور یہ سب کچھ انسانوں کے اپنے بس کی بات نہیں؛ اہل زمین پر یہ خدائی فضل ہوتا ہے، جو نبی کی وساطت کر کے دے دیا گیا ہوتا ہے)۔ نبی سے یہ پورا پراسیس ہی آگے منتقل ہونا ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی اِس معنیٰ میں منتقل نہیں ہونا ہوتا کہ بعد والوں کو اِس پورے عمل کا ''اعادہ'' کرنا ہو۔ بلکہ اِس معنی میں منتقل ہونا ہوتا ہے کہ بس یہ آگے سے آگے چلے۔ پس بعد والوں کا کام بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے، اس کی قریب ترین مثال ''برسیم''

کی سی ہے؛ جس کے بیج کو نہ تو آپ دوبارہ کاشت کرتے ہیں اور نہ اس کیلئے زمین کی مطلوبہ تیاری کا دردِسر لیتے ہیں۔ بس اُس ایک ہی بار ڈالے ہوئے بیج سے، اور اُس ایک ہی بار تیار کر دی گئی زمین سے، اور اُس ایک ہی بار کر لی گئی محنت سے، عین اُسی جگہ پر نیا سے نیا پور آتا چلا جاتا ہے۔ یا جس طرح آپ ''گنے'' کی فصل اگلے سال بھی پچھلے سال والی بوائی سے ہی لے لیتے ہیں (جس کو ہمارے یہاں پنجاب میں ''موڈھا'' کہتے ہیں) اور بعض جگہوں پر یہ معاملہ سالہاسال چلتا ہے۔ (مثال محض تصویر کو قریب کرنے کیلئے ہے)۔ ہم جانتے ہیں گنے کا ''پہلا پور'' سب سے بھرپور ہوتا ہے اور اس کے بعد معاملہ کبھی ''اُس جیسا'' نہیں ہوتا، مگر معاملہ چلتا ضرور رہتا ہے۔ البتہ نبی کی اگائی ہوئی فصل صدیوں ''چلتی'' ہے اور بے شمار پور نکالتی ہے، گو ''پہلے پور'' والی بات پھر نہیں ہوتی۔

چنانچہ ''آسمانی فصل'' ایک ہی بار کاشت ہوتی ہے اور پھر سدا بہار رہتی ہے۔ اس کا پھل دینے اور برگ و بار لانے کا ''سلسلہ'' کبھی ختم نہیں ہوتا، جب تک کہ خدا کسی نئے ''کاشت کار'' کو بھیجنے کا فیصلہ نہ کر لے۔ اور ظاہر ہے اب یہ معاملہ تمام ہو چکا ہے۔ اور چونکہ معاملہ یہاں تمام ہو جانا تھا اس لئے یہ آخری آسمانی فصل ایسی لازوال ہوئی کہ پچھلے انبیاء تک اس پر رشک کرتے گئے (کہ انبیاء کا کام رہتی دنیا تک کیلئے اب یہ ''اَبدال''☆ کریں گے)۔ جس اعلیٰ معیار کی، اور جس بڑی سطح کی اور جس عالمی کھپت کی، اور جس دور رس تاثیر کی (تاقیامت منصوبوں کو رو بہ عمل لانے

☆ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: اہل سنت کو ''اَبدال'' کہا جاتا ہے، کیونکہ انبیاء کا دور تمام ہو چکا اور اب یہی لوگ (ایک خاص معنیٰ میں) انسانیت کیلئے انبیاء کا بدل ہیں۔

حواشی

کیلئے)، اور جس زور آور قسم کی یہ فصل زمین پر اُ گائی گئی، اُس کی مثال روئے زمین پر نہیں ملتی:

كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيْماً (الفتح:۲۹)

مثل ایک کھیتی کے، جس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر گدرائی، اور پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی، اور لگی بونے والوں کو خوش کرنے، تا کہ وہ اُن کو کفار کے جی جلانے کا سامان کرے۔ وعدہ فرما رکھا ہے اللہ نے اُن میں کے اُن لوگوں سے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ایک خاص ہی مغفرت کا اور ایک بہت ہی بڑے اجر کا۔

ایسی فصل، قصہٴ پارینہ بننے کیلئے وجود میں نہ آئی تھی۔ اس کا ''موڑھا'' پورے تسلسل کے ساتھ چلا۔ اور اس معنیٰ میں یہ ایک ہی فصل تھی۔ صدیوں تک زمین پر اِس نے نہایت اعلیٰ اور خوش ذائقہ پھل دیے، اور اللہ کے فضل سے دیتی رہے گی۔ صدیوں تک یہ شرک میں ڈوبے ہوئے یورپ اور افریقہ کو دہلاتی رہی، اور ایشیا میں ہند و مابعد دور دور تک کے سومناتوں کو توڑ کر آتی رہی، اور ان شاء اللہ ابھی توڑتی رہے گی۔ (البتہ اِس مبحث کے بیان کا یہ مقام نہیں)۔

غرض نبی کا ''اصحاب'' کو وجود میں لانا اپنے ایک دور رس معنیٰ میں پوری ایک ''امت'' کو وجود میں لانا ہوتا ہے (وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ - الجمعة: ۳)۔ اور یہ سلسلہ جب تک آسمان کی جانب سے نہ روک دیا جائے، چلتا ہے۔ یوں بھی معاشرے جب ایک بار تشکیل پا جاتے ہیں تو وہ ایک ایسی زندہ مخلوق ہوتے ہیں جس میں افراد کی حیثیت خلیوں cells کی سی ہوتی

ہے، اور جو کہ اپنے اُس اجتماعی وجود کے اندر ہر لحظہ نئے خلیوں کو جنم دیتے اور ان کیلئے جگہ چھوڑتے چلے جاتے ہیں، جبکہ وہ جسم اِن نئے خلیوں کو بھی اپنی اُسی سرگرمی کے تابع رکھتا ہے۔ یوں سمجھئے یہ مخلوق (امت اسلام) زمین پر پائی نہیں جاتی تھی اور نبی نے آ کر اس کی ایجاد کر دی۔ اب کچھ دیر میں اس کے ''سیلز'' سارے کے سارے بدل جائیں گے اور اس خاص معنی میں یہ وہ مخلوق نہیں رہے گی۔ البتہ اِس کے صرف ''سیلز'' بدلے ہیں، اور اس معنی میں یہ وہی مخلوق ہے۔ اس کی صحت اور توانائی میں بعد ازاں فرق آ سکتا ہے اور بعض تبدیلیاں بھی اس کے اندر رونما ہو سکتی ہیں (اور اس لحاظ سے اس کے بعض فنکشنز بھی متاثر ہو سکتے ہیں، اس کی بحالیِ صحت کے اکسیر بھی پائے جا سکتے ہیں، ایک سطح پر معاملہ بڑھاپے اور طولِ اَمد کی طرف بھی جا سکتا ہے) مگر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ مخلوق کوئی دوسری نہیں آ گئی ہے۔ (اور ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ قیامت سے پہلے اِس ''مخلوق'' کی اجل آنے والی نہیں ہے)۔ اِس لحاظ سے یہ ایک ایسی کھیتی ہی کی طرح ہے کہ جس کا ایک پورا ابھی کٹا نہیں ہوتا کہ اُس کی جڑ سے دوسرا اُگا ہوا ہوتا ہے، یا ایک ایسا سدا بہار درخت کہ جس کے پہلے پتے ابھی جھڑے نہیں ہوتے کہ نئے پتے پھوٹ چکے ہوتے ہیں...... چنانچہ سوائے ایک ''تسلسل'' کے اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا؛ نبی کا جاری کردہ تسلسل... تاریخ میں پتھر پر لکیر!!!

....

غرض نبی کے اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی اشیاء کے حوالے سے آپ دیکھتے ہیں: یہاں صرف ''بیج'' ہی نہیں، پوری ایک ''فصل'' ہے۔ اور بعد کا تمام تر معاملہ ''یہیں'' سے آگے چلنا ہوتا ہے۔ باقی زمانہ (جب تک اُس نبوت کا وقت باقی

حواشی

رہتا ہے☆) کوئی نیا کام سمجھو کرنا ہی نہیں ہوتا۔ اِسی ''پہلے سے چلتی آنے والی کھیتی'' سے نئے سے نئے پور لینے ہوتے ہیں۔ بس ذرا ''نم'' کا بندوبست کرنا ہوتا ہے؛ کیونکہ ''خشک سالی'' اِس فصل کیلئے بے حد نقصان دہ ہے۔ نیز اس کا ''جھاڑ جھنکاڑ'' تلف کرتے رہنا ہوتا ہے، تاکہ یہ بدل کر ''کچھ سے کچھ'' نہ ہو جائے۔ ہاں یہ محنت ضرور ہے اور ہر دور کے اندر بے حد مطلوب۔ یہی وہ محنت ہے جو کسی دور میں معیاری ہوگی تو کسی دور میں معیار کے اندر فرق بھی آ جائے گا۔ البتہ ''معیار'' یہی ہے۔ پس کسی دور میں آپ دیکھتے ہیں یہ کھیتی نہایت اچھا پور دے گئی ہے (اور آسمان سے بے حد و حساب نصرت لے آئی ہے)۔ اور کسی دور میں اس کا پور خاصا کمزور رہا ہے بلکہ اس کے اندر ''اِدھر اُدھر کی اشیاء'' اور بہت اُگ آئی رہی ہیں (اور یہ بھی کہ آسمانی نصرت بھی کچھ خاص اس کی پشت پر نہیں رہی)۔

....

پس یہاں سے اِس کو ایک ''سلسلہ'' ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ یعنی نرے ''کھوج'' اور ''از سرنو دریافت'' قسم کا اپروچ اختیار کرنے کی نسبت، ''پہلوں'' کے دستور اور طرزِ عمل کو ہی زیادہ سے زیادہ دیکھنا اور ''فالو'' کرنا ہوتا ہے؛ بصورتِ دیگر آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ ''کھیتی'' کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

....

اب ظاہر ہے ایک ایسا سلسلہ جو پہلے دن سے صحیح بنیادوں پر پڑ گیا ہو

☆ اور جبکہ ہمارے نبی ﷺ کی نبوت قیامت تک ہے۔ بنا بریں آپؐ کے اصحابؓ کی یہ حیثیت کہ دین کے فہم اور تلقی کا پورا سلسلہ اُنہی کو بنیاد مان کر آگے چلے، قیامت تک ہے۔

اور پھر قیامت تک اُن بنیادوں کو 'درست' کرنے کی ضرورت نہ ہو، اپنی حقیقت میں ایک اعجاز ہوتا ہے۔ ایک نبوت سچی ہے تو لازم ہے کہ وہ پہلے دن سے ہی ''صحیح'' سمجھی گئی ہو۔ **یعنی جن لوگوں نے نبی کو قبول کیا اور وہ نبی کے ہاں قبول ہوئے، لازم ہے کہ ان کو نبوت کا مدعا و مقتضا صحیح سمجھ آیا ہو اور اس کا فہم و تلقی اُن کے یہاں آسمانی معیاروں کے مطابق ہوا ہو۔** ورنہ نبی ان کو پاس ہی نہ کرتا۔

یہ بات نہایت قابل ذکر ہے کہ: نبی اپنے اصحاب کو صرف اُن کے 'جذبے' اور اُن کی 'نیکی' اور اُن کی 'خدمات' کے حوالے سے پاس نہیں کرتا، جیسا کہ ہمارے آج کے بہت سے 'صحابہؓ کو خراجِ تحسین پیش کرنے والوں' کا بیان سننے سے سمجھ آتا ہے! حالانکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ: ''دین اللہ'' کے حوالے سے، نبی اپنے اصحاب کے ''فہم'' کو بھی پاس کرتا ہے☆ اور یہ توثیق کرتا ہے کہ وہ بات جو اُس نے اُن کو سمجھائی ہے وہ اُنہوں نے اُس سے سمجھ کر دکھائی ہے، **پس یہاں سے ایک ''شریعت'' بھی امر ہو جاتی ہے اور اُس کا ''فہم'' بھی۔**

پس یہ بات (کہ ایک ایسا سلسلہ ہو جو پہلے دن سے ہی صحیح بنیادوں پر پڑ گیا ہو اور پھر قیامت تک اُن بنیادوں کو 'درست' کرنے کی ضرورت نہ ہو) **ایک سچی نبوت ہی کے ساتھ خاص ہوسکتی ہے۔** وہ نبوت سچی ہے تو اُس کا وہ فہم بھی موثوق ہے جس کو اُس سچے نبی سے ''تقریر'' ملی ہو۔ **اور اِس خاص حوالے سے دنیا کا کوئی علم ''علمِ شریعت'' پر قیاس نہیں ہوسکتا۔** یہ آخری بات ذہن نشین ہو جائے تو اگلے حاشیہ کے تحت آنے والا مبحث بہتر طور پر سمجھ آ سکتا ہے۔

☆ اور جو کہ کسی اور کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا، خواہ جتنا مرضی زور لگا لے؛ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

حواشی

(حاشیہ ۲۰)

”ارتقاء“ نہیں ”اِزدھار“

ہمیں معلوم ہے جدت پسند یہاں نکتہ اٹھا سکتے ہیں کہ ہمارا یہ کہنا کہ ”کسی علم کے معیارات اُس وقت سے ہونے چاہئیں جب سے وہ علم ہے“، ٹھیک ہونے کے باوجود اُن کے حق میں جاتا ہے نہ کہ ہمارے دعویٰ کے حق میں۔ اور وہ اس لئے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر علم کے معیارات کی تصحیح بھی بہرحال ہوتی رہی ہے۔ یعنی ہوسکتا ہے کسی علم میں ابتدا کے اندر جو معیار قائم ہوئے، بعد میں پتہ چلا کہ اُن میں سے کئی ایک نہایت فرسودہ تھے اور یوں اُن معیارات کو متروک ٹھہرا کر اُن کی جگہ نئے معیارات قائم کروا دیے گئے؛ اور یہ ”ارتقائی عمل“ مسلسل جاری رہا۔

مگر ان کی یہ بات باقی سب علوم کی بابت درست ہوسکتی ہے سوائے شریعت کے علوم کے۔ اور یہی وہ اصل فارق ہے جو انسانی علوم اور شرعی علوم کے مابین ہے......

انسانی علوم خالصتاً ایک ارتقاء کا نتیجہ ہوتے ہیں لہٰذا ان کے اندر پرانے معیارات کا فرسودہ نکل آنا ممکن اور قرین قیاس ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے، اِنسانی علوم کے اندر ہمیشہ امکان ہے اور رہے گا کہ چیزوں کو جاننے اور پرکھنے اور آگے بڑھانے کا کوئی نہایت اعلیٰ معیار یک دم کسی دن دریافت ہو جائے اور پچھلے بہت سے معیارات کی جو صدیوں مانے جاتے رہے تھے چھٹی کروا دی جائے۔ البتہ جہاں تک شرعی علوم کا تعلق ہے تو وہ صاحب نبوت کے اپنے زیر نگرانی پروان چڑھے ہوتے ہیں اور ان کیلئے درکار معیارات اور رجحانات اور اتجاہات اور نفسیات اور معنویات یہاں تک کہ تفکیر کے سانچوں اور مزاجوں تک کو صاحب نبوت کے زیر نگرانی ہی نفوس کے اندر کندہ کر دیا جاتا

حواشی

ہے بلکہ اِس پورے عمل کی نگرانی آسمان کے اوپر سے ہو رہی ہوتی ہے۔ بعد کے لوگوں کو ان پہلے لوگوں کی رکھی ہوئی اینٹوں کے اوپر ہی نئی اینٹیں رکھنی ہوتی ہیں۔ پس شرعی علوم کے اندر، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اِس لحاظ سے تو ''اِزدھار'' (growth) ہوتا ہے کہ پہلوں کی رکھی ہوئی اینٹوں کے عین اوپر (اور باقاعدہ اِس حرص کے ساتھ کہ اِس چنائی میں نیچے والی اینٹوں کی نسبت سے کوئی ایک سوتر بھی فرق نہ آئے) مزید سے مزید اینٹیں رکھی جاتی رہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ ائمۂ سنت کے ہاں ''جمود'' بھی بے حد مذموم ہے، کیونکہ ''جمود'' کا مطلب ہے کہ اِس عمل کا ایک صحت مند پھیلاؤ روک دیا جائے، یہاں تک کہ پہلی لگی ہوئی اینٹیں بھی اکھڑنے والی ہو جائیں)۔ اور اس لحاظ سے آپ اِس عمارت کو جس قدر ہو سکے اوپر اٹھا دیں بلکہ آسمان تک پہنچا دیں۔ لیکن یہ ''ڈیویلپمنٹ'' اِس معنیٰ میں نہیں کہ ایک لمبا ہاتھ بڑھا کر آپ عین بنیاد سے ہی کچھ اینٹیں کھسکانا شروع کر دیں، یہاں تک کہ پوری عمارت کے نیچے آ گرنے کا خطرہ پیدا کر دیں۔ کسی شخص پر ایسے کسی ''ارتقاء'' کا بھوت سوار ہے تو وہ اپنا یہ شوق کچھ انسانی علوم کے اندر پورا کر لے۔ علوم نبوت و شریعت اِس سے منزہ اور برتر ہیں۔

بنا بریں، **یہ تو بہرحال ضروری ہے کہ کسی علم کے معیارات تب سے ہوں جب سے وہ علم پایا گیا ہو، اور ایسا نہ ہونا تو بہرصورت ناقابل تصور ہے**۔ اور اِس حد تک تو بات سبھی علوم پر صادق آئے گی۔ ہاں اس کے بعد دیکھا جائے گا، اگر وہ انسانی علوم ہوں تو وہ ارتقاء پزیر ہوں گے اور اگر وہ شرعی علوم ہیں تو وہ اِزدھار پزیر ہوں گے نہ کہ ارتقاء پزیر۔

نوٹ: **اِزدِھَار** کا لفظ **زَھَرَ** سے (**باب افتعال**) ہے، جس کا مطلب ہے

حواشی

ایک درخت پر برگ و بار کا آنا۔ آپ **تاریخ التشریع الإسلامی** پر جو بھی کتب پڑھتے ہیں اُن میں اُس فنامنا کیلئے بالعموم ''اِزدھار'' کا ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے زمانے میں علومِ شریعت کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے عبارت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی دیوہیکل علمی تحریک تاریخ انسانی کے اندر کبھی رونما نہیں ہوئی جو نبوت سے حاصل ہونے والے علوم کو تنظیم و توسیع و تفریع اور تاصیل و تطبیق اور تالیف کرنے کی صورت میں نبوت سے متصل زمانے کے اندر برپا ہوئی۔ ہاں اِس **اِزدِھَار** کا باب آج بھی کھلا ہے، جس کا آپ سے آپ یہ مطلب ہوگا کہ وہ اپنے اسی شجر پر پھوٹے اور اپنی اُس پہلی نشو ونما کا ہی ایک تسلسل ہو۔

7

ایک الجھن، تین رویے

پس یہ دو الگ الگ سوال ہیں:

۱) ''دین'' کہاں سے لینا ہے؟

۲) اور، اِس ''دین'' کا جو ایک ''مستند فہم'' ہو سکتا ہے، وہ کہاں سے لینا ہے؟

اول الذکر کا تعلق ''دین'' کی حقانیت سے ہے کہ آیا آپ کے دین، آپ کے عقیدہ اور آپ کے طریقۂ زندگی کا ماخذ ''اللہ کے ہاں سے نازل شدہ حقیقت'' ہے یا یہیں زمین پر گھڑ لی گئی کوئی چیز؟ جبکہ ثانی الذکر کا تعلق ''فہم'' کے مستند ہونے سے ہے کہ ''آسمان سے اتری ہوئی اُس حقیقت'' کا آیا یہ وہی فہم اور وہی تعبیر اور وہی تفسیر اور وہی تلقی واتباع ہے جو ایک تاریخی عمل کی صورت میں ___ اور بلا انقطاع ___ صحابہؓ سے چلا آتا ہے.. یا بعد میں گھڑ لیا جانے والا کوئی فہم اور کوئی طریقۂ اتباع؟

مگر یہ دو الگ الگ سوال کچھ اِس طرح خلط کر دیے گئے ہیں کہ یہاں سے پیچیدگیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ نکل کھڑا ہوا ہے۔

اور اب یہ پیچیدگیاں محض کسی ایک ہی طبقے تک محدود نہیں رہ گئی ہیں......

ألف) ایک طرف آپ دیکھتے ہیں: ''دین کا مصدر'' کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کو ماننے کا یہ تقاضا سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہر وہ مصدر جس کی کتاب اور سنت کے ''فہم'' کے معاملہ میں پابندی اختیار کی جانی چاہیے، اس کو کتاب اور سنت کا ہی ہم سر قرار دے کر مسترد اور یا نظرانداز کروا دیا جائے۔

کیوں، وہ نبی ہیں؟!

چنانچہ ـــ ''فہم'' کے معاملہ میں ـــ جب آپ لوگوں کو صحابہؓ اور تابعینؒ و اَتباع تابعینؒ کے راستے کا پابند کرتے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ آیاتِ کتاب اور احادیثِ سنت سے استنباط و استدلال کے معاملہ میں وہ اُن ائمۂ علم و فقہ کے مراجع کی پابندی اختیار کریں جو صحابہؓ اور تابعینؒ و اَتباع تابعینؒ کے راستے کا صحیح صحیح علم رکھنے والے ہیں..، تو جواب آتا ہے 'کیوں، وہ نبی ہیں؟!'

جبکہ ہم ان کو سلف و ائمہ کے اقوال کا اللہ اور رسولؐ کے قول کے مقابلے میں نہیں بلکہ اللہ اور رسولؐ کے قول کے ''فہم'' کے معاملے میں پابند کرا رہے ہوتے ہیں۔

(معلوم رہے، نصوصِ شرعیہ کا ثبوت، نصوص کی دلالتوں کا تعین، اُن سے استنباط واستدلال، اُنکے مابین ترجیح اور تطبیق وغیرہ سبھی اِس ''فہم'' میں شامل ہے)..

اور یہ بھی واضح رہے کہ ''پہلوں کے راستے'' کا پابند کراتے ہوئے ہم اُن کو کسی خاص فقہی گروہ کا پابند نہیں کرا رہے ہوتے؛ بلکہ جس قدر سلف و ائمہ کے اقوال میں تعددِ آراء و مذاہب کی گنجائش ہوتی ہے (اور جو کہ اچھی خاصی ہے) ہم وہ بھی ان کو پوری دے رہے ہوتے ہیں، کہ جس کو چاہیں اختیار کریں.. البتہ صرف اِس بات سے اُن کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ مذاہبِ سلف کے اس دائرہ سے

ہی باہر نہ چلے جائیں؛ اور کتاب وسنت کے فہم وتفسیر میں خاص اپنی 'اَقول' نہ سناتے پھریں......

اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں 'اللہ اور رسولؐ' کے ماسوا ''دین'' کے کسی ماخذ کا پابند کر رہے ہیں!

چنانچہ ائمۂ فقہ وحدیث کے فہم واستنباط اور اُنہی کے علمی وفقہی قواعد کا پابند کرانے پر......فوراً یہ اعتراض ہوتا ہے کہ 'کیا وہ نبی تھے؟!'

اور اگر ہم یہ قواعد اور اصول اُن ائمۂ ہدیٰ سے لینے کی بجائے اپنے اِن نیک حضرات سے لیں، جوکہ اِس بات سے شاید واقف تک نہ ہوں کہ یہ ''قواعدِ استنباط'' اور یہ ''اصولِ فقہ'' ہوتے کیا ہیں، تو یہ معزز حضرات مطمئن ہوں گے کہ ہم نے اُن ائمہ کو ''غیر نبی'' مانا ہے، ورنہ کسی کسی وقت وہ اِس کو 'شرک فی الرسالت' کا نام دینے تک چلے جاتے ہیں!

ب) دوسری جانب وہ طبقے ہیں جو اپنے مصادر کو جن سے وہ دین کا فہم لیتے رہے ہیں، مستقل بالذات حیثیت دینے لگتے ہیں۔ یہ خاص 'اپنے' ائمہ اور 'اپنی' کتبِ فقہ کے علاوہ کہیں اور سے رجوع کیا جانے کو باطل تک سمجھنے لگتے ہیں اور انہی کے اندر وارد ہوچکے مسائل کو قیامت تک کیلئے حرفِ آخر۔ اس سے اختلاف ہوجانے میں یہ ہلاکت کے اندیشے تک دیکھنے لگتے ہیں چاہے وہ اختلاف کتنی ہی علمی بنیادوں پر کیا گیا ہو اور دیگر مستند ائمۂ دین سے اس کا ثبوت کیوں نہ ملتا ہو۔

متبوع مستقل بالذات!

پھر کسی وقت کتاب اور سنت کے ساتھ، جوکہ دین کے ابدی مصادر ہیں، انکے اختیار کردہ مراجع کا صاف تعارض پایا جائے، اور وہ بھی اِس حد تک کہ آدمی کا اپنا دل

بھی ٹھکتا ہو کہ اُس کا متبوع (امام) کہیں پر دلیل کا ساتھ نہیں دے پایا ہے، تو بھی گویا اُس نے طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے اُس متبوع کو ہی مقدم رکھے گا!

حالانکہ اِن ائمۂ متبوعین کے اپنے ہی کلام سے ثابت ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا امام یا عالم ہو، اُس سے غلطی بہرحال ہوسکتی ہے اور اُس پر شریعت کی کوئی بات روپوش بھی بہرحال رہ سکتی ہے۔ بلکہ اہل سنت کے ہاں یہ ایک معلوم بات ہے کہ: کبار صحابہؓ تک سے ایسے اقوال یا افعال صادر ہوجانا محال نہیں جو کتاب اور سنت کے ساتھ مطابقت رکھنے میں پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتے ہوں جبکہ اُن صحابہ کے اقوال کے مقابلہ میں کچھ دیگر صحابہ کے اقوال ہی حق کے موافق تر ہوں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں، لوگ یہاں ''اپنے'' ائمہ کے اقوال کو اُسی اطلاق اور اُسی شدت کے ساتھ واجب اتباع ٹھہرائیں گے جس طرح کہ کتاب وسنت! اتنا ہی نہیں کسی اور کو بھی وہ ''اپنے'' اِن مراجع سے عدولی کرتا ہوا دیکھیں تو برداشت نہ کریں گے؛ اور ہر کسی پر اپنے ہی ائمہ کی اتباع لازم ٹھہرائیں گے۔

واضح سی بات ہے، اہل سنت کے ہاں پائے جانے والے فقہی مذاہب میں سے کوئی بھی فقہی مذہب اپنا لینا برحق ضرور ہے، مگر اُس ایک ہی مذہب کو ہر کسی پر واجب بہرحال نہیں ٹھہرایا جا سکتا؛ دوسروں کو اُنکے اختیار کردہ فقہی مذاہب اور اپروچز (جب تک کہ وہ اہل سنت کے معلوم دائرہ سے باہر نہ جاتے ہوں) پر چھوڑ دینا بھی اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے اختیار کردہ فقہی مذہب یا اپروچ کو اپنا کر رکھنا۔ لیکن یہاں پوری امت پر ''اپنے'' ہی مذہب کو واجب ٹھہرانے کی یہ متعصب اور بندذہن اپروچ دیکھیں... تو یہاں بھی ''فہمِ دین کے مصدر'' کو قریب قریب ''دین کا مصدر'' مانا جارہا ہوتا ہے!

گویا یہ خلط دونوں طرف برابر پایا جاتا ہے: ''دین کا مصدر'' اور ''دین کے فہم کا مصدر''۔

ابھی یہ بات ہم یہاں پر نہیں اٹھا رہے کہ کچھ نہایت بعد کی صدیوں میں جا کر سامنے آنے والے اعتقادی رجحانات جو کہ منہجِ سلف کے ساتھ ایک صاف مغایرت رکھتے تھے (مانند تصوف کے وہ کئی ایک مباحث جو سلف سے ماثور نہیں اور دین کے اندر صاف صاف ایک اضافہ ہیں اور کچھ خطرناک معانی پر مشتمل ہیں، علاوہ ازیں صفاتِ خداوندی کے معاملہ میں اشاعرہ و ماتریدیہ کی جاری کردہ وہ تاویلات جو سلف سے ماثور نہیں)، یہاں کے ایک بڑے طبقے کے یہاں اِس طرح لئے جاتے رہے ہیں گویا یہ اسلام کے عہد اول سے چلے آتے ہیں، یا پھر اس سے بھی زیادہ برحق اور واجبِ اتباع!

ہر قید سے آزاد!

جـ) تیسری طرف ایک الجھی ہوئی ذہنیت ہے۔ یہ قرونِ سلف کو ویسے ہی کسی خاطر میں لانا امورِ دین کے فہم و استنباط کے معاملہ میں اپنے اوپر گراں سمجھتی ہے بلکہ شاید اپنے مرتبہ ومقام سے فروتر۔ اور اس سلسلہ میں سلف کے فہم کی پابندی کو اپنے کھل کھیلنے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ۔ اس 'آزادی' کے باعث، اس طبقہ میں اب ایک سے ایک نیا رجحان آرہا ہے، حتیٰ کہ ایک ہی محقق کی زندگی میں ہر چند سال بعد فکر کا ایک نیاتر ماڈل آجاتا ہے، اور وہ بھی دین کے اچھے خاصے بنیادی قسم کے مسائل کے اندر۔ امت کا فرض ہے کہ ان محققین پر نگاہ مرکوز رکھے کہ کب ان کے سفر میں اچانک کوئی نیا موڑ آجاتا ہے اور کب اصولِ دین کے معاملے میں ان پر یکلخت کوئی نئی دلیل یا کوئی نئی توجیہ منکشف ہوتی ہے تا کہ 'حق' کو 'تسلیم کرتے جانے' میں امت کسی وقت تقصیر نہ کر

بیٹھے...... اور 'دلیل' کے پیچھے چلنے کا عمل (بلکہ صحیح تر الفاظ میں، 'دلیل' کا تعاقب) کسی تعطل یا خلل کا شکار نہ ہو!

اِس فریق کے طرزِ عمل کو دیکھیں تو اِس کے ہاں فہم دین کا 'مرجع' یہ خود ہے اور اس کے اپنے سوا کوئی نہیں۔ یعنی کتاب وسنت اور عقل عام وغیرہ سے ''فہم'' کے جو اصول اور معیار ہمیں یہ نکال کر دے دے گا __ اور جو کہ بجائے خود ایک ''فہم'' ہو گا، اور اِن ('اکیسویں صدی' کے لوگوں) کا فہم ہو گا __ صحابہؓ تک اسی پر پرکھے جائیں گے، خواہ اس کے نتیجے میں صحابہ رضی اللہ عنہم صحیح نکلیں اور خواہ غلط......!

رہی یہ بات کہ **''فہم'' کا معاملہ شروع ہی صحابہؓ سے کیا جائے اور چلا ہی ''وہاں'' سے جائے**، تو اِس پر تو سوچنا بھی شاید اِس طبقہ کیلئے خارج از سوال ہو۔

☆☆☆☆☆

''فہم سلف'' ایسے مباحث کا یہاں پر عام کیا جانا پس ہماری نظر میں یہاں کے ایک گھمبیر اور دیرینہ مسئلے کا حل ہے۔ خصوصاً پہلے دو فریقوں کیلئے، جو کہ اپنے وجود سے یہاں پر اہل سنت وجود کے ایک بڑے حصے کی تشکیل کرتے ہیں اور اِسی ایک مسئلے کے واضح نہ ہونے کے باعث یہاں پر 'دوملتوں' کی صورت منقسم دکھائی دیتے ہیں۔

8

جمود کی کہانی

یہاں برصغیر میں جو جمود پایا گیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ شاہ ولی اللہؒ و مابعد کے محدثینِ دہلی کی محنت سے یہاں بہت سی برف پگھلی، {اور گو ''عقیدہ'' کے اندر اصولِ سلف کے اِحیاء کو اب بھی بہت کم توجہ ملی، } پھر بھی برصغیر کے اس ضرب المثال جمود کی برف پگھلنے کا آغاز بہرحال ہوا۔ جمود کیا تھا؟ ''بعد والوں'' کی بات کو حرفِ آخر جان لینا اور ''پہلوں'' کی بات کو سرے سے اپنے فکر وفہم کی بنیاد نہ بنانا۔ سب سے پہلا حق ''عقیدہ'' کا تھا کہ اس میں ''بعد والوں'' کی جاری کردہ بدعات ''پہلوں'' کے چھوڑے ہوئے صاف شفاف منہج پر پیش کی جاتیں اور حق کی ''تحریر'' ہوتی۔ ''عقیدہ'' ہی وہ میدان تھا جس میں حق اور باطل کا نزاع اٹھانے سے یہاں کا تحریکی عمل خودبخود ایک رخ پاتا اور آپ سے آپ اس کے اندر ایک زور اور بلاخیزی آتی (جس کی ایک بہترین مثال محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک ہے)، نیز وہ دوسرے بہت سارے میدان آپ سے آپ پیچھے چلے جاتے جو کہ 'حق و باطل' کی جنگ کا میدان نہیں، اور نہ مسلمانوں کے یہاں وہ میدانِ کارزار ہو سکتے ہیں، اور نہ کبھی تھے۔ (مانند فقہی مسائل وغیرہ)۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، اصل میدانِ کارزار ــــ یعنی ''عقیدہ'' ــــ جب اِس جدوجہد کا

اصل المیہ

بہت بڑا حصہ نہیں لے سکا تو پھر وہ کئی ایک میدان جو کہ ''کارزار'' کیلئے نہ تھے، اب اِس خلا کو پر کرنے لگے تھے۔ پھر بہت جلد اِس عمل نے 'عوام' کی طرف بھی اپنا رخ کرلیا۔ اِس میں شک نہیں کہ تحقیق کے وہ بہت سے میدان جو شاہ ولی اللہؒ و مابعد کے محدثینِ دہلی و بھوپال وغیرہ کے تجدیدی عمل سے سامنے آئے تھے (شاہ اسماعیلؒ کی ''تقویۃ الایمان'' یا شاہ عبد العزیز کی ''التحفۃ الاثناعشریۃ'' اور اسی طرح کے معدودے چند مصنفات کو اس سے منہا کرتے ہوئے) وہ کوئی لڑنے لڑانے کا میدان نہیں تھے، بلکہ بحث و تحقیق کا میدان تھے۔ ظاہر ہے یہ گرم سرد ہونے کا میدان ہی نہیں۔ اِس کی اپنی طبیعت ہی اِس چیز سے اِباء کرتی ہے۔ یہ وہ جھگڑے ہی نہ تھے جو سڑکوں اور چوراہوں پر لا دھرے جاتے اور ہر آدمی کو اِس میں فریق بن جانے پر آمادہ کیا جاتا۔ یہاں سے؛ برصغیر ایک ایسے عمل کا اکھاڑا بنا جو __ ہماری معلومات کی حد تک __ عالم اسلام کے کسی اور خطے میں اِس بڑی سطح پر نہیں پایا جاتا۔ آج یہاں ہمیں ایک ایسا 'فقہی گھمسان' درپیش ہے جس کی نظیر پوری دنیا میں نہیں ملتی۔

مقصد یہ کہ وہ علمی و تحقیقی روش جو بارھویں صدی ہجری میں ہمارے اِس برصغیر کے اندر رونما ہوئی اور جس نے یہاں پر پایا جانے والا بہت سا جمود توڑا تھا اور جس سے مزید آگے بڑھنے کے کچھ نہایت اچھے راستے ہمیں میسر آئے تھے اور مزید میسر آسکتے تھے......، ''عوام الناس'' کو اُن سے ''مستفید'' کرانے کی یہ صورت بہرحال نہ ہونی چاہیے تھی جو ہمیں تیرھویں صدی ہجری کے وسط سے ''عوامی سطح'' پر نمودار ہونے والی ایک کشمکش کی صورت میں نظر آتی ہے؛ یعنی وسیع سطح کا ایک 'فقہی دنگل' جو یہاں گلی گلی اور محلے محلے میں لڑا جانا تھا؛ اور جس کی بنیاد پر واقعتاً

یہاں 'دوملتیں' بنتی ہوئی صاف نظر آنے لگی تھیں:...... ''مقلد'' اور ''غیر مقلد''!

یہ در اصل ''جمود'' ہی کی دو صورتوں کے مابین ایک جنگ تھی جس نے تیرھویں صدی ہجری کے وسط سے یہ صورت دھار لی تھی؛ اور جس کیلئے ہمارے مسلم برصغیر نے ایک بہت بڑی قیمت دی ہے اور مسلسل دے رہا ہے۔ اسی ''دوگانہ جمود'' کا فائدہ اٹھا کر یہاں پر سیکولر قیادتیں میدان مار لینے میں کامیاب ہوئیں، اِسی 'سنہری موقعہ' کو غنیمت جانتے ہوئے لبرل قیادتیں یہاں کے معاشرتی خدوخال تک کو مسخ کر دینے میں کامیاب ہوئیں اور ابھی تک ہو رہی ہیں.. اور یہیں سے جدت پسندوں کی بھی خوب خوب چاندی ہونے لگی ہے۔ یعنی پورا ایک میدان ہے جو ہمارے ہاتھ سے لے لیا گیا اور اس کے نتیجے میں ہمیں صدیوں کے حساب سے پیچھے دھکیل دیا گیا؛ یہاں تک کہ اب معاشرے میں ہم پائے تک نہیں جاتے......، مگر یہ ''دورویہ جمود'' ہے جو اب بھی ہماری جان بخشی کرنے پر آمادہ نہیں؛ اِس کو اب بھی اپنی ہی ضد پوری کرانی ہے اور اپنی ہی شرطوں پر 'دنیا' فتح کرنی ہے! زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے اور ہمارے دین، ہمارے عقیدے اور ہماری تہذیب کو 'نقش کہن' کی طرح مٹا دینے کے منصوبے میدان میں ہیں جن پر دنیا بھر کے شیطان مصروف عمل ہیں، مگر ہماری یہ دنیا اب بھی 'مقلد و غیر مقلد' ہی کی بنیاد پر تقسیم ہوتی ہے! یہ دوطرفہ جمود اب بھی ہم پر رحم کھانے کا دور دور تک کوئی ارادہ نہیں رکھتا!

صورتحال نے آگے چل کر جو بھی خطرناک موڑ مڑے، وہ پہلا جمود جو یہاں برصغیر میں پایا گیا تھا اور ابھی تک جوں کا توں ہے، ابتداءً اِس کا سبب بنا۔

☆☆☆☆☆

جمود اور اس کے رد عمل میں بھی جمود!

''جمود'' جب ایک لڑائی بھڑائی کی صورت دھارتا ہے تو ''ردِّعمل در ردِّعمل'' کے ایک تسلسل کو جنم دیتا ہے اور جو کہ رفتہ رفتہ انتہا پسندی کی طرف بڑھتا ہے.. یہ وہ چیز تھی جو بالآخر طرفین کیلئے باعث پریشانی بھی ثابت ہوئی......

طرفین کی کھینچا تانی سے جو ایک مومنٹم بنا...... لازم تھا کہ یہاں پر چھوٹی چھوٹی جماعتوں سے تشکیل پانے والا وہ فنامنا بھی سامنے آتا جو اپنی ذات میں ایک جہان ہوتی ہیں اور جن کی خود اپنے سوا نہ کسی کے پیچھے نماز ہوتی ہے اور نہ ایمانی اشتراک کا کوئی اور اجتماعی مظہر۔ یہ فنامنا ہر طرف پایا گیا، مگر اِس کا زیادہ رخ اس سائڈ پر رہا جہاں قرآن اور حدیث کو 'خود' سمجھنے کی ایک طرح ڈال دی گئی تھی۔ ایک ایک مسئلہ پر ایک ایک جماعت: کہیں عذابِ قبر پر ایمان رکھنے کو ''شرک'' کا موجب ٹھہرانا۔ کہیں جنات کا انکار۔ کہیں کرامات کا انکار۔ کہیں جادو کی تاثیر مان لینے کو ''شرک'' ٹھہراتے پھرنا۔ کہیں سماعِ موتیٰ کو ''شرک'' قرار دینا۔ کہیں محض اپنے آپ کو 'جماعت المسلمین' سمجھنے کا تصور۔ کہیں 'بیعت' اور 'امارت' کی مضحکہ خیز تفسیر مع بیہودہ تطبیقات۔ کہیں فوت شدہ علمائے اسلام میں سے 'کافر' قرار پانے والوں کی فہرست جاری کرنے کا 'اصلاحی و دعوتی ماڈل'۔ کہیں نزولِ مسیح کا انکار۔ کہیں احادیثِ مہدی کا رد۔ کہیں ''دجال'' کی بابت نئی نئی تفسیرات و انکشافات۔ کہیں جدت پسندوں کے ہاتھوں دین کی ایک تعبیرِ نو، بلکہ دین کا مسخ۔ غرض کوئی ''مقیاس'' تو رہ ہی نہیں گیا تھا؛ ہر شخص قرآن اور حدیث کو خود اپنی تحقیق کر کے سمجھے گا اور اس کے نتیجے میں چاہے پھر وہ جہاں بھی پہنچے! قرآن اور حدیث کے 'بے انتہا واضح ہونے' کا ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاں یہی مطلب تھا کہ آدمی ان کو خود سمجھ سکتا ہے! جس

کیلئے سوائے عربی زبان کے (بلکہ شاید تراجمِ کتب کے) یا کچھ تھوڑا بہت 'ذاتی مطالعہ' کر لینے کے وہ کسی چیز پر انحصار کا پابند نہیں! اب جو اس کو سمجھ آئے اس کو حق ماننے کا بھی وہ اپنے اس اندازِ فکر کی رو سے خود بخود پابند ہوتا ہے! نہ صرف یہ بلکہ دوسرے اس قرآن اور حدیث کو اس سے مختلف انداز میں سمجھیں تو اُن کو ''غلط'' جاننے کا بھی اپنے آپ کو پابند جانتا ہے!

چنانچہ جلد ہی یہاں پر وہ رو چلی کہ: ہر شخص قرآن و حدیث کو خود سمجھنے کا جس قدر مکلّف ہے اپنے سے مختلف قرآن و حدیث سمجھنے والوں کو ''غلط'' جاننے کا بھی اُسی قدر مکلّف ہے! بھلا ایسا نزاع کب ختم ہوسکتا ہے جو خود 'دین' ہی نے فرض کر رکھا ہو!

اور یہ تو سوچنا بھی ضروری نہ رہ گیا تھا کہ: کیا سب لوگ قرآن اور حدیث کو ایک ہی طرح سمجھ سکتے ہیں؟ کہ جب بھی ان کے سمجھنے میں فرق آئے ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہو؟؟؟ بلکہ درست مراجع اور صحیح ضوابط نہ ہوں تو کیا قرآن اور حدیث کو سرے سے سمجھ بھی سکتے ہیں؟؟؟ الا یہ کہ ایک چیز کا 'آپ کو حق ہے اور دوسرے کو نہیں'! یعنی عین وہ چیز جو ایک کبھی نہ ختم ہونے والے تنازعہ کی جڑ ہوا کرتی ہے! ایک چیز آپ کیلئے جائز ہے تو دوسرے کیلئے ناجائز کیوں؟ اور اس بات کی آخر کیا ضمانت ہے کہ قرآن اور حدیث سے اپنے تئیں آپ نے یا آپ کی جماعت نے جو سمجھا وہ ضرور ہی درست ہے اور دوسرے نے یا اس کی جماعت نے جو سمجھا وہ ضرور ہی غلط ہے؟ معاملہ اگر اس کے برعکس ہو تو!!؟

مگر یہ سوچنے ضرورت کیا تھی: اسلام کا کونسا کام تھا جو یہاں رکا ہوا تھا، سوائے اس کے کہ ہر شخص یہاں پر ایک نئے سرے سے ''اسلام'' کو سمجھ کر دے؟!

9

استشراق کی سوغات
'مطلق رواداری'!

جمود اور تنگ نظری کی بعض تصویریں پچھلی فصل میں آپ دیکھ آئے۔ البتہ یہاں کی 'وسیع النظری' کو دیکھیں تو وہ اس سے بھی زیادہ آشوب ناک ہے۔ یہاں؛ زیادہ تر استشراق کے دیے ہوئے لہجے بولتے ہیں جن کو صحابہؓ کے اُس ٹھیٹ انداز کے ساتھ جو وہ حق کے ساتھ تمسک اور باطل سے بیزاری کے معاملہ میں اختیار فرما کر رکھتے تھے، دور نزدیک کا کوئی واسطہ نہیں۔

'مطالعۂ اسلام' کے اِس نئے اپروچ کو زیادہ تر دانشور طبقہ کے ہاں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ میڈیا اس چیز کی تبلیغ کا موثر ترین فورم ہے۔ تعلیمی نصاب اِس انداز کے فہم اسلام کو نہ صرف فروغ دے رہے ہیں بلکہ ڈیڑھ سو سال پہلے باقاعدہ اِس کو وجود میں لائے ہیں۔

اس طرز فکر کا لب لباب یہ ہے کہ ہر آدمی اور ہر طبقے کو دین کی تفسیر کے معاملے میں اپنی رائے رکھنے کی کھلی چھٹی ہو۔ اختلاف رائے کی قطعی آزادی ہو۔ 'اختلافِ رائے' کا یہ حق لوگوں کو ''اصولِ دین'' کے اندر بھی اتنا ہی ہو جتنا کہ 'فروعِ دین' کے اندر! بس کسی کو اس کے نظریہ یا عقیدہ کی بنا پر غلط نہ کہا جائے! 'مخالفت' کسی کی نہیں ہونی چاہیے! ہر معاملہ میں آدمی زیادہ سے زیادہ بس ایک 'علمی' اور

'تحقیقی' نوعیت کا اور ایک 'رواداری' سا اختلاف کرسکتا ہے اور اختلاف کے وہ سب آداب جو اہلسنت کے ہاں 'فروعِ دین' کے اندر ملحوظ رکھے جاتے ہیں وہ ان حضرات کے نزدیک ''اصولِ دین'' کے معاملہ میں بھی فرض ہیں! کسی کو باطل پر جاننا اور گمراہی کا پیروکار ماننا ان کے نزدیک ایک پسماندہ اور غیر علمی رویہ ہے خواہ وہ دین کا کتنا ہی بنیادی مسئلہ کیوں نہ ہو! 'جذبات' میں آنا، کسی بھی معاملہ میں، ان اصحاب کے نزدیک حد درجہ معیوب ہے۔ کوئی رافضی ہے اور اپنے اماموں کی عصمت کا معتقد ہے۔ دوسری طرف صحابہ کیلئے ایک لفظ اچھا بولنے تک کا روادار نہیں (یہ ظاہر کا معاملہ ہے، سینے میں جو چھپائے بیٹھا ہے وہ تو صرف خدا کو معلوم ہے) اور بخاری ومسلم سے لے کر محدثینِ سنت کی مروی کسی ایک بھی ایسی حدیث کو قابل اعتنا نہیں جانتا جس میں عائشہؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ، انس بن مالکؓ اور ام سلمہؓ وغیرہ ایسے نام آتے ہوں، الا یہ کہ اس کی تائید اس کے نزدیک ائمہ معصومین سے ہوتی ہو ...... تو بھی اس پر تشنیع جائز نہیں۔ آپ مصر ہی ہیں تو اس سے ایک 'دوستانہ' اور 'محققانہ' اختلاف کر لیجئے اور خود اپنی رائے ضرور اس سے مختلف رکھیے مگر 'الجھنے' کی ضرورت نہیں! ایسے اختلافات کے باوجود باہم مل کر اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اُمت کی وحدت اور یکجہتی کا پروگرام سرے چڑھایا جا سکتا ہے! کوئی شخص شرک کا داعی ہے۔ وحدۃ الوجود کا مبلغ ہے۔ کوئی شریعت کو طریقت سے الگ کر دینے پر اعتقاد رکھتا ہے۔ کوئی معتزلہ کا پیروکار، وحی کو اپنی عقل کی سان پر کستا ہے۔ کوئی دین کو سیاست سے جدا کرتا ہے اور خدا کو صرف 'مذہبی معاملات' میں معبود مانتا ہے ...... ان سب رجحانات کے ساتھ آپ زیادہ سے زیادہ 'اختلاف' رائے رکھیے۔ اس کو 'نقطہ نظر' کا فرق سمجھئے البتہ ایسے

کسی معاملہ میں ''جہنم'' اور ''ہلاکت'' کی وعید سے کسی کی سمع خراشی کرنا ایک غیر علمی طرز عمل سمجھا جانا چاہیے اور وحدتِ اُمت کے منافی!!!

پس یہ ایک دوسری انتہا ہے۔ مختلف طبقے مختلف انداز سے اس اپروچ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ دانشور اس حد کو چھونے میں اپنا انداز رکھتے ہیں۔ سماجی کارکن اپنا اسلوب رکھتے ہیں۔ میڈیا اپنی وجوہات رکھتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول بعض مذہبی جماعتوں کے ہاں اس کی کچھ اور بنیاد ہے۔ البتہ خلاصہ اس انداز فکر کا یہی بنتا ہے۔ اس کی رو سے 'وحدت اُمت' کیلئے دائرہ اتنا ہی وسیع کر دینا چاہئے جتنا کہ کسی دور کے اندر اسلام کے نام لیوا طبقوں کے ہاں پائی جانے والی گمراہیاں تقاضا کریں! انحرافات اور گمراہیوں کو باہر نکالنے کی کیا ضرورت ہے آپ وحدت اُمت کا دائرہ ہی اتنا کھلا کر لیجئے کہ ہر چیز اس میں آپ سے آپ آ جائے اور کسی کو کسی کے سر آنے کی احتیاج ہی باقی نہ رہے! یہاں سب خوش رہیں اور اپنی اپنی سنائیں، آخر اس میں کیا مانع ہے!!!

چنانچہ یہ منہج جو کہ ''اساسیاتِ دین'' تک میں ہونے والے اختلاف پر 'مٹی ڈالنے' اور اس کو نظر انداز کروانے کی تلقین پر مبنی ہے، معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کے ہاں اس وقت خوب پذیرائی پا رہا ہے۔

دین اور عقیدہ کی بنیادوں کے اندر ہونے والا اختلاف شدید مہلک ہے۔ اس کو کسی صورت مسلم معاشرے میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ کم از کم بھی یہ ہے کہ ایک گمراہی کو صاف گمراہی کہا جائے۔ معاشرے میں اس کی شدید حوصلہ شکنی اور مذمت ہو اور اس کے پرچار کے صاف صاف آڑے آیا جائے۔ گمراہی کا شکار ہو جانے والے کسی شخص کو گمراہ کہنے سے اجتناب مصلحت کا تقاضا ہے تو ضرور اس سے

اجتناب کریں البتہ یہ کہ گمراہی کو گمراہی ہی نہ کہا جائے، یہ ناقابل تصور ہے۔ انحراف کی بیخ کنی ہی معاشرے میں موقوف ٹھہرا دی جائے اور یوں مسلم معاشرے میں باطل کا چلن ہو لینے دیا جائے...... یہ بہرحال روا نہیں۔

دین کی کچھ اصولی و بنیادی اشیاء میں جو انحرافات در آئے ہیں اُن کے ساتھ محض اس وجہ سے رواداری برتنا کہ لوگوں کی ایک تعداد اب ان کی معتقد ہے، ہرگز کوئی علمی رویہ نہیں۔ باطل عقائد و افکار کا یہ کالا دھن کثیر اور بے قابو ہو جانے کے باعث سفید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کوئی 'انتظامی' معاملہ نہیں؛ مسئلہ خدا کے دین کا ہے۔ شریعت کے ثابت اور معلوم حقائق پر ثبات اختیار کرنا مسلم معاشرے کی پہچان ہے۔ 'رواداری' کا یہ جدید تصور ہماری اِس تاریخی پہچان کو ختم کروا دیتا ہے؛ اور اس کو اختیار کر کے ہم خدائی نصرت کا استحقاق کھو دیتے ہیں؛ جبکہ قرآن میں اہل ایمان کو ایسے کسی 'ریکونسائل' کا شکار ہوجانے سے بار بار متنبہ کیا جاتا ہے۔ (1) اس کو علمی رویہ تسلیم کرنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ پر ایمان رکھنے والوں کے حق میں قطعی طور پر ایک غیر علمی رویہ ہے۔

یہ رویہ...... یعنی ''اصولِ دین'' میں اختلاف کو برداشت کرنا۔ مثلاً ایک غیر نبی کی عصمت، یا صحابہ یا اہل بیت کی تحقیر کے معاملہ کو، یا شرک و زندقہ کے نظریاتی و عملی رجحانات کے معاملہ کو، یا وحی کو عقل اور فلسفہ کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے معاملہ کو، یا عبادتِ قبور یا کسی بھی اور گمراہی کو آدمی کا ایک 'اندازِ بے پروائی' سے لینا اور ان امور میں 'غیر جانبداری' کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس 'اپنے کام سے کام' رکھنا...... ایسا منہج رکھنے کو ایک علمی اور معقول رویہ ماننا مستشرقین کے ہاں روا ہو تو بات سمجھ آتی ہے۔ اُنکو صرف افکارِ مشرق کا مطالعہ کرنا تھا۔ کیا حق ہے اور کیا باطل، کس چیز پر آدمی

کو وسعت صدر کا مظاہرہ کرنا ہے اور کس چیز پر آدمی کی غیرت کو جوش میں آجانا ہے، مستشرقین کو اس سے واقعی کچھ سروکار نہ ہونا چاہیے۔ مگر یہی رویہ قرآن پڑھنے والے معاشرے کی فکری قیادت کے ہاں بھی قابل قبول ہو بلکہ قابل فخر ہو اور اسی کو ایک علمی اندازِ فکر بھی باور کیا جائے، تو یہ بات یقیناً مسترد ہونے کے لائق ہے۔

مگر واقعہ کیا ہے؟ ہماری یہ یونیورسٹیاں جو ہمارے مسلم دانشوروں کی مادر ہائے علمی رہی ہیں کس کے زیر سرپرستی اور کس کے زیرانتظام پروان چڑھیں؟ کس کے دیے ہوئے نقشے پر ان علمی اداروں کی اٹھان ہوئی ہے؟ 'مستشرقین' کے سوا اس کے جواب میں آپ کس کا نام لے سکتے ہیں؟ سب جانتے ہیں عالم اسلام پر قبضہ سے بہت پہلے استشراق کا شعبہ مغرب میں اپنے مطلوبہ حجم اور استعداد کو پہنچ چکا تھا۔ یورپ کی فوجوں کے حرکت میں آنے سے بہت پہلے یورپ کے مستشرقین اپنے حصے کا کام کر چکے تھے اور اب وہ لوگ عالم اسلام کو صرف 'فزکس کیمسٹری' نہیں بلکہ 'اسلامیات' تک پڑھانے پر دسترس رکھتے تھے! اب وہ 'اسلامیات' جو ہم نے مستشرقین سے پڑھی اور آگے مستشرقین کے ولایت پلٹ تلامذہ سے اور پھر ان کے پڑھائے ہوؤں سے نسل در نسل پڑھی۔ اسی نے بڑی حد تک ہمارے یہاں کے 'جدید' دینی طبقہ کی ذہنی تشکیل کی۔ ابتدائی طور پر یہاں کے کورس اور تعلیمی سلسلے وضع ہوئے، حتیٰ کہ دینِ اسلام کے 'مطالعہ' کا ایک پورا منہج دیا گیا، تو وہ انہی کے ہاتھوں، یعنی مستشرقین کے ہاتھوں۔ اسکے بعد پھر جتنے بھی تعلیمی ادارے اور منصوبے اپنے یہاں بنے انکی تہہ میں بڑی حد تک وہی ذہنیت اور وہی ڈھب کام کرتا رہا اور آج تک کر رہا ہے۔ پھر کیا تعجب کہ استشراق کے دیے ہوئے بعض فیشن شعوری طور پر نہ بھی سہی لاشعوری طور پر ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور دانشور اسلام پسند طبقہ کے ذہنی پس منظر میں کام کریں!

آگہی کا 'مصدر' source of inspiration انسان کے ذہن کی تشکیل کرنے میں بہرحال ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے جان چھڑانا ہرگز اتنا آسان نہیں۔ دین کو محدثین اور فقہاء وائمۂ اہلسنت سے پڑھنا اور دین کو مستشرقین سے یا مستشرقین کے ترتیب دیے ہوئے سلسلہ ہائے تعلیم سے پڑھنا شدید حد تک متضاد نتائج کے پیدا کرنے کا باعث ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات؟ استثنائی صورتوں کا پایا جانا ہر جگہ ممکن ہے مگر ایک سلسلۂ تعلیم اور ایک مصدرِ دانش source of inspiration کی مسلمہ حیثیت کچھ استثنائی صورتوں کے باعث مشکوک نہیں ہو جاتی۔

آج کا یونیورسٹی سے لے کر کالج اور اسکول تک پایا جانے والا جو ایک فنامنا ہے وہ اپنی پشت پر کچھ متعین اسباب اور ایک معلوم پس منظر رکھتا ہے۔ اس سے صرفِ نظر آپ یوں بیٹھے بٹھائے کس طرح کر سکتے ہیں؟ کوئی اسلامیات 'لازمی' پڑھے یا 'اختیاری' ...... 'مطالعۂ اسلام' کی یہاں جو ایک اپروچ ہے اور 'مذہب' کو پڑھنے کی یہاں جو ایک جہت اور ایک انداز ہے وہ بہرحال کچھ تاریخی اسباب کی مرہون منت ہے۔ نصابوں کے اندر کچھ تھوڑی بہت تبدیلیاں کر بھی لی جاتی رہی ہوں، مگر اپروچ اور جہت کو تبدیل کرنے پر یہاں کون کھپا ہے؟!

سکولوں یونیورسٹیوں میں 'اسلامیات' پڑھی اور پڑھائی جانا یقیناً مستحسن ہے مگر وہ ذہنیت جو دین کے حقائق کا علم لینے کے پیچھے یہاں اس نظام میں کارفرما ہے وہ بلاشبہ جاہلیت کی تشکیل کردہ ہے۔ اسکے بارے میں کم ازکم بھی یہ کہا جائیگا کہ ایک دیندار شخص تک کے حق میں یہ شدید آلودہ ہے۔ بہت تھوڑی استثناءات کو چھوڑ دیجئے تو عملاً یہاں 'اسلامیات' کا ہر طالب علم 'مطالعہ اسلام' کے اسی نظام کا ہی بڑی حد تک ایک تسلسل ہے جس کی یہاں کوئی ڈیڑھ دو سو سال پہلے بڑی سوچ سمجھ کر داغ بیل ڈالی گئی تھی۔

پس یہ سوال کہ آپ نے اسلام کا فہم کہاں سے لیا ہے، ایک بہت بنیادی سوال ہے۔ اسلام کچھ معلومات کا نام نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو سب سے پہلے دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور انسان کو خدا کے حق کیلئے پوری دنیا کے مدمقابل کھڑا ہو جانے پر تیار کر دیتی ہے اور جس کی زد پھر انسان کے ہر ہر رشتے اور ہر ہر تعلق پر پڑ سکتی ہے۔ دین کا ہر معاملہ ایک 'دوستانہ اور برادرانہ اختلاف رائے' کا متحمل نہیں۔ الا یہ کہ دین محض 'معلومات' کا نام ہو یا زیادہ سے زیادہ بس حسنِ اخلاق کا ایک بے ضرر درس۔ نہ کہ 'لاَ' سے شروع ہونے والی ایک واضح اور دوٹوک اور متعین حقیقت جس کیلئے انبیاء جہاد بھی کرتے رہے اور قتال بھی اور ہجرت بھی۔ دوستی بھی اور دشمنی بھی اور جس کو ہر تغیر سے بچا رکھنے کیلئے صحابہ وتابعین نے اہل بدعت وانحراف اور اہل زیغ وضلال کے ساتھ درشت ترین رویہ اپنا لینے سے گریز نہ کیا۔

☆☆☆☆☆

(حاشیہ ۱)

وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (المائدۃ:۴۹)

''ان سے ہوشیار رہیے کہ اللہ نے آپ پر جو اتارا اس کے کسی ایک حصہ سے بھی یہ آپ کو منحرف نہ کرنے پائیں''۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَلِيٍّ وَلاَ نَصِيرٍ (البقرہ:۱۲۰)

''اور اگر علم آنے کے بعد تو ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ سے تیرا حمایتی اور بچانے والا کوئی نہیں ہے''۔

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ (القلم:۹)

''یہ چاہتے ہیں کہ تو مداہنت اختیار کرلے تو یہ بھی مداہنت اختیار کرلیں''

10

ایک بے قابو مجمع!

جس امت کو ایک بڑی سطح پر داخلی یکسوئی حاصل نہ ہو وہ اپنے دشمن کے مدمقابل کونسا معرکہ سرانجام دے سکتی ہے؟

غور طلب بات یہ ہے کہ دشمن کے مدمقابل ہمارا جو اصل ہتھیار تھا وہ ہمارا فکروعقیدہ ہی تھا اور ہمارے دین کے بنیادی تصورات؛ کہ جن کا دشمن کے پاس کوئی توڑنہیں۔ برتری قائم رکھنے کے معاملہ میں یہی ہمارا اصل میدان تھا اوراسی میں ہم دشمن کو بآسانی مات دے سکتے تھے۔مگر یہی میدان ہمارا آپس کا کارزار بنے تو دشمن کے مدمقابل ہم کس کام کے! یہی وجہ ہے کہ پچھلی دوصدیوں میں کسی بڑی سطح پر ہم نے کچھ محنت اور ہمت کرکے دشمن کے خلاف بندوق اٹھائی ہوتو اٹھائی ہومگر فکر و نظریہ کے ہتھیار کسی بڑی سطح پر استعمال نہ کر سکے۔ جبکہ معاملہ کیا ہے؟ دشمن اپنے وجود کے لحاظ سے ہم سے دور ہوتو ہومگر اپنے فکر ونظریہ کے لحاظ سے وہ ہمارے اندر بیٹھا ہے بلکہ ہماری جڑوں میں بیٹھا ہے۔ ایک فکری ونظریاتی یکسوئی اس لحاظ سے ہماری سب سے پہلی ضرورت تھی مگر ہم اس سے روز بروز دور ہو رہے ہیں اور اس بات پر ہی مصر، کہ یہ معرکہ زیادہ سے زیادہ کوئی بندوق اورتوپ کا معرکہ ہے۔

☆☆☆☆☆

اتفاق اور اختلاف کے ضوابط اس لحاظ سے ہماری ایک بنیادی ضرورت ہے۔ دین کے فہم کی بابت ایک ایسی بنیاد جو درست بھی ہو اور امت کے ایک معتدبہٖ طبقے کے مابین مشترک بھی، اس کو اپنی سب سے پہلی ضرورت کہیں تو شاید غلط نہ ہو۔

☆☆☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے یہ دین نازل کیا تو 'افراد' کیلئے نازل نہیں کیا۔ یہ دین 'جماعتوں' کیلئے نازل نہیں ہوا۔ یہ ایک ''امت'' کو بنانے اور ایک ''امت'' کو چلانے کیلئے اترا ہے...... اور اسکا یہی قد کاٹھ ذہن میں رہنا اور اسکا یہی مرتبہ دلوں میں جانشین کرایا جانا ضروری ہے۔

'جلتے بجھتے' سلسلے

یہاں ایک آدمی اٹھے۔ وہ اپنا 'حاصلِ مطالعہ' لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ 'گہرے غور وخوض' کے بعد وہ اسلام کی ایک تعبیر متعارف کرائے۔ 'کتاب وسنت' سے اس کے ثبوت دے۔ کچھ لوگوں کو وہ 'ثبوت' نظر آئیں اور وہ اس کے ساتھ ہو لیں اور اس کی دعوت کو کتاب اور سنت کا تقاضا سمجھیں۔ کچھ کو وہ ثبوت نظر نہ آئیں اور وہ اس کو رد کر دیں اور باطل پر سمجھیں۔ یہ اپنے اس فہمِ اسلام کو لوگوں سے منواتا اور اس کے ثبوت دیتا اور لوگوں کو اور اطراف سے توڑ توڑ کر اپنے ساتھ شامل کرتا دنیا سے رخصت ہو جائے اور پسماندگان کو ''مشن جاری رکھنے'' کی وصیت کر جائے۔ کچھ اس کو جاری رکھ پائیں اور کچھ ہمت چھوڑ جائیں اور کچھ ذرا عرصہ بعد کسی اور 'زندہ' دعوت میں حق کے ثبوت دیکھنے لگیں...... عالم اسلام کے ہر خطے اور ہر علاقے میں سینکڑوں کے حساب سے بیک وقت ایسے 'سلسلے' چلیں اور ہر لمحہ یہ چراغ جلتے اور بجھتے رہیں...... غرض امت کے اندر توڑ پھوڑ کا یہ عمل مسلسل اور پورے اخلاص کے ساتھ جاری

رہے اور بالآخر کوئی 'جماعت' بھی 'امت' کو فتح نہ کر سکے، گو ہر جماعت ہی اس تاک میں ہو اور نیک نیتی کے ساتھ امت کا بھلا کرنے کی یہی ایک صورت جانتی ہو......تو 'دین کے کام' یا 'دین کی دعوت اور تفہیم' یا 'دین کے قیام' کا یہ تصور اسلام کی فطرت سے بالکل ہی بیگانہ ہے۔ اس کی ضرر رسانی کے عملی شواہد بھی اب دیکھنے ہوں تو جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

کسی روزنامہ یا کسی جریدہ میں کوئی شخص دِین کے کسی موضوع پر 'اظہار خیال' کرتا ہے۔ کچھ حوالے قرآن اور حدیث کے دے لینا بھلا کیا مشکل ہے۔ اِس شخص کا اپنا مبلغ علم، خدا معلوم۔ ہوسکتا ہے محض تراجم پر انحصار کیا گیا ہو یا حتی کہ 'اُردو بازار' سے کسی بھی اچھے چھاپے کی کوئی کتاب اُٹھا کر حوالہ دے لیا گیا ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ مضمون ذرا انداز سے باندھا گیا ہو۔ اسلوب دلچسپ ہو اور 'خیال' نیا ہو اور اس باب میں بعض 'روایتی خیالات' کو جابجا غلط اور فرسودہ ٹھہرایا گیا ہو۔ لیجئے ایک 'تحقیق' حاضر ہے۔ اس پر جوابی تبصروں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلے اور کئی دیگر پرچوں اور جریدوں کے صفحات کھل جائیں تو ہرگز تعجب نہ کیجئے۔ مضمون میں اگر ایک خیال پیش کیا گیا تھا تو اس پر جتنے تبصرے اور اعتراض اور جواب آئیں گے اتنے ہی خیال اس موضوع پر تب آپ کے پڑھنے کو دستیاب ہوں گے۔ خود صاحبِ مضمون جواب در جواب جو مزید خیال پیش کریں گے وہ اس پر مستزاد۔ کہاں رکا جائے؟ (ویسے رکنے کی کیا ضرورت ہے!) کہاں ٹھہرا جائے؟ کہاں پہنچا جائے؟ جہاں اخبار اس سلسلہ کو مزید جاری رکھنے اور مزید کسی مضمون کو شائع کرنے سے معذرت کر لے! اس کے بعد آپ کی انفرادی اور شخصی 'تحقیق' ہے اور اس کی کوئی حد نہیں!!!

بہت سے لوگ اُردو اور انگریزی کتب پر مشتمل اپنی ذاتی لائبریری میں بیٹھ کر (زیادہ تر ریٹائرمنٹ کی عمر میں!) دِین کے بہت سے اہم اور بنیادی اُمور پر بڑے آرام سے نہ صرف 'تحقیق' کر لیتے ہیں بلکہ اپنی اس تحقیق کے پرچار میں بھی مصروف دیکھے جاتے ہیں! علماء تک کو ان موضوعات پر غلط ٹھہرانے اور خاموش کرانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور کسی کسی وقت تو ان موضوعات پر تالیف کیلئے طبع آزمائی تک نوبت آتی ہے!

یہ درحقیقت ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ایسے میں آپ چلیں گے بہت اور پہنچیں گے کہیں نہیں۔ سرگردانی اسی کو کہتے ہیں! اس دین کی حقیقت، اس کی فطرت اور اس کا مزاج یقیناً اس سے کہیں برگزیدہ ہے کہ اس کے ساتھ یوں تعامل کیا جائے۔

ضروری ہے کہ دین کے فہم کی بابت کچھ ایسے مستند مراجع اختیار کئے جائیں جو نہ صرف صحیح ہوں بلکہ وہ ''امت'' کی سطح کے ہوں۔ صرف ایک 'فرد' یا ایک 'جماعت' کو کام دینے والے نہ ہوں؛ بلکہ ایک فرد یا ایک جماعت اپنی بات چھوڑ کر اور اپنے فہم واستدلال سے دستبردار ہو کر ''امت'' کے فہم پر آنے کا پابند ہو؛ وہ ''امت'' جو صحابہؓ کے وقت سے ہے! ان کو اپنا کر ایک جماعت ''امت'' کی سطح پر آئے نہ کہ امت کو 'جماعت' کی سطح پر لانے کی کوشش کرے۔ ایک بڑی چیز اپنے سے چھوٹی چیز میں فٹ نہیں ہوسکتی۔ یہ کوشش درحقیقت عبث ہے۔ بڑا ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ جس طرح ایک فرد سے اس کا اپنا آپ 'جماعت' میں گم کرایا جاتا ہے اور اس کو اس بات کے بے پناہ فضائل بتائے جاتے ہیں ویسے ہی اور اتنے ہی اخلاص کے ساتھ 'جماعت' اپنا آپ ''امت'' میں گم کر دے۔ اس عمل کے جہاں اور بہت سے

تقاضے ہیں وہاں فہم دین کیلئے کچھ ایسے مراجع کا اختیار کیا جانا بھی جو بیک وقت مستند بھی ہوں اور مشترک بھی، از حد مطلوب ہے اور ''امت'' بننے اور بنانے کا ایک لازمی تقاضا۔

☆☆☆☆☆

جب بھگدڑ مچی ہو

ایک مجمع جہاں بہت سارے لوگ اپنی اپنی سناتے اور بیک وقت بولتے ہوں، کسی مثبت سمت میں حرکت نہیں کر سکتا۔ اس میں موجود چھوٹی چھوٹی 'ٹولیاں' اپنے اپنے انداز سے جو طریق اپنائیں گی بے شک اپنے حساب سے کسی ٹولی کا عمل کتنا ہی 'منظّم' کیوں نہ ہو مگر 'مجمع' کے لحاظ سے اس کو ایک بے ہنگم عمل ہی کہا جائے گا۔ ایسے مجمع کو اگر کوئی افتاد پڑے تو وہ اپنی اس ہیئت ترکیبی کے باعث بھاری نقصان اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

فی الوقت، اپنا یہ نقصان ہم بڑی محنت اور تن دہی کے ساتھ کرا رہے ہیں!

کسی مجمع کو شامتِ اعمال سے اگر ایسی صورت پیش آ چکی ہے (اور جو کہ ہماری اِس حالیہ صورتحال میں صدیوں کی کوتاہی کا نتیجہ ہے)، اس میں اگر کچھ سمجھدار ہیں تو بھی مجمع کا کچھ نہ کچھ نقصان ہو جانا تو بہرحال یقینی ہے۔ آپ کچھ کر سکتے ہیں تو یہ کہ اس 'نقصان' کا عرصہ دراز ہو جانے کی راہ میں پوری سنجیدگی سے حائل ہوں اور معاملے کو ___ رفتہ رفتہ ___ بہتری کی جانب لانے کیلئے کوشاں ہو جائیں۔ جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کوئی ایسی چیز سامنے لائیں جس کی جانب ہر فرد اور گروہ کا رجوع کر لینا ایک معقول ترین بات ہو؛ جو کہ ظاہر ہے آپ کی 'اپنی بات' یا 'اپنا ایجنڈا' نہیں ہونا چاہیے ورنہ آپ بھی ٹولیوں میں سے ایک ٹولی ہوں گے اور عین وہی کام کر رہے ہونگے جو 'اپنی اپنی جانب' دعوت دے کر مجمع کو بے ہنگم

رکھنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ آپ کی 'اپنی تفسیر' اور 'اپنا فہم' نہیں ہونا چاہیے جس کا کہ اصولاً سب کو ہی برابر حق ہے۔ یہ آپ کی 'اپنی بات' سے بلندتر کوئی چیز ہونی چاہیے جس پر سب لوگوں سے اتفاق کر لینے کا تقاضا کرنا واقعتاً ایک معقول تقاضا کہلا سکے۔ جس کے ماننے اور منوانے میں کوئی فاتح اور مفتوح نہ ہو۔ کوئی بڑا اور چھوٹا نہ ہو۔ پھر یہ کہ...... لوگوں کو اپنی سمجھ پر چلنے کیلئے اس میں ایک حد تک آزاد بھی چھوڑا گیا ہو؛ **یعنی اس کے اندر ''وحدت'' اور ''تنوع'' ہر دو کی بابت ایک بہترین اور مستندترین راہنمائی ہو۔** گو لوگوں کا آپ کی اس بات کو سمجھ لینا اور مان لینا پھر بھی ضروری نہیں؛ کیونکہ لوگوں کے مان لینے کا تعلق خود لوگوں سے ہے اور اس بات سے ہے کہ خدا کو ان کی بھلائی کہاں تک اور کب تک منظور ہے۔ البتہ ایک ایسا تقاضا جو بیک وقت درست بھی ہو اور سب کو ایک مشترک بنیاد پر بھی لا سکتا ہو اور جس میں کسی ایک کی جیت اور دوسرے کی ہار نہ ہو اور جو کہ لوگوں کو اس بحران سے نکال لانے اور کامیابی کی جانب گامزن کر دینے کیلئے بالفعل لازم ہو، اُن کے سامنے رکھ دینا اور اس پر ان کو قائل کرنے کیلئے آخری حد تک جان کھپا دینا بہرحال لازم ہے۔ خدا کو اگر منظور ہوا.. اور جب منظور ہوا.. لوگوں کی ایک معقول تعداد کو وہ بات سمجھنے اور تسلیم کرنے کی توفیق مل جائے گی جو 'مجمع' کو بالآخر اُس بھگدڑ اور اُس بحران سے باہر لے آسکے؛ یعنی جو اُس بحران سے باہر لانے کی امکانی Potential صلاحیت رکھتی ہو۔ خدا کو منظور نہ ہو گا یا جب تک منظور نہ ہوگا تب تک افراتفری کی یہ صورتحال بہرکیف باقی رہے گی۔

صورتحال کو بالفعل بدل دینے کی ضمانت پس خدا کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ کسی انسان کے ہاتھوں نتائج کی یقین دہانی بہرحال نہیں کرائی جا سکتی...... البتہ

اجتماع کا وہ درست طرز عمل اختیار کرنا جو ''اصول اہلسنت'' ہمارے لئے فراہم کرتے ہیں اور جو کہ موجودہ دور کے اہلسنت طبقوں کو یا ان کی ایک معتد بہ تعداد کو مجتمع کرنے کی واقعتاً اور معقول ترین حد تک صلاحیت رکھتی ہے، اور اس کی تبلیغ کرنا اور آخر تک کرتے رہنا، البتہ ضرور انسان پر فرض ہے۔ اس سے بڑھ کر اس معاملہ میں انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ ایک مجمع کا مخل اور خراب ہوتے رہنا جتنی دیر تک خدا نے لکھ رکھا ہے ــــ گو اس کے اسباب اہل مجمع کے اپنے پیدا کردہ ہوں گے ــــ تب تک ''صبر'' اور ''محنت'' کے سوا کچھ چارہ نہیں، بشرطیکہ ''محنت'' اور اس پر ''صبر'' کی صحیح بنیاد دریافت کر لی گئی ہو۔ اس 'درستیِ حالات' کی ضمانت دے دینا تو پس کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن اگر انسان اس مطلوبہ اصلاحی عمل کا حصہ بن کر اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور اپنی استطاعت کی حد تک عین وہ کام کر رہا ہے جو اس مجمع کو مجتمع اور یکسو کر دینے کی راہ میں (یا یوں کہیے 'مجمع' کو ''جماعت'' میں بدل دینے کی راہ میں) کر دیا جانا آدمی سے مطلوب ہے تو مجمع پھر درست ہوتا ہے یا بدستور خراب ہوتا چلا جاتا ہے وہ شخص بہرحال ضائع نہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا قول مشہور ہے:

الجماعة ماوافق الحق ولو كنت وحدك

''جماعت وہ ہے جو حق کے تابع ہو چاہے تم اکیلے کیوں نہ رہ گئے ہو''۔

اب جس مجمع کو ایک بڑے بحران سے بلکہ ایک عدیم النظیر بحران سے نکال لانے کا چیلنج ہمیں درپیش ہے ــــ جیسا کہ حصہ اول میں بھی ہم اس جانب اشارہ کر آئے ــــ وہ طبقہ ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو اپنے لئے حجت مانتا ہے۔ اس کو طبقہ ہائے اہلسنت کہا جاتا ہے اور اس میں مذاہبِ اربعہ مثل احناف، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ، علاوہ ازیں اہل الحدیث اور اہل الظاہر وغیرہ سبھی آ جاتے ہیں۔ کیا

ہمارے پاس کوئی ایسے ضوابط ہیں جو ان سب طائفوں اور ان طائفوں کے ذیل میں آنے والی سب جماعتوں اور دھڑوں اور گروہوں کو___ ان کا تنوع برقرار رکھتے ہوئے___ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی جانب رجوع کرنے اور دین کو لے کر ایک ساتھ چلنے کے اس عمل میں مدد دے سکیں؟ ان کیلئے اجتماع کی ایک معقول بنیاد فراہم کر سکیں اور ان کے اتفاق اور اختلاف ہر دو کو ایک ضبط میں لا سکیں اور یوں اس عمل کے نتیجہ میں وحدت کے تصور کو ایک عملی جامہ پہنا سکیں؟ ''اصول اہلسنت'' میں درحقیقت ہمارے ان سب سوالات کا جواب موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

اجتماع کی صحیح بنیاد

''اجتماع'' کیلئے 'اتفاق' کی شرط لگانا نہ تو نقل کا تقاضا ہے اور نہ عقل کا۔ یہ لوگوں سے ایک غیر طبعی مطالبہ ہے۔ شریعت نے یہ بات کہیں فرض نہیں کی۔ البتہ شریعت میں اور اصول اہلسنت کے اندر اس کی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ ''اختلاف'' ایک انسانی واقعہ ہے۔ درست ترین بات یہی ہو سکتی تھی کہ اس کی ممانعت نہ ہو بلکہ اس کی حدود متعین کر دی جائیں۔

پس نہ تو ہر امر میں ''اتفاق'' لازم ہے اور نہ ہر معاملہ میں ''اختلاف'' کی اجازت۔ البتہ ''اجتماع'' کا حکم ہے اور ''افتراق'' کی ممانعت۔ ''''اجتماع'' دراصل ''اتفاق'' سے ایک وسیع تر چیز ہے۔ اسی طرح ''افتراق'' محض ''اختلاف'' سے ایک مختلف واقعہ ہے۔ نہ تو ہر معاملے میں اتفاق کا ہونا اجتماع کیلئے شرط ہے اور نہ اختلاف کا بعض معاملات میں ہو جانا افتراق کا موجب۔

البتہ وہ معاملات بے حد واضح ہو جانے چاہئیں: جن پر اتفاق ہو جانا فرض ہے اور اجتماع کیلئے ایک پیشگی شرط۔ اسی طرح ان معاملات کا بھی واضح ہو جانا

ضروری ہے: جن میں اختلاف قطعی طور پر حرام اور نا قابل قبول ہے اور اجماع کے راستے کی ایک قطعی رکاوٹ۔ ان دونوں کے مابین پھر وہ معاملات خود بخود واضح ہو جاتے ہیں جن میں: نہ اتفاق شرط ہے اور نہ اختلاف رکاوٹ۔

جب ایسا ہے ...... یعنی نہ تو اختلاف کی کھلی چھٹی ہے اور نہ اتفاق کی کلی شرط......تو پھر آپ کے پاس کوئی ایسا متوازن ضابطہ ہونا چاہیے جس میں ان دونوں کی حدود طے کر دی گئی ہوں اور جس میں ہر دور اور ہر خطے کے لوگوں کیلئے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کی گنجائش نہ رہنے دی گئی ہو۔

ایک بے قابو مجمع کو یکسوئی کی راہ پر ڈال دینا بے حد محنت طلب اور وقت طلب کام ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس میں خدا کی توفیق درکار ہے۔ اس پر وقت اور محنت صرف ہو، یہ ہرگز باعث تعجب نہ ہونا چاہیے اور ایک سمجھدار کو تو ہرگز اس سے جی نہ چرانا چاہیے۔ اس پر محنت نہ ہوگی تو اور کس بات پر محنت ہوگی؟ امت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرنے سے بڑھ کر کیا نیکی ہوسکتی ہے......؟ البتہ جو چیز دیکھنے کی ہے اور اس معاملہ میں بے انتہا اہم اور فیصلہ کن حیثیت رکھنے والی ہے وہ یہ کہ: ''اجماع'' کا وہ نسخہ جس پر ایک منتشر مجمع کو لایا جانے کیلئے ایک طویل محنت ہونا ہے کہاں تک اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ آپ کے وقت اور محنت کا عین صحیح مصرف ہے......؟ اور یہ کہ کہاں تک وہ ''اجماع'' کا واقعتاً ایک درست طریقہ ہے......؟ اور کہاں تک وہ اتفاق اور اختلاف کے درست اور متوازن ضوابط پر مبنی طرز عمل ہے؟

''اصولِ اہلسنت'' دراصل ان سب باتوں کا ایک صحیح ترین جواب ہے۔ یہ نہیں تو پھر آپ کے پاس اجماع کی کوئی بنیاد نہیں سوائے اس کے کہ ہر آدمی

''اجماع'' کیلئے ایک ہی شرط رکھے اور وہ یہ کہ سب دوسرے لوگ بس ایک اسی کے یا اسی کی جماعت یا اسی کے بڑوں کے فہم دین پر آ جائیں اور یہ کہ قرآن اور حدیث سے جس طرح خود اس کو یا اسکے بڑوں کو دین کے سب مسائل سمجھ آئے ہیں عین اسی طرح سب دوسروں کو سمجھ آنے لگیں!

طرفہ یہ کہ کچھ لوگ دوسروں پر اپنی یا اپنے مذہب کی تقلید کی شرط بھی نہیں لگاتے مگر یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو دین کے سب اصولی اور فروعی مسائل قرآن وحدیث سے ویسے ہی سمجھ آئیں جیسے خود ان کو یا ان کی جماعت کو اور ان کے بڑوں کو سمجھ آئے ہیں بصورت دیگر لوگ **انما هم فى شقاق**[1] کی حالت سے باہر نہیں اور وہ خود **إنک علی الحق المبین**[2] کا مصداق! کیونکہ اپنے تئیں یہ خود کتاب وسنت کے متبع ہیں اور دوسرے لوگ اپنی باطل خواہشات کے پیروکار! اب جس بات کا یہ اپنے تئیں حق رکھتے ہیں عین اسی بات کا اتنا ہی حق اگر دوسروں کو بھی حاصل ہو تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو حق کا مصدر ماننے والوں کے مابین ''اجماع'' کی کیا صورت باقی رہ جاتی ہے؟

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب وسنت کے فہم واستنباط کی بابت خود اپنی یا اپنے بڑوں کی تقلید کی شرط لگاتے ہیں وہ درحقیقت امت کو اپنی شروط پر مجتمع کرنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اگر دوسروں پر یہ شرط لگانا شروع کر دے تو امت کا اجماع کہاں گیا؟

لامحالہ آپ کو کوئی ایسا طریقہ کار درکار ہے جو لوگوں کو کسی بات کا حق دے تو

---

(۱) البقرۃ: ۱۳۷ ''وہ تو صاف مخالفت (ہٹ دھرمی) پر ہیں''

(۲) النمل: ۷۹: ''بے شک تو ہی بین حق پر ہے''

سب کو ایک سا حق دے اور اگر کسی بات کی پابندی لگائے ــــ (ظاہر ہے کہ پابندیوں سے بالکل آزاد اجتماع کا کوئی تصور نہیں) ــــ تو سب پر ایک سی پابندی لگائے۔ اس کے اس ''حق دینے'' اور ''پابند کرنے'' میں کچھ ایسا توازن اور حکمت ہو کہ لوگ مجتمع بھی رہیں اور مصادرِ دین سے فہم واستنباط کرنے اور زمان ومکان کے لحاظ سے اپنے فرائضِ دین کی بابت اجتہاد کرنے میں ایک خاص حد تک آزاد بھی رہیں۔ یگانگت بھی ہو اور سوچ اور فہم کا ایک تنوع بھی برقرار رہے۔ نہ یہ ہو کہ اختلاف کی کھلی چھٹی ہو اور دین کی کسی بھی بنیاد کو کوئی بھی شخص کسی بھی وقت چیلنج کر لینے کا مجاز ہو.. اور نہ یہ کہ فروعِ دین کے ہر ہر مسئلہ میں لاکھوں کروڑوں لوگ نسل درنسل اور صدیوں تک ایک ہی طرح سوچنے اور ایک ہی سا عمل کرنے کے پابند ہوں چاہے علم اور دلیل کی روشنی میں کسی کو اس سے کتنا ہی اختلاف ہو، یا زمان و مکان کی تبدیلی کسی وقت کتنے ہی بڑے فرق کی جانب اشارہ کرتی ہو۔

☆☆☆☆☆

مقیاسِ مفقود

اِس 'مجمع' کی کیفیت سے نکل آنے کیلئے...... ہمیں وہ مقیاس چاہیے جو ہر چیز کی جگہ متعین کرے۔ شدت کے مقام پر واضح شدت ہو اور وہاں مفاہمت خارج از امکان ہو۔ جبکہ نرمی کے مقام پر نرمی ہو؛ وہاں مفاہمت و رواداری پائی جائے اور تشدد کا گزر نہ ہو۔ کوئی چیز بڑھ کر دوسری کی جگہ نہ لے۔ جہاں سختی اور محاذ آرائی confrontation ضروری ہو وہاں وسعت نظر کا سوال اٹھ کھڑا نہ ہو اور جہاں دوستانہ اختلاف رائے رکھا جانا چاہیے وہاں 'رزم حق وباطل' نہ برپا ہونے لگے۔ اتباع کی حدود بھی واضح ہوں اور ابتداع کی بھی۔ جمود بھی رد ہو اور اجتہاد بھی پروان چڑھے۔

ایسا پیمانہ بنایا نہیں جائے گا بلکہ دیکھا یہ جائے گا کہ ہمارے دین نے ہمیں کسی ایسے پیمانے کی طرف رہنمائی کی ہے؟ آیا ہمارے پاس پہلے سے کوئی ایسا دستور موجود ہے جس میں اس توازن کی صحیح ترین مساوات equation ہمیں بتا دی گئی ہو؟ بلکہ صدیوں تک اس کی عملی تطبیق کر کے ہمیں دکھا دی گئی ہو؟ ''اصول اہلسنت'' دراصل اسی سوال کا کافی وشافی جواب ہے۔ ہمیں اس سلسلہ میں ایک پیمانہ اور ایک کسوٹی بلاشبہ حاصل ہے۔ بنانے کی بات ہے تو پیمانے بنائے کہاں جاتے ہیں؛ ہر پیمانہ اپنے بننے کیلئے ایک پیمانے کا ضرورت مند ہوتا ہے! یہاں تو ایک ہی پیمانہ ہے جس کو ابتدائی طور پر صاحبِ وحی نے خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا اور مِن مِن کر اور تراش تراش کر اور پوری ایک ربع صدی لگا کر تیار کیا اور اس کے عین مطابقِ وحی ہونے کی خوب خوب تسلی کی اور بعد والوں کو کرائی۔ اور قیامت تک آنے والوں کو اسے ''پیمانہ'' تسلیم کرنے کی تاکید فرمائی۔ ''ما أنا علیه وأصحابي''☆ اس کا عمومی تسلسل پھر تابعین اور اتباع تابعین رہے۔ ان تین نسلوں کو سلف کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد فتنوں اور انحرافات نے بڑی بڑی سطح پر مقبولیت پائی اور معاشرے میں حق کا وہ بول بالا نہ رہا۔ مگر بعد والوں کو ایک پیمانہ اور کسوٹی دے دینے کیلئے یہ بہت کافی تھا۔ ایک سطح پر یہ تسلسل قائم بھی رہا اور تاریخ کے بعض ادوار میں تو یہ خاصی اچھی سطح پر بھی چلا جاتا رہا...... اس تسلسل کا نام اہلسنت تھا۔ اس کو پسپائی بھی ہوئی۔ یہ ہم مانتے ہیں۔ خصوصاً آخری صدیوں میں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس کی پسپائی اُمت کے زوال کا

☆ رواه الترمذی (کتاب الإیمان، باب ما جاء فی افتراق الأمة رقم: ٢٦٤١)، وغیره، وحسنه الألبانی (انظر صلاة العیدین للألبانی ص ٤٦)

پیمانہ ٹھہرا۔ پس یہ ہر معاملے میں ایک پیمانہ رہا۔ اُمت کا عروج بھی اسی سے ماپا جا سکتا ہے اور زوال بھی۔

پس یہ سچ ہے کہ آج آپ اصول اہلسنت کو عمل کے میدان سے بڑی حد تک روپوش پاتے ہیں۔ تاہم یہ اِس صورتحال کے درست ہونے کی دلیل نہیں؛ بلکہ یہ اس زوال کی تفسیر ہے جو ہمیں پچھلی کچھ صدیوں سے لاحق ہے اور جو کہ ایک بے قابو مجمع کی صورت میں اب ہمارے سامنے ہے۔

ہم ایک خود کفیل اُمت ہیں۔ یکسوئی ہمارا حق ہے۔ تجربات کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے سے ہم کو پورا پورا تحفظ حاصل ہے۔ کن باتوں میں ہم کو یک آواز ہونا ہے اور کن امور میں اپنی آوازوں اور لہجوں کا تنوع باقی رکھا جا سکتا ہے، ہمیں اس معاملے میں رہنمائی بالفعل حاصل ہے۔ اس لحاظ سے ہم دنیا کی ہر قوم سے بڑھ کر پیداآور productive قوم ہو سکتے ہیں۔

11

مُسلّمات کی ضرورت

قوموں کی زندگی میں، اور انسانی معاشروں کے اندر، کچھ معاملات کو نبیڑے اور ہمیشہ کیلئے طے کردیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ یہ بات سماجی امور کے معاملہ میں بھی سچ ہے، طبعی علوم کے معاملہ میں بھی، فکری امور کے بارہ میں بھی، اور قومی وسیاسی بنیادوں کی بابت بھی۔

مسلّمات کا پایا جانا قوموں کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں اگر کہیں کوئی جھول پایا جانے کا امکان ہے تو وہ اس لئے کہ قوموں اور معاشروں میں جن باتوں پر اتفاق کرلیا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد بسا اوقات کسی ٹھوس علمی ثبوت کے بغیر رکھ لی گئی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض سماجی مسلّمات یک لخت غلط ثابت ہو جاتے ہیں اور قوم کی زندگی میں ایک بنی بنائی عمارت اس کے باعث دھڑام سے گر جاتی ہے اور تب وہ ایک بڑے بحران میں جا پڑتی ہے[۱]۔ مگر اس خطرے اور احتمال کے باوجود قوموں اور معاشروں کی زندگی میں مسلّمات کے پائے جانے کی ضرورت اصولاً ختم نہیں ہو جاتی[۲]۔ کیونکہ اس کے بغیر کسی انسانی اکٹھ کا مل کر آگے بڑھنا اور اس راستے میں ان کے مابین **نسلوں تک** یکسوئی اور ہم آہنگی پائی جانا ممکن نہیں۔ ہاں کچھ ضروری ہے تو وہ یہ کہ مسلّمات

پوری طرح ٹھوک بجا کر اور ٹھوس علمی بنیادوں پر قائم کیئے گئے ہوں۔ جس کی ہمارے دین میں حیرت انگیز تاکید ہے:

وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً (الاسراء:۳٦)

''کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دِل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے''۔

اِس لحاظ سے؛ دیگر قوموں کا معاملہ ایک مخمصے میں جا پڑتا ہے۔ البتہ اس امت کو جو مسلمات حاصل ہیں وہ منفرد ترین ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ وہ صحیح معنوں میں ''مسلمات'' ہیں، یعنی ان میں اضطراب کا آجانا کسی وقت ممکن نہیں؛ یہ ہماری اجتماعی زندگی میں مضبوط ترین عمارت اٹھا دینے کی یقینی ضمانت ہو سکتے ہیں[۲]۔

عام خیال اِس وقت یہ پایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ کو یہ ''مسلمات'' صرف ''مصادرِ دین'' ہی کی بابت حاصل ہیں، یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ۔ البتہ ان مصادر کے ''فہم وتفسیر'' کی بابت لوگ جیسے مرضی سر پٹخیں اور جیسے مرضی دست وگریباں رہیں، اس معاملہ میں کوئی معیار اور کوئی معتمد علیہ صورت اس امت کو پہلے دن سے تیار کر کے نہیں دی گئی! یہ ایک بے حد بڑی غلط فہمی ہے جو دین اسلام کی بابت عام کی گئی ہے اور اِس کا ازالہ حد سے بڑھ کر ضروری۔ ہمارے برصغیر کی فکری وتحریکی دنیا اس وقت جس آشوب ناک صورت میں گرفتار رہے اُس کی تہہ میں کچھ ایسا ہی ذہن کام کر رہا ہے۔

اِس حوالہ سے، شروع فصول میں ہم کچھ اصولی گفتگو کر چکے۔ ''بے قابو مجمع'' کی ایک تصویر دیکھ لینے کے بعد، اِس کے چند مزید جوانب کا بیان مفید ہو سکتا ہے:

بلاشبہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ ہمارے لئے ہدایت کا منبع ہے، اور اس کے مُسَلَّمہ ہونے میں، سوائے کچھ ہلاکت میں پڑنے والے فرقوں کے، کسی کو کوئی کلام نہیں۔ اس پر مزید وقت صرف کرنا بھی ضروری نہیں۔ البتہ ہماری ضرورت صرف یہیں تک نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ **کیا اس بات کا امکان ہے کہ ایک آدمی کتاب اللہ یا سنت رسول اللہؐ سے استدلال کرنے میں دانستہ یا نادانستہ ایک غلط طرزِ عمل اپنا لے اور کہیں سے کہیں جا پہنچے؟ یا پھر اس بات کی کوئی ضمانت اتار دی گئی ہے کہ قرآن وحدیث ہر آدمی کو ہر حال میں درست ہی سمجھ آئے گا اور کوئی شخص بھی دین کو اس کے اس مصدر سے سمجھنے میں ہرگز کوئی ٹھوکر نہیں کھائے گا؟**

دین ایک متعین حقیقت

کیا اِس اُمت کا وقت اور وسائل اس بات کے متحمل ہیں کہ ہر شخص اور ہر مکتبِ فکر یہاں اٹھے تو دین کی ایک ازسرِنو تعبیر کرے.. اور تب کسی دوسرے شخص یا مکتبِ فکر یا حتی کہ پوری اُمت کیلئے اس کی تصحیح یا اس کا رد کرنے کی مصروفیت نکل آئے! **نہ ایک 'نئی تحقیق' کو چھوڑا جا سکے کہ کیا معلوم ''پہلوں'' کی کتنی بڑی بڑی غلطیاں ہوں جو اِس 'نئی تحقیق' نے منکشف کر دی ہوں.. اور نہ اس کو فوری طور پر لیا جا سکے کہ کیا معلوم چند ہی سال میں خود اس کے اندر کتنے بڑے بڑے جھول نکل آئیں اور پکڑنے والے اس کی کیسی کیسی جہالتیں پکڑ لائیں؛** اور اتباعِ سنت کا عمل اِس پورے عرصے کے دوران (جس کی مدت کا تعین کوئی نہیں کرسکتا) یا تو معلق رہے اور یا پھر 'اللہ توکل' پر کام چلتا رہے کہ دیکھتے ہیں کب کسی چیز کے اندر کوئی غلطی نکل آتی ہے اور کب کسی چیز کو ''متروکات'' کی فہرست میں داخل دفتر کر دیا جاتا ہے...... یعنی 'ایڈہاک بیس' پر اصولِ سنت کا تعین! جونہی پتہ چلا کہ یہ بھی ٹیڑھا ہے، اُس کو چھوڑ کسی اور طرف کو رخ کرلیا!

مزید برآں، ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کی پکڑ کرنے کیلئے آگے بڑھے ایک نیا شخص پھر اس کی پکڑ کرنے کو اُٹھ کھڑا ہو اور 'گیند چھیننے' کا یہ کھیل فہم دین کے نام پر کھیلا جائے، جیسا کہ صدی بھر سے ہمارے برصغیر میں ہو بھی رہا ہے!؟

یا پھر ''مصادرِ شریعت'' ہی کی طرح ''مصادرِ فہم'' کے معاملہ میں بھی اس امت کو کفایت کر دی گئی ہے اور یہ مؤخر الذکر مسئلہ بھی اس کی تاریخ میں ''مسلمات'' کے زمرے میں آتا ہے؟

حق یہ ہے کہ اصول اہلسنت کی رو سے ہر دو امر میں ہمیں کفایت کر دی گئی ہے.. اور ''سرگردانی'' کی تو اس امت کے پاس گنجائش ہی نہیں۔

آپ بہت ذہین اور نابغۂ وقت ہیں، محنت اور مطالعہ بھی خوب کرتے ہیں، کیا یہ اس بات کیلئے بہت کافی ہے کہ آپ دین کی ایک تفسیر نو کے مشن پر نکل کھڑے ہوں اور اپنے ساتھ اُمت کے ایک خاصے بڑے طبقے کو بھی مصروف کر لیں؟ حتیٰ کہ ہر ذہین آدمی یہی کام کرے؛ یوں روز اس امت کے چلنے کو ایک نیا راستہ سامنے لایا جائے، یعنی کوئی حتمی چیز اس باب میں یہاں کبھی پائی ہی نہ جائے!؟

امام مالکؒ کے پاس ایک شخص آیا اور دِین کے کچھ بنیادی اُمور میں آپ کو بحث و گفتگو کی دعوت دی (آپ اندازہ کر سکتے ہیں امام مالکؒ کے ساتھ ماتھا لگانے والا شخص کوئی کم علم یا معمولی قابلیت کا آدمی نہ ہوگا) امام مالکؒ کو اس کا کہنا تھا: ''آؤ بات کرتے ہیں؛ میں جیتوں تو تم میرے ہم خیال ہو جاؤ اور تم جیتو تو میں تمہارا ہم خیال ہو جاؤں''۔

''اور اگر کوئی تیسرا شخص ہم دونوں کو خاموش کرا دے؟'' امام مالکؒ نے اس تجویز پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

''تو ہم اس کی بات تسلیم کرلیں گے''۔ اُس شخص کا جواب تھا۔

بظاہر دیکھئے تو اس شخص کی بات سے بڑی ہی انصاف پسندی اور حق پرستی جھلکتی ہے! ہوسکتا ہے وہ شخص اخلاص ہی سے یہ بات کہہ رہا ہو۔ بظاہر خاصی اصولی پیش کش ہے! مگر امام مالکؒ اس کا جو جواب دیتے ہیں حقیقت یہ ہے وہ آپ ایسے ائمۂ سلف کا ہی حصہ ہے، فرمایا:

''تو کیا جب بھی کوئی نیا شخص میدان میں آئے اور پہلے والے سے بڑھ کر دلیل دے لینے کی مہارت دِکھائے تو ہم اپنا دین اور راستہ تبدیل کرلیا کریں؟ سنو، میں اپنا دین یقینی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ تمہیں اپنا دِین تا حال معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو''۔ (۳)

یہ ہیں ہمارے ائمہ!

أولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم !!!

امام مالکؒ کے اس جواب میں اہلسنت کا تقریباً سارے کا سارا **منہج تلقِّی** پوشیدہ ہے۔ 'دین' محض ذہانت کا کارنامہ نہیں۔ 'دین' کوئی 'دلائل' دے لینے کا نام بھی نہیں۔ یہ کوئی 'خوردبینی' عمل بھی نہیں۔ ایسا ہوتا تو خدا کی یہ سیدھی سادی مخلوق تو ماری ہی جاتی۔ ایک کثیر خلقت جو بیچاری تلاشِ روزگار میں صبح سے شام کر دینے پر مجبور ہے تب اس کی ہلاکت یقینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دین 'فلسفہ' نہیں گو فکرِ اعتزال کی یہی کوشش رہی ہے کہ دِین کو ذہانت اور فطانت کا کمال ٹھہرا دیا جائے جس کی رو سے ___ فلسفی افکار ہی کی طرح ___ ہر نیا ذہین پرانوں کی بہت سی باتوں کو 'دلیل' کے زور پر غلط ثابت کردے اور پھر کوئی اور ذہین اُٹھے تو اس کی دلیل کو بے دلیل کردے...... یوں کسی معاملے کا حتمی فیصلہ قیامت تک نہ ہو!

یقیناً ان لوگوں کا فیصلہ قیامت ہی کو ہونے والا ہے!

حق یہ ہے کہ ''دین'' کا تعین ایک بہت ہی سادہ عمل ہے۔ ''دین'' ایک متعین حقیقت ہے جس کا کہ نزول بھی عمل میں آ چکا ہے اور جو زمین پر سمجھی بھی جا چکی ہے۔ بیان بھی ہو چکی ہے۔ روئے عمل بھی آ چکی ہے۔ نقل بھی ہوگئی ہے اور روایت بھی۔ ہزاروں لاکھوں کی خلقت ــــ جس میں ہر اہلیت کے لوگ شامل تھے ــــ برس ہا برس تک اس کا فکری، نظری، عملی، روحانی اور ایمانی مشاہدہ بھی کرتی رہی اور زندگی کے اندر اس کا عملی اور واقعاتی مظاہرہ بھی۔ پھر ان کے اس فکری مشاہدہ اور عملی مظاہرہ کے عین حق ہونے کی شہادت اس حقیقت کے نازل کرنے والے نے خود بھی دے دی ہے (وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ)☆ اور جس پر یہ حقیقت نازل ہوئی اس نے بھی اس کی توثیق کر دی (ما أنا عليه وأصحابي)☆۔ پس اب اس حقیقت کی تلاش، تفکیر کے صغریٰ وکبریٰ میں نہیں بلکہ اُس انسانی مجموعےؓ کے علم وعمل کے ذخیروں میں کی جائے گی اور اسی کے زیرِ تعلیم اور زیرِ تربیت رہنے والے ''تابعین'' کے ہاں ڈھونڈی جائے گی، جن کی شاگردی کی جانب امام مالکؒ کا اشارہ ہے کہ ''میں اپنا دین یقینی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ وہ کیا ہے، تمہیں اپنا دین تا حال معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو''۔

دِین کا فہم کسی ادھیڑ بن کا نام نہیں۔ مسلمات کا پایا جانا، کہ جس سے ایک قوم صرف آگے سے آگے بڑھے؛ اس کی زندگی میں ایک ہی قدم بار بار اٹھانے کی ضرورت نہ

(۱) ''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا......'' (التوبۃ:۱۰۰)

(۲) ''وہ چیز جس پر میں (رسول ﷺ) ہوں اور میرے اصحابؓ ہیں'' (الترمذی، دیکھئے یہ کتاب ص۱۴۳)

پڑے، ایک شرعی ضرورت ہے اور ایک انسانی حقیقت۔ قوموں کی زندگی میں اور نسلوں کا تسلسل برقرار رہنے کیلئے اس سے ہرگز کوئی مفر نہیں۔ پھر امت (٤) ہونے کیلئے تو آپ کے ہاں مسلمات کا پایا جانا آپ کی سب سے بڑی ضرورت ہے......

ایک ایسی زمین جس پر آپ پورے اعتماد کے ساتھ اور قدم جما کر نہ چل سکیں ایک بڑے قافلہ کی گزرگاہ بننے کیلئے بے کار ہے۔

اس اُمت کو ایک ''بڑا قافلہ'' بنا رکھنے کا انتظام ہمارے دِین میں پہلے دِن سے کر دیا گیا ہے۔ یہ دین محض افراد کے 'تحقیقات' کا موضوع بننے اور ہر ہر فرد کو اس کی اپنی خوردبین سے نظر آنے کیلئے نہیں اترا۔ یہ لاکھوں کروڑوں خلقت کو بیک وقت اور نسل در نسل چلانے اور ایک بہترین جہت دینے اور دیے رکھنے کیلئے آیا ہے۔ ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں اس سے جہت پاتے ہیں۔ اس دِین پر سات براعظم اکٹھے ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے فہم کی بابت عین اس بنیاد پر آ جایا جائے جس سے اس اُمت کے سلف ہم کو روشناس کرا گئے ہیں۔

''منہجِ سلف'' اور ''اصولِ اہلسنت'' ــــ اس دِین کے فہم کی بابت ــــ کچھ ایسے ہی مسلمات کا نام ہے۔

☆☆☆☆☆

پس مسلمات کا پایا جانا تو کسی مجمع کے ''اُمت'' بننے اور بنے رہنے کیلئے ناگزیر ہے خواہ وہ دُنیا کا کوئی گروہ ہو۔ البتہ جہاں تک اِس امتِ بیضاء کا تعلق ہے تو اس کیلئے 'کوئی سے بھی' مسلمات کام نہیں دیں گے۔ لہٰذا جن مسلمات کی بات ہم کرتے ہیں یہ وہی ''مسلمات'' ہیں جو اُس وقت سے ہیں جب سے یہ اُمت وجود میں آئی۔ رہے وہ 'مسلمات' جو آج ازسرنو قائم کئے یا متعارف کرائے جائیں گے

اور لوگوں کو اُن پر چلانے کیلئے ورق سیاہ کئے جائیں گے تو یہ 'نئے مسلمات' نئے انداز کے مریل قافلے ہی تشکیل دیں تو دیں یہ اُس ''اصل قافلہ'' کی تشکیل میں کام نہ دیں گے جو قرونِ اولیٰ کی یادگار ہے۔ جبکہ ہمیں کسی بات سے غرض ہے تو وہ یہی ہے؛ یعنی وہی دورِ سلف سے چلا آنے والا'' کارواں'' جو ہمارے دلوں میں بستا ہے اور جس کا وزن تاریخ آج بھی محسوس کرتی ہے۔ رہے محدثاتِ اُمور تو انہوں نے ہمیں اِس دُنیا میں فائدہ دِیا ہے اور نہ آخرت میں دینے والے ہیں۔

مگر صورتحال عملاً آج کیا ہے؟ ایک بڑے تعلیمیافتہ طبقے کا یہ حال ہے کہ جس قدر کوئی نیا خیال ظاہر کیا گیا ہو وہ ان کو اتنا ہی مسحور کرتا ہے۔ پرانی روش سے جتنا ہٹ کر بات کی جائے وہ اُن کو اتنی ہی زیادہ 'مبنی بر تحقیق' معلوم ہوتی ہے۔ تحقیق دراصل ایک 'نئی اپج' کا نام بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب کوئی ٹھوس بنیاد، فہم دِین کے معاملہ میں، بیشتر پڑھے لکھوں کے ہاں سرے سے ناپید ہو چلی ہے۔ ایک 'بحث' ہے جو کسی بھی موضوع پر ہر وقت شروع کی جا سکتی ہے!

حواشی:

حاشیہ (۱)

یہی وجہ ہے کہ یہاں کے من آزاد طبقے ''امت'' کو ہی اب ایک فرضی اور وہمی چیز قرار دینے لگے ہیں! سچ بھی ہے، سنت و ائمۂ سنت کی ہی جب کوئی حیثیت نہ رہی تو پھر جو مرضی کہہ دیجئے! سنت سے ہٹنا خود بخود آدمی کو نشانِ عبرت بنا دیتا ہے۔ انکی 'اگلی نسل' اب یہاں تک پہنچ کھڑی ہوئی ہے کہ مسلمان عورت ہندو مرد سے شادی کر لے تو بس وہ سماجی طور پر 'نامناسب' ہو سکتا ہے البتہ شرعی

حواشی

طور پر ممنوع نہیں، کیونکہ اِنکے 'مصادر' ان کو یہی بتاتے ہیں کہ قیامت تک کیلئے اب کسی کو 'مشرک' کہا جا سکتا اور نہ 'مشرک' والے احکام دیے جا سکتے ہیں!

حاشیہ (۲)

نقلِ ثابت، و عقلِ راسخ

یہی چیز اِس بات کی دلیل ہے کہ انسان کو سچے اور قابل اعتماد مسلمات درکار ہیں تو لازم ہے کہ اُس کیلئے آسمان سے ''شرائع'' اتریں۔ ورنہ وہ اِس مخمصے dilemma سے کبھی باہر نہیں آ سکتا:۔ایک طرف وہ ''مسلمات'' کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا: تا کہ اُس کے ہاں نت نئی بولیاں نہ سنی جائیں۔ دوسری طرف وہ ''حقائق'' سے آنکھیں بھی نہیں چرا سکتا؛ کہ جو بھی ہو جائے وہ کسی نو منکشف حقیقت کے آگے محض اِس وجہ سے ہٹ دھرم بنا رہے گا کہ اُس کے آباؤ اجداد نے کسی وقت اُس کیلئے کچھ 'مسلمات' ٹھہرا دیے تھے! اور یہ تو ظاہر ہے انسان کیلئے ممکن نہیں کہ اُس نے سب کچھ پہلے سے دیکھ رکھا ہو اور تب اپنے معاشرے کیلئے کچھ ''مسلمات'' اختیار کیئے ہوں۔

البتہ جب آپ ایک مستند وحی اور اُس کے ثقہ فہم کو اختیار کر لیتے ہیں تو آپ کو اپنی انفرادی و اجتماعی ضرورت کے وہ ''مسلمات'' مل جاتے ہیں جن کی 'تصحیح' کی ضرورت اور ان میں ردو بدل کا امکان باقی نہ رہے، سوائے یہ کہ (اور وہ بھی ایک خاص دائرہ میں) کسی نئی شریعت کے نزول یا کسی نئی امت کے برپا ہونے کے باعث زمین پر کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہو گئی ہوں (اور جس کا دروازہ اب ہمیشہ کیلئے بند ہو چکا ہے)۔ چنانچہ قرآن جس وقت 'باپ دادا' کی راہ پر اڑنے والوں کو سرزنش کرتا ہے تو وہ اِس وجہ سے نہیں کہ ایک 'پیچھے سے چلے آئے راستے' کی وہ سرے سے پیروی ہی کیوں کرتے ہیں بلکہ اس لئے

کہ (أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لاَ يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلاَ يَهْتَدُونَ)، یعنی نہ اہتداء (جو کہ شریعت کو پانا ہے) اور نہ عقل جو کہ (شریعت کو سمجھنا ہے)۔ جبکہ اہل ایمان اپنے اِس اہتداء (حصولِ وحی) اور اپنے اِس عقل (فہمِ وحی) دونوں کی توثیق نبی سے لیتے ہیں، اور وہاں سے اِس سلسلہ کو آگے چلاتے ہیں۔ چنانچہ (وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ - الملک:۱۰ ''وہ کہیں گے کاش اگر ہم نے سنا ہوتا یا سمجھا ہوتا تو ہم اہل دوزخ میں نہ ہوتے'') کے تحت قرطبی ابن عباس کا قول لاتے ہیں: (قال ابن عباس: لو كنا نسمع الهدىٰ أو نعقله ''کاش کہیں ہم ہدیٰ کو سن لیتے یا سمجھ لیتے'')۔ سورۃ الملک کی اِسی آیت کے تحت شیخ سفر الحوالی لکھتے ہیں: نجات کی ضمانت ایک سمعِ ہدایت ہے (سمع جس کو اصطلاحِ اہل سنت میں ''نقل'' بھی کہتے ہیں) اور دوسری عقلِ ہدایت۔ (عقلِ ہدایت، یعنی ہدایت کی سمجھ جو صاحبِ ہدایتؐ کے ہاں معتبر ہو)۔ یہاں کسی فرقہ کو ''سمع'' صحیح حاصل نہیں (آپ حیران رہ جاتے ہیں سب کے سب ذخیرہ ہائے سنت محدثین ہی کے ہاں پائے گئے اور انہی کی محنت سے محفوظ ہوئے جبکہ دیگر فرقے یہ تمام تر عرصہ اپنے اپنے ''عقلیات'' اور امام ابن ابی العز کے الفاظ میں ''جہلیات'' کے اندر مگن رہے)، اور کسی کو ''عقل'' (یعنی سمجھ) صحیح حاصل نہیں۔ یہاں اللہ نے علمائے اہل سنت پر بدرجۂ اتم فضل کیا، جن کے پاس ''سمع'' وہ جو نبیؐ سے حاصل ہوئی اور ''عقل'' (یعنی سمجھ) وہ جو صحابہؓ سے ماثور ہوئی۔

حاشیہ (۳)

غیر نبوی معاشروں کی شقاوت

یعنی یہ انسان کی ایک مجبوری ہے کہ اس کو اپنے معاشروں کو بہرحال کسی ڈگر پر ڈالنا ہوتا ہے اور اپنے تعلیمی وسماجی وسیاسی

حواشی

ومعاشی وتہذیبی و'مذہبی' سیٹ اپ کو کوئی بنیاد اور کوئی جہت دے کر رکھنا ہوتی ہے۔ وہ اس پر ضد نہ کرے تو مرتا ہے (کیونکہ اس کے بغیر ''معاشرہ'' نام کی کوئی چیز ہی باقی نہیں رہتی) اور اگر ضد کرے تو مرتا ہے (کیونکہ حقائق اس کی جہالت کا منہ چڑانے کیلئے آ موجود ہوتے ہیں)؛ اور یہاں سے غیر نبوی معاشرے ایک مسلسل تخریب، اکھاڑ پچھاڑ، انقلابات، اور ''تھیسز وا ینٹی تھیسز'' کا شکار ہوتے ہیں۔ لوگ اس کو ''ارتقاء'' سمجھتے ہیں مگر یہ انسان کی شقاوت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے؛ کہ یہ جزا ہے اُن لوگوں کی جو ''**اتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُواً**'' کے مرتکب ہوئے اور ''**فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى**'' کا مصداق۔ اِس کا حل ''ایمان'' ہے اور ''**مهتدون**'' و ''**أنعمت عليهم**'' کے چلے ہوئے راستے کا اتباع، مگر یہ قسمت والوں کو ملتا ہے اور اس کا زیادہ تعلق 'ذہانت' اور 'انتھروپالوجی' کے ساتھ نہیں رہنے دیا جاتا بلکہ ''اِنابت'' اور ''فروتنی'' کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ **قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ** - (الرعد: ۲۷)

پس یہاں پر سب سے بڑا چیلنج اور سب سے بڑا سوال ایک نبوی معاشرے (یعنی نبی کے قائم کردہ معاشرے) کا تحفظ ہو جاتا ہے؛ کیونکہ صحیح معنیٰ میں اگر کہیں پر ''مسلمات'' پائے جا سکتے ہیں تو وہ ایسے ہی معاشرے کے اندر۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اِن معاشروں کے اصل محافظ (ائمہ اہل سنت) اپنی توجہ کا بہت بڑا حصہ اِن معاشروں کو انکے اصل پہ قائم رکھنے پر لگا دیتے ہیں اور اپنی توجہ کا باقی ماندہ حصہ اس پر مرکوز کر دیتے ہیں کہ یہ معاشرے 'باہر' کی جانب متوجہ نہ ہوں نیز یہ کہ 'باہر' سے دراندازہونے والی اشیاء کا قلع قمع کیا جاتا رہے۔ لوگ ائمہ سنت کو اتنی شدید تاکیدیں کرتا دیکھتے ہیں تو کسی وقت یہ

تک کہنے لگتے ہیں کہ ان کا دماغ چل گیا ہے ہردم ایک ہی بات زبانوں پر سنی جاتی ہے؛ لیکن وہ لوگ جو اس اصل راز سے واقف ہوتے ہیں کہ ''آسمان کی امانت'' پر ہاتھ کی گرفت چھوٹنے سے مسلم معاشرے کن تباہیوں میں جا کر گرتے ہیں اور کیسی کیسی درماندگی لے کر آتے ہیں صرف وہی اِس بات کی داد دے سکتے ہیں کہ:

اتبعوا ولا تبتدعوا، فقد کُفِیْتُمْ

''اتباع کرو نہ کہ ابتداع۔ دیکھو، تمہیں کفایت کر دی گئی ہے''

اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ ''آسمان کی امانت پر گرفت کا ڈھیلا پڑنا'' وحی کے الفاظ اور نصوص کے معاملہ میں بھی ہوسکتا ہے، (اور جو کہ اِس امت کی بابت اصل ڈرنے کی بات نہیں) اور ان کے درست و مستند معانی اور مفاہیم کے معاملہ میں بھی (اور جو کہ اصل پریشان ہونے کی بات ہے)۔

انسانی معاشروں کو ''مسلمات'' کی جو احتیاج لاحق ہے، اسکے حوالے سے یہاں اور پچھلے حاشیہ میں جو گزارشات ہوئیں، انکو فصل نہم میں ذکر ہونے والے حاشیہ ۱۹ و حاشیہ ۲۰ سے متصل کر کے دیکھا جائے تو ''نبوتوں'' اور ''اصحاب'' اور ''امتوں'' کی بابت کچھ مفید مطالب سامنے آجاتے ہیں۔

حاشیہ (٤)

امام مالک کا یہ واقعہ کثرت کے ساتھ کتبِ سنت میں مذکور ہوتا ہے، بعید نہیں امام مالک کے ساتھ اس طرح کے واقعات ایک سے زیادہ مرتبہ پیش آئے ہوں۔ اِس مضمون کا واقعہ امام آجریؒ نے کتاب الشریعۃ، ابن بطہؒ نے الابانۃ الکبریٰ، اور ابن عبد البرؒ نے الانتقاء میں ذکر کیا ہے۔

حصہ سوم: **تاصیل**

- "صراطِ مستقیم" کے بعد صراط الذین أنعمت علیھم کی صراحت
- منہجِ سلف کو لازم پکڑنا
- مدرسۂ صحابہؓ اساس ہے
- دلائل ابن قیمؒ از اعلام الموقعین صحابہؓ معیارِ حق اور انکے مدرسہ کی اتباع لازم
- منہجِ سلف، قرونِ ثلاثہ کے بعد
- تنقیح 'بعد والوں' کے مناہج کی، نہ کہ "دورِ اول" کے مسلمات کی!
- دورِ صحابہ وسلف کی "اتباع" نہ کہ محض "تعظیم"!
- دورِ اول کے "سَلَف" اور زمانۂ آخر کے 'اکابرین'
- کوئی چیز کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا متبادل نہیں

12

صراطِ مستقیم کا ذکر ہو جانے کے بعد
صراط الذین أنعمت علیهم
کی تصریح اور تاکید

وحی کی طرف رجوع کس طرح؟

پیش ازیں ہم اس سوال پر غور کر آئے ہیں کہ ہر آنے والے شخص کو دین کی تعبیر اور تفسیر کیا 'خود' کرنی ہے اور اس عمل کا 'از سر نو' آغاز کرنا ہے یا پہلے سے موجود کسی ''تسلسل'' کا حصہ بننا ہے؟ اور پھر اس کیلئے کسوٹی کیا ہے؟ ''دین کے حقائق'' اور ''دین کے فرائض'' کے فہم میں اگر لوگوں کا کچھ فرق ہو گیا ہو، اور کسی حد تک تو یہ ایک انسانی واقعہ ہے، تو لوگوں کے اس اختلاف یا تنوع کے ساتھ کیونکر پیش آیا جائے؟ کیا 'ذرہ بھر' اختلاف کی گنجائش نہ دی جائے؟ یا اختلاف کے دروازے 'چوپٹ' کھول دیے جائیں؟ توازن کی کیا صورت ہو؟

اس معاملے میں کسی 'کسوٹی' کی ضرورت ہے تو وہ کیا ہر آدمی خود تجویز کرے گا؟ 'کسوٹی' اگر ہر آدمی خود تجویز کرے گا تو کیا سب سے پہلے ''کسوٹی'' کے تعین میں ہی اختلاف نہ ہو جائے گا؟ پھر وہ ''کسوٹی'' کیا ہوئی؟ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ سے لئے جانے والے ''فہم واستنباط'' کی صحت جانچنے کیلئے لوگوں کے مابین آخر کوئی تو حوالہ refering point ہو!

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے درست رہنمائی لینے کا عمل اُمت میں ایک معلوم تاریخی واقعہ رہا ہے۔ اس میں اچھا خاصا ایک تنوع ضرور پایا گیا لیکن اس کی بھی بہرحال کچھ معین حدود ہیں۔ پھر آپ جانتے ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی غلط تاویل اور باطل تشریح بھی اُمت کی تاریخ میں ایک واقعہ رہا ہے اور اُس کی شدید مذمت ہونا ریکارڈ پر ہے۔

"أهـــواء": صحابہ رض کی راہ سے ہٹنا

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ: **نصوصِ وحی کی جو باطل تفسیرات ہوئیں، دورِ اول میں ان کی بے حدوحساب مذمت ہوتی رہی تو وہ کچھ اِس حوالے سے نہ تھی کہ ایسی باطل تشریح کرنے والے شخص نے فلاں جگہ پر یہ "فنی غلطی" کی ہے اور فلاں مقام پر یہ "ٹیکنیکل فالٹ" کیا ہے اور فلاں مقام پر "عربِی مبین" کا فلاں قاعدہ توڑ لیا ہے لہٰذا امت کو اب اُس کے شر سے خبردار کرنا ضروری ہو گیا ہے!** کوئی ایسا سوچتا ہے تو وہ اِس معاملے کی بالکل غلط تصویر کشی ہو گی۔ ایسا کوئی بھی حوالہ کسی کو "منحرف" اور "گمراہ" کہنے کے حوالے سے کبھی بھی تو دیا گیا ہو! یقیناً ان باطل پرستوں کی پیر پیر پر برائی اور مذمت ہوتی رہی، مگر اس کا حوالہ یہی ہوتا تھا کہ **وہ کتاب اللہ کو وہ معانی اٹھواتے ہیں جو اس امت کیلئے بالکل نئے تھے اور قرآن کا وہ فہم جو امت کو اصحابِ رسول اللہ ﷺ سے ملا تھا وہ اِن نئے معانی کو قبول کرنے سے صاف اِبا کرتا تھا۔** ساری چوٹ تو تھی ہی اِس بات پر کہ یہ اصحابِ رسول اللہ کے طریق سے ہٹ کر کتاب اللہ کی تفسیر کرتے اور نئی نرالی باتیں نکال کر امت کو دیتے ہیں۔ **اُن کو "اهل الاهواء" کہا ہی اس لئے گیا کہ وہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ کی راہ سے ہٹے ہوئے اور بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔** ان کو "مبتدع" کہا گیا، مراد یہ کہ ان لوگوں نے راستہ ہی ایک نیا نکال

لیا ہے۔ سارا زور ہی اِس کے ''نیا'' ہونے پر تھا؛ کہ اس سے **پہلے امت میں اس کی ''نظیر'' نہیں ملتی**۔ چنانچہ ''اھواء'' اور ''ابتداع'' کا سارا تصور ہی اس کے ''بھکے پن'' اور اس کے ''نرالے پن'' کے ساتھ جڑا ہوا ہے نہ کہ تفسیر وتاویل کے ''فنی محاسن'' یا ''ٹیکنیکل باریکیاں'' چھوٹ جانے کے ساتھ!

اور جہاں تک اِس ''اھواء'' (بھکے پن) اور ''ابتداع'' (نرالے پن) کا تعلق ہے تو اُس کو جانچنے کا آخر کیا حوالہ تھا؟ علمی نکتے تو وہ بھی بہرحال کچھ کم بیان نہ کرتے تھے، نیز ان کے اخلاص پر شک کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ قرآن حدیث کے حوالے پیر پیر پر وہ بھی دیتے ہیں۔ اِس بھکے پن، اِس نرالے پن، اور اِس ٹیڑھ کو جانچنے کا یہاں صرف ایک ہی حوالہ ہے: ''صحابہؓ کا راستہ''۔ سادہ لفظوں میں، یہ صحابہؓ اور تابعینؒ تھے جو اُن لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ جو معانی تم بیان کر کے دے رہے ہو ہم ان سے واقف نہیں؛ اور یہ چیز کسی بات کو رد کرنے کیلئے نہایت کافی تھی۔

یہ نوٹ کرنا بھی نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ قرونِ سلف میں ''ابتداع'' کا لفظ کس چیز کیلئے زیادہ مستعمل رہا۔ ہمارا مشورہ ہوگا کہ اِس لفظ کے حوالے سے آپ دورِ سلف کے استعمالات کا ایک استقراء کر لیجئے، عملاً اِس کا اطلاق آپ کو ''**صحابہؓ سے ملنے والے طریقے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالنا**'' پر ہی زیادہ نظر آئے گا۔ آپ کہیں گے ''ابتداع'' تو ''سنت'' سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالنا ہے۔ ہم کہیں گے یہ بات سو فیصد درست ہے؛ مگر ''سنت'' کو جاننے کا مقیاس کیونکہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ ہیں، بلکہ ''سنت'' کا ایک حوالہ ہی یہ ہے کہ ''وہ پٹا ہوا راستہ جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو چھوڑا تھا''، اس لئے ''صاحبِ ھویٰ'' اور ''مبتدع'' کے سب

حوالے عملاً صحابہؓ کی راہ کی نسبت سے ہی متعین ہوتے تھے[1]۔قرآن وحدیث کے الفاظ اور دلالت سے استدلال ایک لمبا کام تھا اور خاص اصحابِ علم کے کرنے کا تھا، البتہ اصحابؓ کو دیکھ دیکھ کر ہر نئے عقیدے، ہر نئی روش اور ہر نئے دستور کی حیثیت متعین کر لینا اور اس سے چوکنا ہو جانا ایک نہایت آسان کام تھا اور وقت طلب بھی نہ تھا۔نوبت یہاں تک آئی رہی تھی کہ اصحابِؓ رسول اللہؐ کی راہ سے ہٹ کر اگر کوئی شخص 'دلائل' دینے کی کوشش کرتا تو عوام ہی نہیں علماء تک اُس کی بات سننا درست نہ جانتے تھے، یہاں تک کہ اُس کو مجلس سے اٹھا دیتے رہے تھے، جیسا کہ آئندہ ایک فصل میں آپ دیکھیں گے۔ جب ایک بار پتہ چل گیا کہ یہ شخص ''اصحابِ اھواء'' میں سے ہے؛ یعنی بہکا ہوا ہے؛ اور اُس راہ سے ہٹا ہوا ہے جس پر لوگوں نے اصحابِؓ رسول اللہؐ کو پایا تھا (قطع نظر اس سے کہ وہ کتنا مخلص ہے اور دلیل لانے کی کیسی مہارت رکھتا ہے)، تو اُس کو سننا ہی ایک نادرست بات تھی اور اس میں آدمی کا وقت ہی نہیں بلکہ دین جانے کا اندیشہ تھا۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی ایک روشن بین مقام پر امت کو چھوڑا تھا:

قد تركتكم على البيضاء، ليلها كنهارها، لا يزيغ عنها بعدي إلا هالك[2]

یقیناً میں نے تمہیں ایک چمکتی دمکتی شاہراہ پر (پہنچا کر) چھوڑا ہے، جس کی راتیں بھی اُس کے دنوں کی طرح (روشن) ہیں۔نہیں بھٹکے گا میرے جانے کے بعد اس سے کوئی مگر وہ جس کو ہلاک ہی ہونا ہو'

☆☆☆☆☆

---

(۱) دیکھئے آئندہ فصل میں امام شاطبیؒ کا قول جو انہوں نے ''سنت'' کے مفہوم کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔

(۱) (مسند أحمد ١٦٦٩٢، و سنن ابن ماجة ٤٤، عن العرباض بن سارية، {وصححه الألباني، صحيح ابن ماجة رقم الحديث ٤١، ص ١٣، وأيضا السلسلة الصحيحة رقم الحديث ٩٣٧، ص ٦١٠ ج ٢})

وحی سے رہنمائی لینا چنانچہ ایک ''مسلسل عمل'' رہا ہے۔ یہ کام اُمت کی تاریخ میں آپ 'پہلی بار' نہیں کریں گے۔ باطل میں آپ کچھ یکسر نیا متعارف کرائیں تو اس کا ضرور امکان ہے کیونکہ باطل کسی خاص متعین صورت میں محصور نہیں۔ البتہ حق کے معاملہ میں وہ جو آپ سے پہلے ہیں آپ کو انہی کے پیچھے کھڑا ہونا، انہی کے پیچھے صف بنانا اور انہی کے نشاناتِ راہ ڈھونڈنا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ☆ ۔**پس لازم ہے کہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں، وہ پہلے سے ہی چلا ہوا ہو۔** ''دین'' کے حوالے سے ''تلاشِ حقیقت'' کا یہ ایک نہایت عظیم اور سچا مبحث ہے۔ اس راستے میں اگر کچھ تنوع ہے تو یہ انسانی فطرت کی رعایت ہے اور اس کی گنجائش ہونا بے شمار پہلوؤں سے فائدہ مند ہے...... مگر ایک مجموعی معنیٰ میں آپ اسی راستے پر رہنے کے پابند ہیں اور دوسری طرف اُن اہل زیغ سے جو اِس راستے کو چھوڑ بیٹھیں، کوسوں دور رہنے کے مامور۔ یہ معاملہ اس حد تک واضح ہے کہ ''اہل زیغ'' کا تعین ہی ''اہل اتباع'' کے تعین کے بعد اور اسی کے حوالہ reference سے ہوگا؛ جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا۔

''راستہ اُن لوگوں کا جن پر تو نے انعام کیا، نہ اُن لوگوں کا جن پر غضب ہوا، اور نہ اُن کا جو راہ بھٹکے

واتبع سبيل من أناب الي ☆

☆ التوبہ: ۱۰۰ ''اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں'' (ترجمہ: مولانا محمد جوناگڑھی)

''اتبعوھم''...... یہاں ضمیر ملاحظہ ہو۔ یہاں یہ ضمیر خدا اور رسولؐ کی طرف نہیں جاتی بلکہ سابقین اولین کی طرف یعنی ان لوگوں کی طرف جاتی ہے جو 'نئے آنے والوں' سے پہلے وحی کے متبع اور دین کے پیروکار تھے۔ (اِس آیت پر امام ابن قیم کی بحث میں آگے تفصیل سے بات آ رہی ہے)۔

☆ سورۃ لقمان (۱۵) ''اور پیروی کر ان لوگوں کے راستے کی جو میری طرف رجوع کر چکے''

صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين ☆

سلف کی راہ ہمیں وہ مستحکم بنیاد فراہم کرتی ہے جس میں علم، ایمان، عبادت، تزکیہ، تربیت، معاشرہ، تہذیب، سیاست، خلافت، جماعت، وحدت، اصلاح، جہاد، دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اہل بدعت سے تعامل، اُمت پر آنے والے مختلف ادوار اور متغیر حالات کی نسبت سے متغیر احکام اور مسائل، اور اس میں مدنظر رکھے جانے والے اصول اور ضوابط سب کچھ آتا ہے۔

''اصول اہلسنت'' اِن سب امہات المسائل میں ہمیں ایک راہ بنا کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ہماری اِس بات کا البتہ یہ مقصد نہیں کہ:

- اب ہر 'نئی بات' اور ہر 'نیا کام' کرنے پر پابندی لگ جائے گی،
- یا یہ کہ اپنے دور کے مطابق کوئی لائحہ عمل تجویز کرنے پر سر کھپانا یا اپنے دور کے کسی فقہی مسئلے، یا کسی سماجی الجھن، یا کسی معاشی اشکال، یا کسی سیاسی بحران کا حل پیش کرنا ہی غلط ہو جائے گا،
- یا یہ کہ اپنے دور کے مطابق لائحہ عمل اختیار کرنے یا وقت کے کسی مسئلے کا حل پیش کرنے کے معاملہ میں ''اجتہاد'' کرنا ممنوع ہوگا،
- یا یہ کہ کسی دوسرے کو اجتہاد کا حق دینا یا حتی کہ اجتہاد میں غلطی کر لینے پر کسی کو عذر دینا اور اس باب میں اختلاف کو قبول کرنا ممنوع ٹھہرے گا!

☆ الفاتحہ: ٦ ''راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر (تیرا) غضب ہوا اور نہ وہ جو راہ ہی بھٹک گئے''۔

ایسے مسائل جو امت کو اس سے پہلے پیش نہ آئے ہوں فقہائے اہلسنت کی اصطلاح میں ''نوازل'' کہلاتے ہیں اور جو کہ اسی دور کے فقہاء کو ہی حل کرنا ہوتے ہیں جس کے اندر وہ مسائل پیش آتے ہیں، البتہ اس پورے عمل میں ''پہلوں'' کے فقہی نظائر ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ یعنی سلف کے منہج کو قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی دور کے فقہاء کو فارغ ہو کر بیٹھنا ہوتا ہے؛ ان کے کرنے کا کام پھر بھی ڈھیروں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اتباعِ سلف کا یہ جو پورا مبحث ہے، اس کو یہاں لانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ''فہم دین'' کے حوالے سے آپ اُسی کا ہی ایک تسلسل بنیں، نہ یہ کہ اجتہاد کو معطل کر دیں اور فقہ اسلامی کو آگے بڑھانے اور اس میں نئے سے نئے اضافے کرنے کا عمل موقوف کر دیں۔ اس سے کوئی اگر یہ مطلب لیتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ درست نہیں۔ بلکہ یہ بات خود ''اصول اہلسنت'' سے ہی متصادم ہے؛ خود صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چھوڑے ہوئے کتاب وسنت کے اصولوں کی بنیاد پر، اور آپؐ کے دیے ہوئے سانچوں میں قید رہتے ہوئے، نئے پیش آنے والے مسائل کا بہترین حل پیش کیا۔

اپنے دور کے مسائل اور تقاضوں اور چیلنجوں کو سامنے رکھتے ہوئے، اور نئے نئے انحرافات اور مبنی بر بدعت رجحانات کے بالمقابل، جہاں جہاں فقہی مواقف اختیار کرنے کی ضرورت تھی وہاں وہاں صحابہؓ نے فقہی مواقف اختیار کیے اور اگر اِس عمل کے دوران ان کے مابین اختلافِ فہم واجتہاد ہوا تو اُس کو بھی کھلے دل سے قبول کیا۔ اور جہاں جہاں عقائدی مواقف اپنانا ضروری تھا وہاں وہاں صحابہؓ نے عقائدی اور اصولی مواقف اپنائے اور اُن مقامات پر وہ سب کے سب یک آواز دیکھے گئے (اور وہاں صحابہؓ نے اپنے مابین اختلاف

نام کو بھی نظر نہ آنے دیا)۔ یوں اصول اور فروع کو شریعت سے لینے اور ان کو بنیاد بنا کر آگے چلنے کے معاملہ میں بعد کی نسلوں کیلئے صحابہؓ نے ایک با قاعدہ رخ متعین کر دیا۔

☆☆☆☆☆

اور پھر کوئی یہ بھی دیکھے کہ صحابہؓ کے دیے ہوئے اُس رخ کو آگے تابعینؒ نے کس طرح لیا۔ **کبھی ایک بار تو ایسے ہوا ہو کہ تابعینؒ اور تبع تابعینؒ یہ کہتے سنے گئے ہوں کہ فلاں مسئلہ میں صحابہؓ نے یہ غلطی کر لی اور یہ مسئلہ اب آئندہ سے یوں نہیں بلکہ ووں ہونا چاہیے! کسی ایک مسئلہ میں بعد والوں نے کہا ہو کہ اُن سے ''پہلے والے'' فلاں فلاں مقام پر 'دلیل' اور 'حق' کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں؛ لہٰذا اُن کے زمانے سے چلے آنے والے فلاں فلاں مسئلہ کی 'تصحیح' کر کے اور ان سے ماثور قاعدوں اور کلیوں میں سے فلاں فلاں بات کی 'درستی' کر کے اب مسئلہ یوں اور یوں بیان ہو گا اور ''پہلوں'' کی فلاں اور فلاں بات متروک ٹھہرائی جائے گی!**

''انقطاع'' کسی راستے کے باطل ہونے کی دلیل ہے

''پہلوں کی پیروی'' کی جو کوئی شدید ترین اسپرٹ ہو سکتی ہے وہ ہمیں اُن سب لوگوں کے ہاں بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ جہاں پہلوں کے پیر پڑے، بعد والوں نے کمال دِقت اور باریکی کے ساتھ عین وہیں پر پیر رکھنے کا اپنے آپ کو پابند جانا۔ بلکہ اس کیلئے اُن کے ہاں جو لفظ مستعمل ہوا وہ ''اثر'' تھا۔ ''اثر'' تلاش کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پہلے والوں کا پیر کہاں پڑ چکا ہے تا کہ ہم بھی وہیں پیر دھریں۔ اور ''اقتفاء الاثر'' کا مطلب ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیر وہاں دھرنا جہاں پر پہلوں کے نشانات ہوں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں ''والذین جاؤوا من بعدھم '' محض کوئی تاریخی وقوعہ chronical sequence نہیں بلکہ باقاعدہ ایک منہج بھی ہے؛ یہاں ہر شخص آتا ہے اور اپنے سے پہلوں کے پیچھے جا کھڑا ہوتا ہے۔ اِس کے تاریخی و علمی عمل میں وہ بہترین اضافے کر کے جاتا ہے، مگر ایک ایسے تربیت یافتہ کاریگر کی طرح جو پہلے سے چلی آنے والی عمارت ہی کو اوپر سے اوپر اٹھاتا ہے نہ کہ ایک ایسے اجنبی شخص کی طرح جو سب سے پہلے اس کی بنیادوں کو 'درست' کرنے کی فکر ظاہر کرتا ہے!

ایک عدالت میں آنے والا ہر کیس اپنی نوعیت میں گو دوسرے ہر کیس سے مختلف ہوسکتا ہے اور اس کے باعث ہر نئے کیس کا فیصلہ دوسرے سے مختلف اور نیا ہونا متوقع ہوسکتا ہے؛ اور اس لحاظ سے حاضر وقت عدالتوں اور قاضیوں کا کردار کبھی بھی اور کسی بھی دور میں حاشیائی نہیں ہوسکتا پھر بھی نئے آنے والے مقدمات کی بابت وقت کی عدالتیں گزشتہ عدالتوں کے کیئے ہوئے مقدموں کے فیصلوں کو مدنظر رکھنے کی پابند ہوتی ہیں جن کو کہ نظائر Precedents کہا جاتا ہے۔ ''قانون'' کتابوں میں بے شک موجود ہو مگر عدالتی نظام اس مفروضہ کو درست نہیں سمجھتا کہ کوئی جج دنیا میں آج پہلی بار 'عدل' قائم کرے گا اور یہ کہ کوئی شخص آج پہلی بار ہی قانون کا 'صحیح فہم' پائے گا! بلکہ عدالتی نظام ایک ایسے جج کے تو تیور دیکھ کر ہی اس کو رخصت کر دے گا جو ''قانون'' کو پہلی بار سمجھ کر دکھانے یا ''عدل'' کو پہلی بار قائم کر کے دکھانے کا عندیہ ظاہر کرے گا۔ عدالتی نظام جج کا تعین کرے گا ہی اس صورت میں جب وہ اس میدان میں ''اپنے سے پہلوں'' predecessors کی حیثیت کا اعتراف کرے اور ان کے تسلسل کو لے کر چلنا قبول کرے...... ورنہ وہ عدالتی نظام 'نظام' نہیں کہلائے گا۔ اس کو 'سلسلہ' نہیں کہا جائے گا۔

''نئے'' کا امکان بھی ختم نہ ہو اور ''پرانے'' کی حیثیت بھی مسلم رہے، ایک ''تسلسل'' سے ہماری یہی مراد ہے...... افکار کی دنیا میں اور شریعت کے فہم و تطبیق کے معاملہ میں یہ حُسن صرف منہجِ اہلسنت کو میسر ہے۔

اب یہ ''سلف'' جس چیز کا نام ہے لغوی طور پر بھی وہ اس Predecessors ہی کا ترجمہ ہے جس کا عدالتی تشریح judicial interpretation کے ضمن میں اوپر ذکر ہوا۔ حق یہ ہے کہ ایک سلسلہ کو جو چیز ''سلسلہ'' بناتی ہے وہ Predecessors کا ہی التزام ہے۔ ''قانون'' تو ہمارے لئے اور رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ ہے مگر ہر دور میں سلف کی راہ پر چلتے آنے والوں کی راہ پر چلنا اور ان کے فہم و فقہ کا التزام کرنا دراصل نظائر Precedences کی اتباع ہے جو کہ ''بعد والوں'' کو ''پہلوں'' کے ساتھ جوڑ دیتی ہے اور سب کو ایک ہی آسمانی حقیقت کا مجموعی تسلسل بنا دیتی ہے۔

والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم...... (التوبۃ: ۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا......'' ☆

کیا یہ بات بے انتہا قابل توجہ نہیں کہ تاریخ اسلام میں ایک پوری نسل کا نام ''تابعین'' رکھ دیا جاتا ہے اور قیامت تک ہم ان کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد کی نسل کو ''اَتباعِ تابعین'' کہتے ہیں؟ کیا اپنے دین کی فطرت اور مزاج کو سمجھنے کیلئے یہ ایک بہت کافی بنیاد نہیں؟

☆ ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی

کتاب وسنت کو "سمجھنا" بلاشبہ ہم نے بھی ہے، کہ اس کو سمجھے بغیر ہدایت پانا ممکن ہی نہیں۔ مقصد یہ نہیں کہ کتاب وسنت کو پہلوں نے سمجھ لیا تو اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہم خیر سے کوئی اور کام کریں! دین کا فہم لئے بغیر ہرگز کوئی چارہ نہیں مگراس کا "فہم" ہمیں "سلف" سے اور "سلف کی راہ پر چلتے آنے والوں" سے لینا ہے۔ انہی کے اصولوں سے مدد لینی ہے اور اُمت کے اندر انہی کے "تسلسل" کا حصہ بننا ہے۔

صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين

یہ ہے اصل منہج۔ راستے کے بہت سے گڑھوں میں گرنے سے بچاؤ کا پیشگی بندوبست اسی کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ بہت سے 'دلکش' مناہج اس کے سوا آپ کو 'قائل' بلکہ اپنے 'دلائل' سے گھائل کرنے کو ہر زمانے میں موجود ہوں گے، بڑا کچھ یہاں بنتا اور بگڑتا رہے گا اور کئی عمارتیں یہاں کچھ دیر کیلئے بڑی اونچی جاتی اور پھر کسی نئے تعمیر ساز کی عمارت کو جگہ دینے کیلئے بڑی بے چارگی سے ملبہ بنتی دیکھی جائیں گی، کئی ایک فتنے زبان زد عام ہوجانے کے بعد بالآخر زمانے کی گرد میں روپوش ہورہیں گے اور بڑا غلغلہ کرالینے کے بعد زیادہ ہوا تو لائبریریوں کی شیلفوں میں 'مطالعہ نگاروں' کے منتظر رہ جائیں گے، مگر وہ چیز جس کو چودہ صدیوں سے دوام حاصل ہے اور کبھی اس کا سرنگوں ہونا ممکن نہیں اور جس سے ٹکرانے والا ہر شہ زور بالآخر چت ہوا، وہ اہلسنت کا منہجِ فہم واتباع ہے جس میں اصول اور فروع، التزام اور اجتہاد، اتفاق واجماع اور تعدد آراء، وحدت و یکسانیت اور تنوعِ افکار سب کی حدود متعین ہیں اور جن کو اصحاب رسول اللہ ﷺ سے نہ صرف باقاعدہ تلمذ بلکہ سندِ توثیق پا رکھنے کا شرف حاصل ہے۔

کسی راستے کا ''نیا'' ہونا، اس امتِ بیضاء کے اندر، اُس کے ٹھکرائے جانے کیلئے ایک بہت کافی اور معقول بنیاد ہے۔ اس کے سوا، اس کو مسترد کردینے کیلئے، کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں؛ ''نیا'' ہونے کے سوا اگر اس کے رد کردینے کیلئے کوئی اور دلیل دی جائے گی تو وہ نفل کے باب سے ہوگا نہ کہ فرض کے باب سے۔ ''اتباعِ حق'' کا عمل اس امت کے اندر اس قدر تسلسل کے ساتھ ہوا ہے اور نسل در نسل اور کڑی در کڑی اس شدید حد تک مربوط ہے اور کہیں رکے یا روپوش ہوئے بغیر اصحابِؓ رسول اللہؐ سے سیدھا بے ساختہ یوں جا ملتا ہے، کہ 'پہلوں' کے ذخیروں سے ایک بات کا ثبوت نہ دیا جا سکنا اور ایک مکتبِ فکر کا محض 'تحقیق' کے نتیجے میں سامنے آ جانا اس کے محدَث اور 'فَهُــــوَ رَدٌّ' ہونے پر مہرِ تصدیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ امتِ محمدﷺ ہے کوئی مذاق نہیں!!

ائمۂ اہلِ سنت نے کیا سچ کہا، انقطاع _ یعنی دین کی کسی تعبیر کا پورے ایک تسلسل کے ساتھ پیچھے نہ جا سکنا _ اس کے باطل ہونے کیلئے کافی اور بجائے خود ایک دلیل ہے۔

☆☆☆☆☆

درست ہے کہ اُمت پر اِس بار جو زوال آیا اور جس کی کہ پہلے کوئی نظیر ہی نہیں ملتی، امت کا بہت کچھ بہا لے گیا۔ اس کے باعث ''اہلِ اتباع'' کا وجود شدید حد تک متاثر ہوا اور اس انحطاط کے خود ان پر طرح طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں تک کہ اب وہ نشاناتِ راہ جس پر یہ مجتمع قافلہ صدیوں تک کامیابی کے ساتھ چلتا اور علم وشعور، فکر وبصیرت اور تہذیب ومعاشرت کے سب میدانوں میں دنیا کو متاثر کرتا رہا...... اسکے یہ نشاناتِ راہ اب ایک بڑی حد تک اور ایک بڑی

سطح پر ازسرنو متعارف کرائے جانے کی ضرورتمند ہو چکے ہیں اور اس کے وابستگان کو اس راہ پر چلانا اب ایک محنت طلب کام ہوگیا ہے۔ یوں بھی زوال سے نکل کر عروج کی جانب بڑھنے کا یہ تقاضا ہونا ہی چاہیے ورنہ ہم اسکو زوال مانیں ہی کیوں؟ ...... کہ دورِ زوال کی اپنی یادگاریں ہوا کرتی ہیں اور دورِ عروج اپنی مثالیں رکھتا ہے......

یہ سب صحیح ہے اور اس بحران کا اعتراف کرنے میں ہرگز ہمیں تامل نہیں بلکہ یہ بھی ہمارے مقدمے case کا ہی ایک حصہ ہے۔ لیکن یہ بات کہ ہمیں اس تسلسل کا حصہ بننے کی ہی اب ضرورت نہیں رہی ...... اتباع کا وہ نمونہ.. اُمت کے اجتماع کا وہ یادگار نقشہ جس میں اختلافات کی حدود بھی طے تھیں اور شقاق وانحراف وتاویل کی سرحدیں بھی خط کشیدہ تھیں، تالیفِ داخلی کا تصور بھی واضح تھا اور جہادِ خارجی کا میدان بھی طے تھا...... ''اتباع'' کا وہ پورا پیکیج جس کی ایک ایک تفصیل طے تھی، کوئی یہ کہے کہ اب وہ ہماری ضرورت نہیں.. اور یہ کہ اپنا راستہ اب ہم اس تاریخی تسلسل سے بے نیاز رہ کر بھی بنا سکتے ہیں ......تو یہ سوچ اور ذہنیت دراصل اس دورِ انتشار ہی کی عکاس ہے۔ اور اس بحران کا ہی ایک تسلسل۔ اور اِس انحطاط اور زوال ہی کا ایک منہ بولتا ثبوت۔

من یهده الله فلا مضل له، ومن یضلله فلا هادی له

13

منہجِ سَلَف کولازم پکڑنا

'دِین' کی تحقیق یا 'دِین' کی بابت بحث یا تبادلۂ آراء کا سَلَفی منہج کیا ہے؟

جہاں تک دِین کی بنیادوں کا تعلق ہے: {جیسے دِین کے عقائد، دِین کے بنیادی فرائض، دین کے وہ حلال وحرام، اور وہ اوامر ونواہی، جو روزِ اول سے امت میں معروف چلے آتے ہیں اور قرونِ ثلاثہ میں اُن پر کوئی نزاع نہیں ہوا___اور ظاہر ہے کہ دِین کے ایسے معلوم مسائل ایک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں (دِین کے اِس حصہ کو ''**اُصول دِین**'' بھی کہا جاتا ہے)...... } تو دِین کے اِن معلوم اُمور کی بابت:

- نہ تو بحث جائز ہے،
- نہ اختلاف،
- اور نہ 'ازسرنو تحقیق'۔

''**اصول دِین**'' کے معاملہ میں **نصوصِ شریعت کے 'فہم'** کی بابت جو کچھ سلف سے منقول ہے وہی حق ہے اور اسی کو ماننا واجب۔ اس کے ماسوا باطل ہے اور بدعت وضلالت۔ ان معاملات میں 'بعد والوں' پر کچھ فرض ہے تو وہ یہ کہ 'پہلے والوں' کی راہ پر چلیں۔ بقول عبداللہ بن مسعودؓ: علیکم بالأمر العتیق[1]۔

بہت سے بکھیڑے تو اپنے یہیں سمٹ جاتے ہیں۔

رہ گئے وہ اُمور جو بنیادی عقائد اور بنیادی فرائض میں نہیں آتے نیز حلال وحرام اور جائز وناجائز کے وہ اُمور جو بہت معروف نہیں رہے یا جن میں صحابہ وتابعین وائمۂ اتباع تابعین کے ہاں تعدد آراء پایا گیا، اور جوکہ **"فروعِ دین"** شمار ہوتے ہیں، تو اختلاف کی جتنی گنجائش ان (سلف) کے ہاں پائی گئی گنجائش کا وہی دائرہ ہمارے اختلاف اور ہماری تحقیق اور تنقیح کیلئے بھی باقی رہے گا۔ اِس دائرہ میں:

- تحقیق اور بحث کی گنجائش ہے،
- راجح ومرجوح اور صحیح وغیر صحیح کا تعین بھی دلیل کی قوت کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے، اور
- کسی قابلِ اعتماد شخص (امام، عالم) کی تحقیق پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے، خواہ اس "اعتماد کرنے" کو آپ تقلید کہیں یا کسی اور نام سے پکاریں۔

ہاں یہ بات واضح رہے کہ اس **"فروع دِین"** والے دائرہ میں بھی جو "تحقیق" جائز ہے، اُس کیلئے یہ دو باتیں مطلوب ہیں:

۱) ایک خاص درجہ کی فقہی اہلیت۔

۲) ائمۂ صحابہؓ وتابعینؒ وتبع تابعینؒ کے علمی وفقہی منہج کا عمومی التزام۔

لہٰذا ایک عام آدمی تو ___ جو اِس مطلوبہ اہلیت اور منہج کا حامل نہیں ___ بہرحال یہ تکلیف نہ کرے کہ وہ اپنی 'تحقیق' کے نتائج اُمت کے سامنے لائے اور اپنی اِس 'محنت' سے اُمت کو پریشان اور خراب کرے، خواہ مسئلہ 'فروع' سے متعلق کیوں نہ ہو۔ اس کو چاہیے کہ اِفتاء یا اِظہارِ آراء کا یہ کام ان لوگوں پر چھوڑ دے جو اس کے اہل ہوں۔ علاوہ ازیں، جب وہ کسی اہل علم سے رجوع کرے تو بھی یہ دیکھے کہ اُس کی وہ معتمدہ علمی شخصیت، اصول اور فروع کے معاملہ میں، قرونِ ثلاثہ کے اُس علمی

دائرہ کی پابند ہے یا نہیں۔ جو نام نہاد مجتہد یہ کہے کہ وہ صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ کے فہم کا پابند نہیں، اُس کے تو سائے سے بھی آدمی دور رہے۔

خلاصہ یہ کہ ''اصول دِین'' میں تو کسی کے کلام کرنے کی گنجائش ہی کیا ...... فروع تک میں، وہ شخص جو ایک خاص درجہ کی فقہی اہلیت نہیں رکھتا، دِین خداوندی میں کلام کرنے کا مجاز نہیں۔ ایک عام آدمی کو تو بس یہ کرنا ہے کہ:

۱) جہاں تک ''اصولِ دین'' کا معاملہ ہے تو وہاں صرف اور صرف سلف سے ماثور ایک ثابت و معلوم فہم ہی کو اختیار کرے۔ اُسی کو ڈھونڈے اور اُسی سے تمسک کرے۔

۲) اور جہاں تک ''فروع'' کا معاملہ ہے تو اس میں کسی صاحبِ علم پر اعتماد کرے اور اگر ہو سکے تو اس صاحبِ علم کی دلیل اور حجت کا بھی علم لے، نہ ہو سکے تو اللہ کسی کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ البتہ سب لوگوں پر 'اپنے' اُسی صاحبِ علم سے رجوع کرنے کو ضروری نہ ٹھہرائے بلکہ دوسرے اگر کچھ دیگر ائمۂ علم پر سہارا کرتے ہیں (بات فروعِ دین کی ہو رہی ہے) تو اُنہیں اُن دیگر ائمۂ علم پر اعتماد کرنے دے۔

اوپر جو ایک منہج بیان ہوا، اُس پر استشہاد کیلئے ائمۂ سنت سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:

ترجمانِ مذہبِ سلف حافظ ابن عبدالبرؒ (۳۶۸ھ ...... ۴۶۳ھ) کی مشہور تصنیف ''**جامع بیان العلم وفضلہ**''☆ سے چند اقتباسات:

''سلف نے اس بات سے ممانعت فرمائی ہے کہ خدا تعالیٰ کے بارے یا اس کے اسماء وصفات کے بارہ میں بحث اور اختلاف ہو۔ البتہ جہاں تک فقہی مسائل کی بات

☆ صحیح جامع بیان العلم وفضله۔ تالیف الامام أبی عمر یوسف بن عبدالبر۔ اختصار وتهذیب ابو الاشبال۔ ط: دار ابن الجوزی

ہے تو سلف کا اتفاق ہے کہ ان امور میں بحث اور لے دے ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ (فقہ) ایک ایسا علم ہے جس میں اس بات کی احتیاج ہے کہ بوقت ضرورت فروع کو اصول کی جانب لوٹایا (قیاس کیا) جائے۔ جبکہ اعتقادات کا معاملہ ایسا نہیں کیونکہ اہلسنت والجماعت کے نزدیک اللہ عزوجل کی بابت کوئی بات کی ہی نہیں جاسکتی سوائے اس بات کے جو وہ خود ہی اپنی ذات کے بارے میں بیان کردے، یا جو رسولؐ اس کی بابت بیان کردے، یا جس پر اُمت نے اجماع کرلیا ہو۔ خدا کی مثل کوئی چیز ہے ہی نہیں جس کا کہ، قیاس کے ذریعے یا گہرے غور وخوض کے نتیجے میں، ادراک ہو جایا کرے......

''دِین اس معنی میں کہ وہ اللہ پر ایمان ہے، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور بعث بعد الموت اور یوم آخرت پر ایمان ہے تو اس تک رسائی تو خدا کے فضل سے اس کنواری دوشیزہ کو بھی حاصل ہے جس کو کبھی گھر سے باہر کی ہوا تک نہ لگی ہو۔

(دِین کے اسی پہلو، یعنی ''اصولِ دین'' کی بابت) عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول ہے: جو شخص اپنے دین کو بحثوں کا موضوع بناتا ہے پھر وہ اکثر نقل مکانی کرتا ہے''

(صحيح جامع بيان العلم وفضله ص ٣٨٣)

کچھ آگے چل کر ابن عبدالبر صحابیِؓ رسولؐ حذیفہ بن الیمانؓ کا قول نقل کرتے ہیں:

''تمہارا بھٹک جانا اور صحیح معنوں میں بھٹک جانا یہ ہے کہ پہلے جس بات کو تم منکر جانتے تھے اب اس کو معروف جاننے لگو اور پہلے جس بات کو معروف جانتے تھے اس کو اب منکر جاننے لگو۔ (٢) **خبردار خدا کے دین میں نئے نئے رخ اختیار نہ کرو۔ کیونکہ خدا کا دِین ایک متعین چیز ہے۔** (صحيح جامع بيان العلم وفضله ص ٣٨٤)

یہ ہوا اصول دِین کا معاملہ۔ رہ گئے فروع دِین تو یہاں استدلال اور استخراجِ مسائل ہوسکتا ہے تاہم کچھ خاص اصول اور قواعد کے بغیر نہیں۔ ایک خاص درجے کی فقہی اہلیت بھی یہاں درکار ہے اور صحابہؓ سے چلے آنے والے ایک خاص علمی تسلسل کی ایک باقاعدہ پابندی بھی:

امام محمد بن الحسنؒ فرماتے ہیں:

''جو شخص کتاب اور سنت کا علم رکھتا ہے، اصحاب رسولؐ کے اقوال سے آشنا ہے، اور اُن ترجیحات سے آشنا ہے جنہیں فقہائے مسلمین نے مستحسن مانا ہے، وہی اس بات کا مجاز ہے کہ کوئی مسئلہ اس کے سامنے پیش آئے تو وہ اجتہاد کر کے کوئی رائے اختیار کرے اور اپنی اس رائے کو اپنی نماز یا اپنے روزے یا اپنے حج یا شرعی اوامر ونواہی کے کسی معاملہ میں قابل عمل جانے'' (جامع بیان العلم وفضله ج ۲، ص ۸۵۷)

رہ گیا وہ شخص جو علم کے اس درجے پر نہیں، وہ یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ قرآن یا حدیث کی کتب کھول کر ___ خواہ معاملہ فروع دِین ہی کا کیوں نہ ہو ___ خاص اپنے فہم اور اندازے سے لوگوں کو دِین کے مسئلے بتائے۔ ہاں وہ اہل علم کا فہم نقل کرسکتا ہے۔

عن ابن بريدة عن أبيه، عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: القضاة ثلاثة: قاض فى الجنة واثنان فى النار۔ قاض عرف الحق فقضى به فذلك فى الجنة۔ وقاض قضى بالجهل فذلك فى النار، وقاض عرف الحق وجار فى الحكم فهو فى النار(ابن ماجة ٢٣٨١، ومثله فى ابى دائود ٣٥٧٤، وفى الترمذى ١٣٢٠)

ابن بریدہؒ سے روایت ہے، وہ اپنے والد (بریدہؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قاضی تین طرح کے ہیں۔ ایک جنتی اور دو دوزخی۔ ایک قاضی وہ

ہے جو حق کا علم رکھتا ہے اور پھر اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ جنتی ہے۔ ایک قاضی وہ ہے جو جہالت کی بنا پر فیصلہ دیتا ہے۔ یہ دوزخ میں جائے گا۔ ایک قاضی وہ ہے جو حق کا علم تو رکھتا ہے مگر فیصلہ (پھر بھی) ظلم پہ کرتا ہے۔ یہ بھی دوزخی ہے''۔

مذکورہ حدیث کے حوالہ سے قتادہؒ کہتے ہیں:

میں نے ابوالعالیہؒ سے دریافت کیا: آخر اس شخص کا کیا قصور جس نے اجتہاد کیا اور اجتہاد میں غلطی کر لی؟ ابوالعالیہؒ نے جواب دیا: اس کا قصور یہ ہے کہ جب اس کو علم نہیں تو وہ فیصلہ دینے ہی کیوں بیٹھا''۔ (السنن الکبری للبیہقی ج ۱۵ ص ۹۸)

امام ابن تیمیہؒ مجموع فتاوی میں کہتے ہیں:

''فرمان الٰہی ہے:

وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَداً ذَلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبۃ:۱۰۰)

''مہاجرین وانصار کے سابقین اولین اور وہ لوگ جو راستبازی سے انکے پیچھے چلے اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں، اللہ نے ان کیلئے باغات تیار کئے ہیں، جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی عظیم کامرانی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے پیچھے چلنے والوں کو بھی اپنی خوشنودی اور جنت کی نعمتوں میں شریک کردیا ...... پس جو لوگ سابقینِ اولین کی اتباع کریں گے وہ انہی میں شمار ہوں گے جبکہ یہ لوگ انبیاء کرام کے بعد افضل ترین لوگ ہیں، کیونکہ اُمت محمد ﷺ افضل ترین اُمت ہے جو لوگوں کیلئے نکالی گئی ہے اور یہ لوگ اُمت محمد ﷺ میں افضل ترین ہیں۔

اس لئے علم اور دین میں ان کے اقوال واعمال کی معرفت رکھنا، دین کے جملہ علوم اوراعمال میں متاخرین کے اقوال واعمال کی معرفت سے صد مرتبہ افضل اور مفید تر ہے۔ کہ یہ لوگ اپنے بعد والوں سے افضل ہیں جیسا کہ کتاب اور سنت سے ثابت ہے، پھر جب ایسا ہے تو ان لوگوں کی اقتدا بعد والوں کی اقتدا سے بہتر ہے۔ علم ودین کے سلسلے میں دوسروں کے اجماع ونزاع کی نسبت صحابہ کے اجماع و اتفاق اور انہی میں ہونے والے اختلاف کی معرفت و دریافت بہتر اور افضل ہے......

اسکی وجہ یہ ہے کہ انکا اجماع بہرحال معصوم ہوتا ہے، صحابہ نے اگر اختلاف کیا ہوتو بھی حق انکے اقوال ہی میں سے کسی ایک میں ہوتا ہے۔ بنا بریں انکے اقوال ہی میں حق کی تلاش کی جا سکتی ہے، (جہاں انکا اختلاف ہوا ہو وہاں بھی) انکے اقوال میں سے کسی قول کو اس وقت تک غلط نہیں کہا جا سکتا جب تک کتاب اور سنت سے اسکا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے۔

کیونکہ متأخرین کے بہت سے اصول، اسلام میں محدث اور بدعت شمار ہوتے ہیں جبکہ سلف نے اس سے پہلے اسکے برعکس اجماع کر رکھا ہوتا ہے، پھر اجماعِ سلف کے بعد جو اختلاف پیش آئے تو وہ قطعی غلط اور بے جا ہوتا ہے مثلاً خوارج، روافض، قدریہ، مرجیہ ایسے دوسرے فرقے جنکے اقوال و آراء مشہور و معلوم نصوص کے اور اجماعِ صحابہؓ کے صریح مخالف ہیں۔

اسی طرح دین میں کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں رہ جاتا جس کے بارے میں سلف نے کلام نہ کیا ہو اس لئے اسکی مخالفت یا موافقت میں سلف سے ضرور کوئی نہ کوئی قول مل جاتا ہے"۔

(مجموع فتاویٰ ص۱۳، ص۲۳، ۲۷)

امام اوزاعیؒ اس پورے منہج کو یوں بیان فرماتے ہیں:

''جی مار کر اس سنت راہ پر جمے رہو۔ ان پہلوں کے قدم جہاں رک گئے ہوں وہاں تم بھی ضرور رُک جاؤ۔ جس بات کے وہ قائل ہوئے ہوں تم بھی اسی کے قائل رہو۔ جس بات سے وہ خاموش اور دستکش رہے ہوں تم بھی اس سے دستکش ہی رہو۔ چلو تو اپنے ان سَلَفِ صالح کی راہ پر چلو۔ اس لئے کہ گنجائش کا جو دائرہ ان کیلئے رکھا گیا ہے تمہارے لئے بھی بس اُتنا ہی ہے''۔

(شرح اصول اهل السنة والجماعة للالکائی ۱:۱۵٤)

اور امام احمد بن حنبلؒ اِسی بات کو اِن الفاظ میں رکھتے ہیں:

''اصول (اہل) سنت ہمارے ہاں یہ ہیں کہ اصحاب رسول اللہؐ جس چیز پر تھے، اس سے تمسک کریں۔ انکی اقتدا کریں؛ اور نئی ایجادات کو ترک کریں۔ کیونکہ ہر نئی اپج ضلالت ہے'' (شرح اصول اهل السنة والجماعة للالکائی ۱:۱۵٦)

☆☆☆☆☆

دین کے معاملہ میں صحابہ کا جو ایک عمومی فہم اور منہج ہے، اوپر ہونے والی یہ سب گفتگو اُس چیز سے متعلق ہے۔ رہ گیا 'قولِ صحابیؓ' کا مسئلہ جو خاص مالکی اصول فقہ کا مسئلہ ہے، تو وہ بالکل ایک الگ موضوع ہے[۳]۔ صحابہؓ کے عمومی فہم کو دین کے سب اصول اور سب فروع کی بنیاد بنانے پر ائمہ میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں؛ کوئی ایک بھی امام ایسا نہیں جو اِس منہج پر صاد نہ کرتا ہو۔ سبھی کے نزدیک:

استدلال کے اصول، اعتقاد کے امور، اصول اور فروع میں امتیاز، اجتہاد کے دائرہ کا تعین، سنت اور بدعت میں فرق، ثوابت اور متغیرات میں توازن، اجتماع اور افتراق کے ضوابط، اہل بدعت سے تعامل کی حدود، پھر عبادات، معاملات، حدود،

تعزیرات، اخلاق، سماجیات، تہذیب، حلال وحرام، فرائض و اوامر ایسے سب کے سب امور میں فہمِ دین کی بابت صحابہ کی اتباع لازم ہے۔

ان سب کے سب امور میں، حتیٰ کہ ان امور کی تفصیلات میں:

۱) یا تو صحابہ نے اتفاق کیا ہے اور وہاں ان سے اختلاف جائز نہیں خواہ وہ فقہی مسائل کی بابت کیوں نہ ہو......

۲) یا پھر ان امور میں صحابہ نے کہیں اختلاف کیا ہے (جو کہ فروع میں ہی کیا ہوسکتا ہے نہ کہ اصول میں) وہاں صحابہ کے اقوال(٤) میں سے قولِ راجح اختیار کیا جائے گا۔(٥) یوں مجموعی طور پر اقوالِ صحابہ سے خروج پھر بھی نہ ہوگا......

۳) اور یا پھر صحابہؓ نے خاموشی اختیار کی ہے جس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) صحابہ کی خاموشی اگر عقائد اور ''اصولِ دین'' میں سے کسی امر کی بابت ہے مثلاً خدا کی صفات یا عقیدہ کی تفصیلات وغیرہ۔ تو صحابہ ہی کی طرح اس معاملہ پر خاموش رہنا اور اس کی ٹوہ میں جانے سے احتراز کیے رہنا بعد والوں پر لازم ہوگا

(ب) اور اگر وہ مسئلہ فروعی اور فقہی ہے اور اس کا حل پیش کرنے کی کسی دور میں ضرورت پیش آ چکی ہے تو اس کا حل صحابہ ہی کے اصولِ استدلال اور انہی کے دیے ہوئے ضوابطِ قیاس واجتہاد کو سامنے رکھ کر، وقت کے فقہاء اپنے دور کے اندر تلاش کریں گے۔(٦)

ائمۂ اربعہ ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ وابن حنبلؒ و دیگر ائمہ اہلسنت کے ہاں مختلف پیرایوں میں یہی بات دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی منہج پر (انکے اساتذہ) تابعینؒ نے صحابہؓ سے تربیت پائی اور پھر آگے (انکو) تربیت دی تھی۔ جبکہ اس منہج سے خروج کر لینے والوں کی مذمت میں صحابہ آخری حد تک چلے جاتے رہے اور انکو اہل بدعت وتفرقہ

قرار دیتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن عمرؓ نے قدریہ کے کچھ لوگوں کو، جو کہ قرآن سے استدلال کا اپنے تیئں خوب خوب اہتمام کرتے تھے، پیغام بھیجا تھا کہ اگر وہ پوری زمین کی دولت بھی راہِ خدا میں خرچ کرڈالیں تو اس انحراف کے ہوتے ہوئے جسکو وہ لے کر چل رہے ہیں، یہ عمل انکو کچھ فائدہ دینے والانہیں۔ یہ واقعہ عقیدہ کی بیشتر کتب میں مذکور ہے۔

یوں صحابہؓ کے اس تعامل نے ہی سب سے پہلے ایک طرف ''اہلِ سنت وجماعت'' اور دوسری طرف ''اہلِ بدعت وتفرقہ'' کے مابین ایک واضح لکیر کھینچ دینے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ہی ''اجتہاد'' اور ''انحراف'' کو ضبط میں لانے کی اساس فراہم کی اور ''اِتّباع'' اور ''شقاق'' میں تمیز کرائی۔ پس اس امر کی تاسیس خود صحابہؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ اسی منہج پر تابعینؒ نے صحابہؓ سے تربیت پا کر پھر آگے اَتباعِ تابعینؒ کو تربیت دی۔ فقہاءِ اربعہ، اور کتبِ ستہ (جنکو صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے) کے مصنفین سمیت بیشتر مشہور محدثین، فقہاء اور مؤلفین اسی اَتباعِ تابعین کے دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

اَتباعِ تابعین کا یہ وہ زمانہ ہے جب شریعت کے تقریباً سب علوم کی تدوین ہوئی۔ حدیث، تفسیر، فقہ، مغازی، اصول اعتقاد، ادب، اخلاق، موضوعاتِ ایمان، اصولِ لسان سب کچھ مدون ہوا اور بعد کی نسلوں کیلئے محفوظ کردیا گیا۔ یہ خدا کی رحمت تھی کہ صحابہ کا وہ علم جو اطرافِ عالم میں پھیل چکا تھا اور، فتوحات اور نئی اقوام کی تربیت ایسی کچھ خاص ضروریات کے تحت، عالمِ اسلام کے سب ملکوں، شہروں اور بستیوں میں منتشر تھا ___ تابعین واتباع تابعین کی تابڑ توڑ علمی رحلتوں اور طویل مذاکروں اور شبانہ روز مراجعوں کے اس دیوانہ وار عمل کے نتیجے میں ___

صحابہ کا چھوڑا ہوا یہ علم اپنی تنقیح، چھان پھٹک اور اپنی نقل وروایت اور ذکر ومراجعہ اورشہرہ وتذکرہ میں جب اپنے عروج کو پہنچ چکا اور اس کو جمع وحفظ اور تاصیل وتبویب کیلئے جب بہترین امکانات اور تاریخ کے بہترین اور صالح ترین دماغ حاصل تھے اور اس کثرت سے اور اس وافر انداز میں میسر تھے تو دھڑا دھڑ اس کی تدوین ہوئی اور قیامت تک کی نسلوں کیلئے کمال دیانت اور خوبصورتی سے اس امانت کو محفوظ کرلیا گیا۔جبکہ اس نسل کے گزرنے کے ساتھ ہی فتنوں اور گمراہیوں کا وہ طوفان آیا کہ اہلسنت کا وجود غیر معمولی حد تک سمٹ جانے اور معاشرے کی سطح پر پسپائی اختیار کر جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اور چوتھی صدی ہجری تقریباً ساری ہمیں عالم اسلام پہ ہر طرف باطنی فرقوں، روافض، زنادقہ اور موقعہ پرستوں کی ہی ریاست اور سیادت نظر آتی ہے۔

اس پسپائی کا ذکر ہم ایک الگ فصل (''منہج سلف قرونِ ثلاثہ کے بعد'') میں کریں گے۔ البتہ قرونِ ثلاثہ کے سرے لگنے سے پہلے پہلے **دین کو اسکے مستند مصادر سے لینے اور بدلتے حالات میں اسکے اصولوں کی تطبیق کرنے اور پھر معاشرے کے اندر اس کو لے کر چلنے کا پورا ایک منہج سامنے آچکا تھا**[۷]، **نہ صرف سامنے آچکا تھا بلکہ ایک معلوم روشن شاہراہ کی صورت دھار گیا تھا یوں کہ جب اس سے انحراف ہوتو فورا معلوم ہونے لگے اور طبیعتیں صاف اس سے ابا کرنے لگیں۔ نہ صرف دین پر چلنے اور وحی سے ہر ہر معاملے میں راہنمائی لینے کا ایک منہج ان تین زمانوں کے اندر ایک کامل شامل انداز میں سامنے آچکا تھا اور تنوعِ آراء کی حدود تک اسکے اندر واضح ہو چکی تھیں اور وہ 'سرخ لکیر' تک پوری طرح واضح ہوگئی تھی جس کو پار کرنا اختلاف کی وہ قسم کہلائے جسے ''انحراف'' اور امت کے اندر ''ناقابلِ قبول'' اور ''ناقابلِ**

برداشت'' سمجھا جائیگا...... نہ صرف یہ، بلکہ دین سے ''انحرافات'' (بدعات) کی درجہ بندی کرنے حتیٰ کہ دین سے انحراف اور ابتداع کے مرتکب طبقوں کے ساتھ تعامل اختیار کرنے کی جو جو صورتیں اپنائی جانا ہیں انکو واضح کردینے تک کا عمل پوری کامیابی کے ساتھ ہوگیا تھا۔

اب، یعنی تبع تابعین کا دور گزر جانے کے بعد، معاملہ اگر اُسی زور اور قوت کے ساتھ نہ بھی جاری رہ سکا ــــ اور واقعتاً تبع تابعین کے بعد عالم اسلام کے اطراف واکناف میں اہلسنت کا معاملہ اُس زور وشور سے اور اُس بڑی سطح پر اور اُس عوامی پزیرائی کے ساتھ جاری نہ رہا ــــ تو بھی بہر حال یہ خدشہ نہ رہا تھا کہ اس راستے کا سِرا ہی روپوش ہوجائے گا۔ ذرہ بھر کوشش کر کے معاملے کا سرا پالینا ہر شخص کیلئے ممکن تھا اور آج تک ہے۔

یہ وہ کام تھا جو اسلام کے تین ابتدائی زمانوں میں، کہ جس کی بابت ہم ہر خطبے میں سنتے ہیں: **خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم......**

یہ وہ کام تھا جو اسلام کے تین ابتدائی زمانوں میں، کہ جنکو ''قرونِ سلف'' بھی کہا جاتا ہے، ''قرونِ خیّرہ'' بھی، ''قرونِ نیّرہ'' بھی اور ''قرونِ ثلاثہ'' بھی، بصورتِ اتم تکمیل پاچکا تھا......

'بعد والوں' کو اب انہی کے پیچھے کھڑے ہونا ہے، ورنہ اِن کی جہت آپ سے آپ ''انحراف'' مانی جائے گی اور صریحا ''شقاق''۔

'جہت' کے تعین کے معاملہ میں اسلام کی پہلی تین نسلوں کے اس برگزیدہ عمل نے، جو کہ ڈھائی تین صدیوں پر محیط ہے، مسئلہ کو اتنا ہی سادہ اور آسان کردیا ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب وسنت کے فہم کا یہ اصولی طریقہ نہ اپنایا جائے تو پھر دین کے ہر معاملے میں ہروقت بات کرنے کی گنجائش باقی ہے اور کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ہر کوئی ہی تب اس پر طبع آزمائی کرے گا، جیسا کہ اس وقت عملاً ہو بھی رہا ہے۔

دِین کے باب میں کیا کسی بھی بات اور کسی بھی مسئلے کو کوئی بھی شخص کسی بھی وقت چیلنج کردے اور شرعی نصوص کے کچھ حوالے دے کر اپنے تئیں اس پر کچھ 'دلیلیں' لے آئے تو سب کام چھوڑ کر ہم اس پر بحث کرنا شروع کردیا کریں؟

ایک ایسی زمین جس پر ہم قدم جما کر چل لیں اور پیر پیر پر لامتناہی بحثوں کے سلسلے لے کر نہ بیٹھ جایا کریں، ہماری سب سے پہلی ضرورت ہے۔

منہج سلف اور اصول اہلسنت دراصل ہماری اسی ضرورت کا نام ہے۔

یہ ایک متوازن ترین منہج ہے۔ یکسانیت uniformity اور تنوع diversity کے مابین جو کوئی بہترین توازن ہوسکتا ہے وہ اس منہج میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اتباع اور اجتہاد میں جو کوئی بہترین نسبت تناسب ممکن ہے، وحی اور عقل کا جو کوئی بہترین سنگم ہوسکتا ہے وہ آپکو منہج سلف اور اصول اہلسنت میں ملتا ہے۔ بیک وقت ایک جانب ابداع novelty اور ابتکار creation اور دوسری جانب تسلیم submission اور اذعان surrender اپنی بہترین حالت میں پائے جاتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ آپ سے آپ اور بے ساختہ پائے جاتے ہیں اور دور اول سے لے کر آج تک بغیر کسی انقطاع کے پائے جاتے ہیں۔

حیرانی اور سرگردانی واقعتاً قوموں کو ناکارہ کرکے رکھ دیا کرتی ہے۔ اس کا سدباب ہمارے دِین میں ہم کو منہج سلف کا پابند کرکے باحسن طریق کردیا گیا ہے۔

حواشی:

(حاشیہ: ١)

علیکم بالأمر العتیق ''پرانے ترین دور والی چیز ہی کو لازم پکڑے رہو''

(حاشیہ: ٢)

یعنی صحابہ کے ماحول میں جس چیز کو حق جانا جاتا تھا، آدمی کا بزعم خود کسی 'دلیل' کی بنیاد پر، یا کسی کے بہکانے کے زیر اثر، اسے غلط جاننے لگنا اور جس چیز کو صحابہ کا علم وعمل غلط قرار دیتا رہا ہو، اس کو درست جاننے لگنا۔

(حاشیہ: ٣، ٤)

گو عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک صحابہ کے اقوال میں عندالاختلاف کوئی سا بھی قول اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہی مذہب احمد بن حنبلؒ کا ہے۔مگر جمہور کے نزدیک صحابہؓ کے اقوال میں اختلاف ہو تو ان میں سے قول راجح اختیار کیا جائیگا نہ کہ کوئی سا بھی قول، یعنی دلیل کی بنیاد پر ایک قول کو چھوڑ بھی دیا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے جامع بیان العلم وفضلہ ص ٣٦٦ تا ص ٣٧١) کیونکہ اس طرف صحابہ کا قول ہے تو اس سے متعارض دوسری طرف بھی صحابہ ہی کا قول ہے۔ نیز دیکھئے فصل ''مدرسۂ صحابہ'' کا حاشیہ ١۔

(حاشیہ: ٥)

اس قول راجح کے اختیار میں اگر کوئی اختلاف ہو تو اسکو اختلاف سائغ کہا جائے گا۔یعنی وہ اختلاف جس کیلئے دِین میں گنجائش ہے اور جس کو باقی رکھتے ہوئے بھی مسلمانوں کا اجتماع و اخوت اور انکے باہم مل کر جہاد کرنے اور اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کا عمل متاثر نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ فقہی امور میں اختلاف ہو جانے کے باوجود اگر صحابہ میں وحدت اور اخوت برقرار رہتی ہے تو

اسی اختلاف کے رہتے ہوئے ہمارے مابین اخوت اور وحدت کیوں باقی نہ رہنی چاہیے؟!

(حاشیہ: ٦)

دِین کے اس حصہ میں اگر اختلاف ہو جاتا ہے (یعنی وقت کے اہل علم کا اپنے دور کے کسی معاملہ میں اجتہاد مختلف ہو جانا) تو یہ بھی اختلافِ سائغ شمار ہوگا۔ اختلافِ سائغ، یعنی جس کے ہوجانے پر ایک دوسرے کے سر آنا جائز نہیں۔

(حاشیہ: ٧)

نصوصِ دین میں صحابہ کو جو احکام دیے گئے ہیں، ان احکام کی ایک خاصی بڑی تعداد اگر 'شریعت' سے ہٹ کر تھی اور صحابہؓ کی موت کے ساتھ ہی اُن احکام کو ہمیشہ کی موت مر جانا تھا، جیسا کہ آج کچھ جدت پسندوں کو وہم ہوا ہے...... تو ائمہ اربعہ (تبع تابعین) کے زمانۂ اختتام (شافعیؒ اور ابن حنبلؒ تیسری صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں) اور صحابہؓ کے زمانہ کے مابین سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب **اسلامی علوم اپنے معراج پر پہنچے ہوئے ہیں**؛ اور شریعت کا ایک عظیم الشان مسئلہ (صحابہ کی موت کے ساتھ ہی قرآن کے کچھ نہایت عظیم احکام کی موت) ہے **جسکے سامنے آنیکا وقت 'شرعاً' آیا ہوا ہے**، لیکن یہ کسی کو سوجھتا تک نہیں، اور یہ 'شرعی حقیقت' اپنے انکشاف کیلئے زمانۂ استشراق تک کیلئے بچا رکھی جاتی ہے (کہ جس کی بابت کسی پر اوجھل نہیں: استعماری لشکروں کے زیرِ نگاہ 'ادیان کی ریفارمیشن' کا زمانہ ہے)، یوں 'دو ہزار کچھ' میں جا کر وہ 'شرعی حقیقت' لاہور یا شیخوپورہ کے کسی 'محقق' کی میز سے نکل آتی ہے!

14

مدرسۂ صحابہؓ اساس ہے

دین کے فہم وتفسیر کے معاملہ میں اہل سنت کی پوری عمارت مدرسۂ صحابہؓ کو بنیاد مان کر آگے چلتی ہے۔ اِس مدرسہ کا فہم، اِس کے معیارات، اِس کے ہاں پائے جانے والے قاعدے اور دستور، اِس کے پریکٹس، اِس کے اتفاقات، یہاں تک کہ اِس کے اختلافات، یہاں تک کہ اِس کا بعض اشیاء کی ٹوہ میں جانے سے دستکش رہنا......سب ہمارے فہم کیلئے ایک فریم ورک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اہل سنت کا اعتقاد ہے کہ جوضروری بنیادیں تھیں وہ سب کی سب ''فہم صحابہؓ'' کی صورت میں ہمارے لئے باقاعدہ طور پر ڈال دی گئی ہیں؛ اور یہ کہ تیئیس سال کی محنت سے مبعوثِ خداوندیﷺ نے قیامت تک کی انسانی ضرورت کے جو بنیادی ترین کام سرانجام دیے اُن میں سے ایک یہی تھا کہ: عظیم نفوسؓ کی ایک عظیم تعداد کو ربع صدی تک رات دن کی ٹریننگ دے کر اور اپنی نگرانی میں (اور درحقیقت خدائی نگرانی میں) کچھ نہایت خاص مراحل سے گزار کر ان کو وحی کے فہم اور استیعاب کے قابل بنایا اور اپنی تیار کردہ اِس خصوصی جمعیت کو بعد کی نسلوں کیلئے ایک ''فاؤنڈیشن'' کی صورت دے گئے۔ وحی کے ساتھ تعامل کے معاملہ میں اب جو پیمانے آگے چلیں گے اِس کو بنیاد مان کر چلیں گے۔

'ہم کیا صحابہؓ سے کم ہیں'؟!

یہاں اب کچھ ایسی بولیاں بھی بولی جانے لگی ہیں کہ صحابہؓ کی اتباع کا مطلب ہے کہ جس طرح وہ ہر مسئلہ دلیل سے لیتے تھے ویسے ہی ہم بھی دلیل سے لیں، اور بس۔ اِس معنیٰ میں کہ خود صحابہؓ کے اپنے فہم کی کوئی بائنڈنگ حیثیت نہیں! اور یہ کہ دین کی تفسیر وتاویل کے معاملہ میں صحابہؓ کے یہاں جو قاعدے اور دستور اور جو پریکٹس پائے جاتے تھے ان کی اپنی کوئی الزامی خصوصیت نہیں! دین کے معانی اور مفاہیم **بنیاد سے** اخذ کر کے امت کو دینے کے معاملے میں جو شہسوار حیثیت صحابہؓ کو حاصل تھی، ہم کچھ محنت اور مالش کر لیں تو وہی حق ہمارا بھی ہے؛ ھم رجالٌ ونحن رجال! خاصی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے نقش قدم پر تو ہم چلتے ہیں کہ جس طرح اُنہوں نے رجال کو کوئی حیثیت نہیں دی (گویا اُن کے سوا دنیا میں کوئی رجال بھی پائے جاتے تھے!) اور ہر چیز **ابتدا سے** خود کتاب وسنت سے نکال کر دکھائی وہی کام تم لوگوں کے سامنے ہم بھی کر کے دکھاتے ہیں؛ لہٰذا صحابہؓ کے نقش قدم پر چلنے والے تم ہوئے یا ہم؟ تم تو ہر چیز صحابہؓ سے جا کر لیتے ہو، حالانکہ صحابہؓ ہر چیز کتاب وسنت سے لیتے تھے، لہٰذا تم صحابہؓ کے نقش قدم پر چلنے والے کیسے ہوئے؟! صحابہؓ کے نقش قدم پر چلنا ہے تو وہی کام کرو جو صحابہؓ نے کیا، یعنی ہر چیز **ابتداء سے اور براہِ راست** کتاب وسنت سے لینا، یہاں تک کہ 'کتاب' اور 'سنت' ایسے مصادر کی تعریف definition اور تعین specification بھی **ابتداء سے** کرنے کو جی چاہے تو کر لینا، اور جو کہ ہم آئے روز کرتے ہیں!

یعنی شریعت کے ساتھ ایک کھلواڑ۔ جس کی کچھ وضاحت آگے آ رہی ہے۔

مختصر یہ کہ صحابہؓ نے فہمِ دین کی ابتداء کی تھی اور تفسیرِ شریعت کی اساس رکھی

تھی؛ یہی کام جب تک ہم نہ کر لیں چین نہ لیں گے......؛ اور ''صحابہؓ کے نقش قدم پر چلنا'' تمہارے تئیں اگر کوئی دین کا مسئلہ ہے تو اس کی بھی درحقیقت یہی تفسیر ہے!

☆☆☆☆☆

یہ رتبۂ بلند ..!

''صحابہؓ'' اسلام کی محض ایک نسل کا نام نہیں، ''صحابہؓ'' دین کا بنیادی مدرسہ ہے۔ ''صحابہؓ'' تاریخ کے اُس خوبصورت ترین علمی واقعہ کا نام ہے جو معلم اعظمﷺ و مربیِ اعظمﷺ __ کے اپنے زیر نگاہ بلکہ اپنے ہاتھوں پروان چڑھا، اور جس کی ایک ایک اینٹ آپﷺ کے اپنے دست مبارک سے لگی۔

نہ اِس مدرسہ کے استاد جیسا کوئی استاد اور نہ اِس میں پڑھنے والوں جیسا کوئی پڑھنے والا۔ ہو بھی کس طرح، اسلام کی اگر کوئی ایک نسل ایسی ہے کہ جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ اُس کے فہمِ دین کو نبی ﷺ نے اپنے ہاتھوں بنایا اور خود تراشا اور جیسی چاہی اُس کو صورت دی اور اپنے جیتے جی یہ تسلی کی کہ اللہ کے دین کو زمین پر جس طرح سمجھا جا رہا ہے وہ بالکل صحیح سمجھا جا رہا ہے، تو صرف اور صرف وہ صحابہؓ کی نسل ہے۔

اسلام کی کوئی ایک نسل جس کی بابت بالیقین کہا جا سکے کہ **دین اتارنے والے** نے صرف یہی تسلی نہیں کی کہ اُس نسل کو جو دین پہنچا وہ بالکل صحیح پہنچا بلکہ __ اپنے رسولﷺ کے ان کے مابین ہونے کے ناطے __ اِس بات کو بھی یقینی بنایا کہ وہ جو کچھ اتار رہا ہے وہ زمین پر صحیح طرح سمجھا بھی جا رہا ہے، تو وہ صحابہؓ کی نسل ہے۔

ایک ایسا دور جب زمین پر ہونے والے واقعات کی تصحیح اور تصویب آسمان خود کرتا رہا تھا......!

''آسمانی تصحیح اور تصویب'' کی یہ ضمانت اصحابِ رسول اللہؐ کے سوا اِس امت کی کس نسل کو حاصل ہے؟ اُن کو ٹوکنے کو اور اُن کی تصحیح کرنے کو تو آسمان سے آیات اتر آیا کرتی تھیں!

تو پھر اہل سنت یہ اعتقاد کیوں نہ رکھیں کہ فہم وتفسیرِ دین کے معاملہ میں صحابہؓ معیارِ حق ہیں؟ صحابہؓ کے فہم دین کو اور آج کے کچھ محققین کے فہم دین کو ایک ہی سطح پر رکھنا آخر کیونکر روا ہونے لگا؟ **ما لکم کیف تحکمون؟**

تورات کے برعکس، قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تیئیس برس کے عرصے میں اتارا گیا......تو اِس امتِ بیضاء کو اس سے جو فائدہ ہوا وہ یہ کہ: وہ باہمت نفوس جن کو اصحابِ رسول اللہؐ کہا جاتا ہے، اِس وحی کا ایک ایک سبق ساتھ ہی ساتھ اُس معلم اعظمؐ سے پڑھتے اور سمجھتے جائیں اور اِس کے ایک ایک اشارہ کو پا لینے میں وقت اور مواقع کے حساب سے بھی کوئی دِقت نہ پائیں؟ اندازہ کیجئے تیئیس سال کا کورس اور صبح تا شام کلاسیں! جبکہ وہ معلم اعظم ﷺ ان کے مابین ہو ہی اِس لئے کہ وہ انہیں قرآن کے معانی اور مفاہیم پڑھا کر جائے اور اپنے اوپر اترنے والی حکمت کو ان کی گھٹی میں اتارے؟! جس کا منصب ہی یوں بیان کیا گیا ہو کہ: **یعلمهم الکتاب والحکمة**. جبکہ اُن برگزیدہ نفوس کی سب سے بڑی ترجیح ہو ہی یہ کہ وہ علم کے اِس پاکیزہ ترین اور خالص ترین سرچشمہ ﷺ سے اُس کے جیتے جی خدا کا دین سمجھ لیں؟!

ایک ایسے مدرسہ کے نامور ائمہ و اساتذہ کو فہمِ دین کا ''معیار'' نہ مانا جائے.. اور ہر شخص ہی کو، جو اپنے تیئں 'دلیل' دے لے، اُن کے برابر منصب پر لا بٹھایا جائے!؟

وہ مدرسہ جس میں صحابہؓ نے دین خداوندی پڑھا اور پھر پڑھایا، فہم دین کی وہ عین صحیح سمت ہے جو اِس امت کی بالکل ابتدا میں رکھ دی گئی **(اور آپ تسلیم کریں گے کہ وہ ابتدا میں ہی رکھی جانی چاہیے تھی)**۔ فہم دین کی یہ سمت جس کا نام ''مدرسۂ صحابہؓ'' ہے، اور جس کی اساس دورِ تنزیل میں رکھی گئی؛ اِس میں کوئی غلطی اور کجی ہوتی تو وحی اِس کو خود ہی سیدھا کر دیتی۔ آخر کتنے ہی مواقع ایسے ہوئے جہاں صحابہؓ کی تصحیح کرنے کو قرآن کی آیت اترتی یا پھر رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس وضاحت فرماتے۔ غرض وحی کے دونوں **مصدر صحابہؓ کو صرف دین پہنچاتے نہیں رہے، بلکہ جہاں ضرورت ہوئی ان کے فہم و عمل کو درست بھی کرتے رہے۔**

چنانچہ ایک طرف صحابہؓ کی حرص کہ وہ دین خداوندی کو اُس کی صحیح ترین روح کے ساتھ اس کے مصدر ___ رسالت مآب ﷺ ___ سے سمجھ لیں اور دوسری طرف رسالت مآب ﷺ کی حرص کہ وہ ان کو دین کی ایک ایک بات صحیح طرح سمجھا دیں اور ان کی ایک ایک غلطی درست کر دیں.. کیا اِن ہر دو پہلو سے ''مدرسۂ صحابہؓ'' تاریخ کے ہر 'دبستان' سے منفرد نہیں ہو جاتا؟

صحابہؓ کے ایمان اور صحابہؓ کی اتباع کو بعد والوں کیلئے ایک معیار بنا دیا جانا اللہ کے فضل سے دین کے اندر اظہر من الشّمس ہے اور اِس بات کو وہی شخص 'متنازعہ' جانے گا جس کو اللہ نے بصیرت سے آخری حد تک محروم کر رکھا ہو۔

وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سالہا سال صف بنا کر کھڑا ہوتا اور نماز پڑھتا رہا ہو.. جو برس ہا برس رسول اللہ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے نمازیں پڑھ چکا ہو، جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے زیر تربیت اصحابؓ کی تصحیح اور تصویب کے معاملہ میں آخری درجہ کے حریص ہوں، وہ خوش نصیب اُس شخص کی طرح کیونکر ہو سکتا

ہے جو نماز کو کچھ نصوصِ شریعت سے از راہِ استدلال و استنباط سمجھ رہا ہو؟! یہی مثال درحقیقت دین کے دیگر امہات المسائل کی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کے زیرِ تعلیم وزیرِ تربیت پروان چڑھنے والے مبارک نفوس، جو کہ لسانِ عرب کے ماہر، ذہانت وفطانت میں یکتا، تقویٰ میں بے مثال اور علم کے پہاڑ ہیں، ''سنت'' کا ایک مفہوم رکھتے ہوں اور آج کا کوئی شخص اپنی 'تحقیق' کی بنیاد پر ہمیں 'سنت' کا ایک مفہوم تجویز کر کے دے؟! ''ایمان'' کی تعریف ایک وہ ہو جو ہمیں اُس مدرسہ سے ملے جس نے ''ایمان'' کو براہِ راست نبی ﷺ سے لیا، جبکہ 'ایمان' کی ایک تعریف وہ ہو جو کوئی صاحب ہمیں آج کر کے دیں؟! مسئلۂ ''تقدیر'' پر نصوص کا اقتضاء اور نصوص کے مابین توفیق اور تطبیق ایک وہ ہو جو ہمیں مدرسۂ اصحابِ رسول اللہؐ سے ملے اور مسئلۂ تقدیر کی ایک وضاحت وہ ہو جو ہمیں آج لاہور یا کراچی کا کوئی شخص کر کے دے! ''اللہ کی صفات'' ایسے نازک ترین مسئلہ پر ایک وضاحت اور تفہیم ہمیں مدرسۂ اصحابِ رسول اللہؐ سے میسر ہو اور ایک تفہیم ہمیں آج کا کوئی 'genius' کر کے دے اگرچہ وہ اپنے فہم پر اپنے تئیں 'شرعی دلائل' کا انبار کیوں نہ رکھتا ہو (قدریہ، جہمیہ اور معتزلہ بھی اپنے تئیں 'دلائلِ شریعت' کا ایسا ہی ایک انبار رکھتے تھے جن کو کہ صحابہ وسلف کے مدرسہ سے بربادی کی وعیدیں سنائی گئیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ صحابہ کی راہ سے ہٹے ہوئے ہر شخص ہی کو اپنی بات شریعت سے 'نہایت واضح انداز' میں ثابت ہوتی نظر آتی ہے)۔

اصحابِ رسول اللہؐ کے تلامذہ کا یہ مدرسہ تاریخ میں ''سلف'' کے نام سے منسوب ہے۔ اِس کے ہاں چلنے والے علمی معیارات اور فہم قرآن وسنت کے نظائر

precedents بعد والوں کیلئے حجر اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا التزام امت کی آئندہ نسلوں کیلئے ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِس مدرسہ کی فکری اساس ہے: **صحابہؓ کی امامت اور ان کے فہم کی حجیت۔**

جہاں متبوع کے طور پر معیار رسول اللہ ﷺ ہوئے وہاں تابع کے طور پر معیار اصحابِ رسول اللہؐ ہیں۔ مقتدیٰ کے طور پر معیار رسول اللہؐ اور مقتدِی کے طور پر معیار صحابہؓ۔

فَإِنْ آمَنُواْ بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَواْ (البقرۃ:۱۳۷)

''اب اگر یہ بھی ویسا ہی ایمان لے آئیں جیسا ایمان تم (صحابہ) لے کر آئے ہو، تو یہ بھی ہدایت پا گئے''

☆☆☆☆☆

کسی مبحث کو جاننے اور پڑھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک باقاعدہ انداز میں یہ دیکھ اور سمجھ لیا جائے کہ اُس مسئلہ پر علم کے پہاڑ ائمہ کیا کہتے گئے ہیں۔ اُسی مبحث کو جاننے اور پڑھنے کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ دیکھیں اُس موضوع پر جہلاء کیا کہتے ہیں۔ فتنوں سے بھرے ہوئے اِس دور میں آپ اپنے لئے کیا اختیار کرتے ہیں، یہ آپ پر ہے، مگر ہم یہ واضح کر دینا چاہیں گے کہ صحابہؓ کے منہج اور صحابہؓ کے فہم کی اتباع کے وجوب پر ہم یہاں ائمۂ علم کے جو اقوال اور تقریرات دیں گے وہ کوئی 'شاذ' کی قبیل سے نہیں جو کسی سے زبان یا قلم کی 'لغزش' کے طور پر صادر ہو گیا ہو! یہ سب اقول اور نقولات جو آپ یہاں دیکھیں گے، اہل سنت کا ایک نہایت معروف مبحث ہے، اور یہ بات آپ اہل علم کے ہاں یقیناً چیک کر سکتے ہیں:

☆☆☆☆☆

صحابہؓ کا اتباع، اہلسنت کے سب مذاہب کے نزدیک واجب ہے

امام شاطبیؒ: سنت کی تعریف کرتے ہوئے

جیسا کہ گزشتہ فصل میں ہم بیان کر آئے ہیں، ''سنت'' کو پانا علمائے سلف کے یہاں متعدد پہلوؤں سے صحابہؓ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ''سنت'' کا رپورٹ ہونا ہے تو تب، ''سنت'' کا کسی کے ہاں پایا جانا ہے تو تب، ''سنت'' کا سمجھا جانا ہے تو تب، اور ''سنت'' کی تطبیق ہے تو تب، ہر چیز پر اتھارٹی صحابہؓ ہیں۔ اصولِ فقہ کا ایک نہایت عظیم نام امام شاطبیؒ لکھتے ہیں:

ويطلق أيضا لفظ السنة على ماعمل عليه الصحابة وُجِدَ ذلك فى الكتاب أو السنة أو لم يوجد لكونه اتباعاً لسنةٍ ثبتت عندهم لم تنقل إلينا أو اجتهادا مجتمعاً عليه منهم أو من خلفائهم، فإن إجماعهم إجماع, وعمل خلفائهم راجع أيضا إلى حقيقة الإجماع من جهة حمل الناس عليه حسبما اقتضاه النظر. (الموافقات: ج٤, ص ٤)

نیز لفظ ''سنت'' کا اطلاق اُس چیز پر بھی ہوتا ہے جس پر صحابہؓ کا عمل پایا گیا ہو، چاہے وہ چیز کتاب میں اور سنت میں ملے اور چاہے نہ ملے۔ یہ چیز اُس کی اِس حیثیت کے باعث کہ وہ ایک ایسی سنت کی اتباع ہو جو اُن (صحابہؓ) کے یہاں پایۂ ثبوت کو پہنچی ہو مگر ہم تک نقل ہونے میں نہ آئی ہو، یا ایک ایسا اجتہاد ہو جس پر اُن کا یا اُن کے خلفاء کا اتفاق پایا گیا ہو، کیونکہ اُن کا اجماع ہی (دراصل) اجماع ہے۔ جبکہ اُن کے خلفاء کا جو عمل ہے وہ بھی اجماع کی حقیقت ہی کی طرف لوٹتا ہے؛ اور وہ اس جہت سے کہ لوگوں کو حسب اقتضائے نظر (خلفاء کی طے کردہ) اُس چیز پر باقاعدہ چلایا جاتا تھا۔

امام شافعیؒ "علم" کے مراتب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تقریراتِ امام شافعیؒ

والعلم طبقات: الأولى: الكتاب والسنة إذا ثبتت السنة. ثم الثانية: الإجماع فيما ليس فيه كتاب ولا سنة. والثالثة: أن يقول بعض أصحاب النبى ﷺ ورضى عنهم. والرابعة: اختلاف أصحاب النبى ﷺ ورضى عنهم۔ والخامسة: القياس على بعض هذه الطبقات (المدخل إلى السنن للبيهقى: الجزء الأول, ص ٤٤، الأثر رقم: ٣٦)

علم متعدد طبقات ہے:

پہلا: کتاب اور سنت، جبکہ سنت ثابت ہو چکی ہو۔

دوسرا: اجماع، اُس معاملہ میں جس میں کتاب یا سنت سے کوئی چیز نہ پائی گئی ہو۔

تیسرا: نبی ﷺ کے بعض اصحابؓ سے ایک قول پایا گیا ہو۔

چوتھا: نبی ﷺ کے اصحابؓ کا اختلاف (یعنی جو جو اختلاف ہوا، اس سے بھی "علم" ثابت ہوتا ہے)۔

پانچواں: (علم کے) ان طبقوں میں سے کسی ایک (کو بنیاد بنا کر اُس) پر قیاس کرنا۔

اس سے اگلے اثر میں امام بیہقیؒ، امام شافعیؒ کا ایک اور قول نقل کرتے ہیں:

وهم فوقنا فى كل علم، واجتهاد، وورع، وفعل، وأمر استدرك به علم، واستنبط به، وآراؤهم لنا أحمد، وأولىٰ بنا من آرائنا عندنا لأنفسنا، والله أعلم، **ومن أدركنا ممن أرضىٰ أو حُكِيَ لنا عنه ببلدنا، صاروا فيما لم يعلموا لرسول الله ﷺ فيه سنةً إلىٰ قولهم إن اجتمعوا، وقول بعضهم إن تفرقوا، فهكذا نقول إذا اجتمعوا أخذنا باجتماعهم، وإن قال واحدهم ولم يخالفه**

غيره أخذنا بقوله، فإن اختلفوا أخذنا بقول بعضهم ولم نخرج من أقاويلهم كلهم۔ (المدخل إلى السنن ، ص ٤٥ ، الأثر رقم: ٣٧)

صحابہؓ ہم سے اوپر ہیں ہر علم، ہر اجتہاد، ورع، اور ہر فعل کے اندر۔ اور ہر ایسے امر میں جس کے ذریعے سے علم شرعی کا استدراک ہوتا ہو، یا استنباط ہوتا ہو۔ اُن کی آراء ہمارے حق میں کہیں زیادہ قابل ستائش ہیں، اور ہماری اپنی آراء سے جو ہم اپنے لئے اختیار کریں ہمارے حق میں اولیٰ تر ہیں۔ اللہ اعلم۔

وہ سب بزرگانِ دین جن کو میں (امام شافعیؒ) باعث اطمینان جانتا ہوں، جن کو میں نے خود پایا یا اپنے علاقہ میں اُن کا تذکرہ کسی سے سنا، ان کا یہی دستور تھا کہ جس چیز میں اُن کو رسول اللہ ﷺ کی کوئی سنت معلوم نہ ہوتی تو وہ صحابہؓ کے قول پر چلے جاتے جب صحابہؓ اُس قول پر مجتمع ہوتے، اور اگر صحابہؓ نے اختلاف کیا ہوتا تو اُن میں سے بعض کے قول پر چلے جاتے۔ ایسا ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ جب صحابہؓ متفق ہوں تو ہم اُن کے اتفاق کو اختیار کریں گے، اور اگر وہ صحابہؓ میں سے کسی ایک کا قول ہو اور کسی دوسرے صحابیؓ نے اُس سے مخالف رائے نہ رکھی ہو تو ہم اُس کو اختیار کریں گے۔ اور اگر صحابہؓ کا اختلاف ہوا ہو تو ہم صحابہؓ ہی کے ایک فریق کا قول اختیار کریں گے، اور بالجملہ اُن سب کے اقوال سے باہر نہ جائیں گے۔

امام بیہقیؒ اپنی ایک دوسری کتاب میں امام شافعیؒ کا قول لاتے ہیں:

عن الربيع بن سليمان، قال: قال الشافعي: لا يكون لك أن تقول إلا عن أصل، أو قياساً على أصل. والأصل: كتاب أو سنة، أو قول بعض أصحاب رسول الله ﷺ ، أو إجماع الناس

(مناقب الشافعي للبيهقي: الجزء الأول ص ٣٦٧)

ربیع بن سلیمان سے روایت ہے، کہا: فرمایا امام شافعیؒ نے:

تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم -(دین میں) کوئی بات کہو اِلا یہ کہ وہ کسی اصل کی بنا پر ہو یا پھر وہ کسی اصل پر قیاس کیا گیا ہو۔ اور اصل ہے: کتاب، یا سنت، یا رسول اللہ ﷺ کے بعض اصحابؓ کا قول، یا لوگوں کا اجماع۔

تھوڑا آگے چل کر بیہقیؒ امام شافعیؒ سے ایک اور اثر لاتے ہیں۔ اِس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ کس طرح یہ ائمۂ سنت اپنے سے پہلے فقہاء کے فقہی تسلسل کا پابند رہتے ہیں اور ان کے تسلسل سے ہٹ کر امت کو بالکل ہی ایک نیا قول نکال کر دینے سے محترز رہتے ہیں:

وقال: فإن لم يكن على القول دلالة من كتاب ولا سنة، كان قول أبى بكر، أو عمر، أو عثمان، أو على -رضى الله عنهم - أحب إلىَّ أن أقول به من قول غيرهم إن خالفهم، من قِبَل أنهم أهل علمٍ وحكام۔ ثم ساق الكلام إلىٰ أن قال: فإن اختلف الحكام استدللنا الكتاب والسنة فى اختلافهم، فصرنا إلى القول الذى عليه الدلالة من الكتاب والسنة، وقلَّ ما يخلو اختلافهم من دلائل كتاب أو سنة، وإن اختلف المفتون يعنى من الصحابة بعد الأئمة بلا دلالة فيما اختلفوا فيه، نظرنا إلى الأكثر، فإن تكافؤوا نظرنا إلىٰ أحسن أقاويلهم مخرجا عندنا، **وإن وجدنا للمفتين فى زماننا وقبله اجتماعا فى شىءٍ لا يختلفون فيه تبعناه**، وكان أحد طرق الأخبار الأربعة وهى: كتاب الله، ثم سنة نبيه ﷺ، **ثم القول لبعض أصحابه، ثم اجتماع الفقهاء**، فإذا نزلت نازلة **لم نجد فيها واحدة من هذه الأربعة الأخبار، فليس السبيل فى الكلام فى النازلة إلا اجتهاد الرأى۔**

(المدخل الى السنن للبيهقى: ص ٤٥ - ٤٦، الأثر رقم: ٣٩)

شافعیؒ مزید کہتے ہیں: پھر اگر ایک قول پر کتاب یا سنت سے کوئی دلالت نہ ملتی ہو، تو قولِ ابو بکرؓ، یا قولِ عمرؓ، یا قولِ عثمانؓ، یا قولِ علیؓ مجھے ان کے ما سوا کسی بھی بزرگ کے قول کی نسبت مرغوب تر ہوگا، اگر ان میں اختلاف ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ یہ (چاروں خلفاء) اہل علم ہیں اور (صحابہؓ کے) قضاء کے منصب پر رہے ہیں۔ پھر آگے چل کر امام شافعیؒ کہتے ہیں: پھر اگر یہ قضاۃ اختلاف کریں تو ہم ان کے اختلاف کے معاملہ میں کتاب وسنت سے استدلال لیں گے، اور اُس قول کی جانب جائیں گے جس پر کتاب اور سنت سے دلالت پائی جاتی ہو، اور کم ہی کبھی ہوا ہے کہ ان کے اختلاف میں کتاب وسنت سے دلالت نہ پائی جاتی ہو۔ اور اگر ان (چاروں ائمۂ صحابہؓ) کو چھوڑ کر دیگر مفتیانِ صحابہؓ کے مابین اختلاف ہوا ہو، اور ان کے اختلاف پر (کتاب وسنت سے) دلالت نہ پائی جاتی ہو، تو ہم دیکھیں گے اکثریت کس طرف گئی ہے۔ اگر وہ ہم پلہ ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں سے کس کا قول ہمارے خیال میں سب سے بہتر انداز میں استخراج کیا گیا ہے۔ **اگر ہم پائیں کہ ہمارے زمانے اور اس سے پہلے کے مفتیان کا کسی بات پر اجماع ہے اور ان میں اس پر اختلاف نہیں ہوا ہے، تو ہم اُسی کی پیروی کریں گے**، اور وہ ''اخبار'' کے باقاعدہ چار طرق میں سے ایک طریق ٹھہرے گا جو کہ یہ ہیں: اللہ کی کتاب۔ پھر اس کے نبیؐ کی سنت۔ پھر آپؐ **کے اصحابؓ میں سے بعض کا قول، پھر فقہاء کا اجماع**۔ ہاں اگر کوئی نازلہ (نیا مسئلہ) سامنے آئے اور اُس **کی بابت ہمیں ''اخبار'' کے اِن چاروں میں سے کسی ایک بھی طریق سے کچھ نہ ملے تو پھر اُس نازلہ کی بابت کوئی موقف اختیار کرنے کے معاملہ میں خود اپنی رائے کا اجتہاد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔**

امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مذھب ھے

پیچھے آپ ”علم“ کے طبقات کے بیان میں امام شافعیؒ کا کلام دیکھ آئے ہیں۔ سبحان اللہ، عین ویسا ہی کلام دیکھئے آپ کو فقہائے احناف کے ہاں ملتا ہے:

قال محمد بن الحسن: ”العلم أربعة أوجه: ما كان في كتاب الله الناطق وما أشبهه، وما كان في سنة رسول الله ﷺ المأثورة وما أشبهها، وما كان فيما أجمع عليه الصحابة وما أشبهه، وكذلك ما اختلفوا فيه لا يخرج عن جميعه، فإذا وقع الاختيار فيه على قول فهو علم يقاس عليه ما أشبهه، وما استحسنه عامة فقهاءِ المسلمين وما أشبهه وكان نظيرا له۔ قال: ولا يخرج العلم عن هذه الوجوه الأربعة“۔

(جامع بيان العلم وفضله، لابن عبد البر: ص ٧٦٠، الأثر رقم: ١٤٠٥)

امام محمد بن الحسنؒ کہتے ہیں:

”علم“ چار انداز سے ہے:

- جو اللہ کی کتاب میں ناطق ہو، اور جو اس سے مشابہ ہو،
- اور جو رسول للہ ﷺ کی سنتِ ماثورہ میں ہو، اور جو اس سے مشابہ ہو،
- اور وہ چیز جس پر صحابہؓ نے اجماع کر رکھا ہو، اور جو اس سے مشابہ ہو،
- اسی طرح جو جو صحابہؓ میں اختلاف ہوا ہے، علم مجموعی طور پر اس سے باہر نہیں ہوتا؛ پس اختلافاتِ صحابہؓ میں سے جب کسی ایک قول کو اختیار کر لیا جائے تو وہ ”علم“ ہے، جس پر قیاس ہو سکتا ہے، اور جو اس سے مشابہ ہو۔ اور وہ چیز جس کا عام فقہائے مسلمین نے استحسان کیا ہو اور جو اس سے مشابہ ہو اور اس کی نظیر ہو،

امام محمدؒ کہتے ہیں: ”علم“ اِن چار وجوہ سے باہر نہیں ہوتا۔

عن أبی یوسف قال: سمعت أبا حنیفة یقول:

"إذا جاء الحدیث عن النبی ﷺ عن الثقات أخذنا بہ، فإذا جاء عن أصحابه لم نخرج عن أقاویلهم، فإذا جاء عن التابعین زاحمتهم".

(أخبار أبی حنیفة وأصحابه: ص ٢٤، مؤلفه: الإمام المحدث المؤرخ الکبیر الفقیه القاضی: أبو عبد الله حسین بن علی الصیمری، المتوفیٰ ٤٣٦ ھ)

امام ابو یوسف روایت کرتے ہیں، کہا: میں نے سنا امام ابو حنیفہؒ کو فرماتے ہوئے:

''اگر حدیث آ جائے نبی ﷺ سے بذریعہ ثقہ راویوں کے، تو ہم اُسی کو اختیار کریں گے۔ اور اگر آ جائے آپؐ کے **اصحابؓ سے تو ہم اُن کے اقوال سے باہر نہیں جائیں گے**۔ اور اگر آ جائے تابعین سے تو وہاں البتہ میں ان کے برابر بھیڑ کروں گا''۔

یہ تو واضح ہی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اپنے آپ کو نہ صرف حدیث بلکہ اقوالِ صحابہؓ کا پابند رکھتے تھے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور جو کہ امام ابو حنیفہؒ کی بابت لکھی گئی کتب میں نہایت معروف ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ امام ابو حنیفہؒ فقہائے کوفہ (جو کہ درحقیقت مدرسۂ علیؓ وابن مسعودؓ ہے) کے بھی شدید طور پر پابند تھے اور اپنے آپ کو اُنہی کا تسلسل بنا کر رکھتے تھے:

عن الحسن بن صالح قال: کان أبو حنیفة شدید الفحص عن الناسخ من الحدیث والمنسوخ، فیعمل بالحدیث إذا ثبت عنده عن النبی ﷺ وعن أصحابه، وکان عارفا بحدیث أهل الکوفة وفقه أهل الکوفة، شدید الاتباع لما کان علیه الناس ببلده. (أخبار أبی حنیفة وأصحابة: ٢٥)

حسن بن صالح روایت کرتے ہیں، کہا: امام ابو حنیفہؒ حدیث کے ناسخ ومنسوخ کی جانچ پرکھ میں نہایت شدید تھے۔ آپؒ حدیث پر عمل کرتے اگر حدیث آپؒ کے

نزدیک ثابت ہوتی نبی ﷺ سے، اور آپؐ کے اصحابؓ سے۔ امام صاحبؒ اہل کوفہ کے ہاں پائی جانے والی حدیث اور اہل کوفہ کی فقہ ہر دو کے نہایت واقف تھے۔ آپ اُس چیز کی اتباع میں نہایت شدید تھے جس پر آپ کے شہر کے فقہاء لوگ پائے گئے تھے۔

ادب القاضی (للخصافؒ، یکے از فقہائے احناف متوفیٰ ۲۶۱ ھ) کے شارح حسام الدین عمرؒ (متوفیٰ ۵۳۶ ھ) اپنی اِس نہایت مشہور کتاب میں لکھتے ہیں:

قال أبو حنيفة: أقلد من كان من القضاة والمفتين من الصحابة رضى الله عنهم لقوله عليه الصلاة والسلام: اقتدوا بالذين من بعدى أبى بكر وعمر, وقد اجتمع فى حقهما القضاء والفتيا، فمن كان بمثابتهما مثل عثمان وعلى والعبادلة الثلاثة، وزيد بن ثابتؓ ومعاذ بن جبل، وغيرهم، ممن كان فى معناهم فأقلدهم، ولا أستجيز خلافهم برأى.

(شرح أدب القاضی: ١: ١٨٣ - ١٨٤)

ابوحنیفہؒ کہتے ہیں:

''صحابہؓ میں سے جو لوگ باقاعدہ قضاء اور افتاء کے منصب پر فائز رہے ہیں میں ان کی تقلید کرتا ہوں، اس بنا پر کہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا: پیروی کرو ان دو میرے بعد والوں کی، ابوبکرؓ اور عمرؓ۔ جبکہ ان دونوں کے حق میں (صحابہؓ کے اندر) قضاء اور افتاء کے منصب مجتمع رہے ہیں۔

پس جو کوئی ان دونوں کی حیثیت کا رہا ہو، مثل عثمانؓ، علیؓ، عبادلہ ثلاثہؓ، زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ اور ان کے علاوہ وہ لوگ جن کو عین یہی معنیٰ حاصل ہو، تو میں اُن (صحابہؓ) کی تقلید کرتا ہوں اور رائے کی بنا پر اُن کے خلاف جانے کو جائز نہیں رکھتا''۔

یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ تابعین میں سے بھی اُن کبار ائمہ کو جنہوں نے صحابہؓ کی موجودگی میں اور ان کی اجازت اور تزکیہ سے قضاء و افتاء کے امور سرانجام دیے ہیں، یہی حیثیت دیتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے، کہ وہ تابعین جن کی برابری میں امام ابوحنیفہؒ اپنے آپ کو اجتہاد وغیرہ کے منصب پر رکھتے ہیں، وہ بعد کے تابعین ہیں نہ کہ اول اول کے تابعین جو کبار صحابہؓ سے قضاء و اِفتاء کیلئے با قاعدہ سند یافتہ رہے تھے:

قال الإمام أبو حنيفة: من كان من أئمة التابعين وأفتىٰ فى زمن الصحابة وزاحمهم فى الفتوىٰ وسوغوا له الاجتهاد، فأنا أقلده۔مثل شريح، والحسن، ومسروق بن الأجدع، وعلقمة۔ (شرح أدب القاضى: ١: ١٨٦ – ١٨٧)

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں:

جو کوئی تابعین کے ائمہ میں سے رہا ہو اور صحابہؓ کے زمانے میں فتویٰ دیتا رہا ہو اور ان کے ساتھ فتویٰ میں بھیڑ کرتا رہا ہو، اور صحابہؓ نے اس کو با قاعدہ اجتہاد کا اہل جانا ہو، میں اُس کی تقلید کروں گا۔ مثل: قاضی شریحؒ، حسن بصریؒ، مسروق بن اجدعؒ اور علقمہ بن قیسؒ۔

اِس کی توجیہ کرتے ہوئے صاحب شرح لکھتے ہیں:

وهذا لأنهم لما بلغوا درجة الفتوىٰ فى زمن الصحابة، وسوّغ الصحابة لهم الاجتهاد، صار قولهم كقول الصحابة رضى الله عنهم۔

(نفس المصدر: ١: ١٨٧ – ١٨٨)

اور یہ اس لئے کہ جب وہ صحابہؓ کے زمانے میں درجۂ افتاء کو پہنچ چکے تھے، اور صحابہؓ نے ان کو اجتہاد کا اہل ہونے کی سند دے دی، تو ان کا قول بھی صحابہؓ کے قول جیسا ہو گیا۔

گواس کے بعد (تابعین کے اقوال کی بابت) مذہب حنفی کے بیان کے سلسلے میں شارح ادب القاضی لکھتے ہیں:

فعلیٰ هذه الرواية لا يحتاج إلى الجواب عن قول من يقول: لم ذكر أبو حنيفة رضى الله عنه أقاويلهم فى الكتب۔

وعلى ظاهر المذهب يحتاج: فنقول: إنما ذكرها لا محتجاً بها، بل بيانا أنه لم يستبد بهذا القول، بل سبقه غيره، وقال متبعا،لا مبتدعاً

(نقس المصدر: ۱: ۱۸۸)

پس اس روایت کی بنا پر اُس شخص کا جواب دینے کی ضرورت نہیں رہتی جو کہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اُن کے اقوال کتب میں کیوں ذکر کئے ہیں۔ گو ظاہرِ مذہب کی رو سے ضرورت ہے۔ پس ہم کہیں گے: امام صاحب نے وہ اقوال ذکر کئے، ان سے احتجاج کرنے کے طور پر نہیں، بلکہ یہ بیان کرنے کے طور پر کہ امام صاحب یہ قول لانے والے کوئی پہلے شخص نہیں، بلکہ دوسرے ان سے پہلے یہ قول کہہ چکے ہیں، اور یہ کہ امام صاحب نے از راہِ اتباع یہ اقوال کہے ہیں نہ کہ از راہِ ابتداع۔

ابھی یہ فروع کا معاملہ ہے۔ رہ گیا اصولِ دین کا معاملہ، تو یہاں امام ابوحنیفہؒ بھی صحابہؓ کے پیچھے عین اُسی طرح کھڑے ہیں جس طرح دیگر ائمہ واَعلامِ سنت۔ امام ہرویؒ اِس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول ذکر کرتے ہیں:

عن نوح الجامع، قول أبى حنيفة:

”عليك بالأثر وطريقة السلف، وإياك و كل محدثة، فإنها بدعة“

(ذم الكلام وأهله۔ ج ٤ ص ۲۱۳ - ۲۱٤)

نوح جامع سے امام ابو حنیفہؒ کا قول مروی ہے:

''اثر کو اور طریقۂ سلف کو لازم پکڑو۔ اور خبردار رہو ہر نئی چیز سے، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے''۔

امام مالک و امام احمد کا موقف تو خیر محتاج بیان ھی نھیں

رہ گیا اِس موضوع پر امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا موقف تو وہ اس قدر مشہور ہے کہ محتاجِ بیان ہی نہیں۔

اندلسی فقیہ و اصولی امام شاطبیؒ ___ جو کہ خود بھی مالکی ہیں ___ ''قولِ صحابیؓ'' کی بابت امام مالکؒ کے مشہور و زبان زدِ عام موقف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولما بالغ مالك فى هذا المعنىٰ بالنسبة إلى الصحابة أو من اهتدىٰ بهديهم واستن بسنتهم جعله الله تعالى قدوة لغيره فى ذلك فقد كان المعاصرون لمالك يتبعون آثاره ويقتدون بأفعاله ببركة اتباعه لمن أثنى الله ورسوله عليهم وجعلهم قدوة أو من اتبعهم رضى الله عنهم ورضوا عنه أولئك حزب الله ألا إن حزب الله هم المفلحون۔ (الموافقات: ٤: ٨٠)

چونکہ امام مالکؒ صحابہؓ اور صحابہؓ کی علمی روش کی پیروی کرنے والے اور صحابہؓ کی سنت کو مسنون جاننے والے شخص کو تعظیم دینے میں بہت آگے گئے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود امام مالکؒ کو بھی اس معاملہ میں دوسروں کیلئے قدوہ (مشعل راہ) بنا دیا۔ چنانچہ امام مالک کے ہم عصر امام مالک ہی کے آثار کی اتباع کرنے لگے تھے اور اُن کے افعال کی ہی اقتدا کرنے لگے تھے۔ یہ برکت تھی امام مالک کے اُن بزرگوں کا اتباع کرنے کی جن کی ثنا کی تھی اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے اور قدوہ (جس کی اقتداء کی جائے) ٹھہرایا تھا اُن کو یا اُن کی اتباع کرنے والوں کو، اللہ اُن سے راضی ہو اور وہ اللہ سے

راضی ہوں۔ وہی ہیں اللہ کا جتھا، آ گاہ رہو اللہ کا جتھا ہی کامیاب ہو کر رہنے والا ہے''۔

امام احمد بن حنبلؒ کے یہ الفاظ مذہب اہل سنت کے بیان میں بچے بچے کی زبان پر پائے گئے ہیں:

أصول السنة عندنا: التمسك بما عليه اصحاب رسول الله ﷺ والاقتداء بهم، وترك البدع، وكل بدعة فهي ضلالة، وترك الخصومات والجلوس مع أصحاب الأهواء وترك المراء والجدال والخصومات فى الدين (شرح اصول اهل السنة والجماعة للالكائى ج١: ص ١٥٦)

''اصول (اہل) سنت ☆ ہمارے ہاں یہ ہیں کہ ہر وہ امر جس پر اصحاب رسول اللہ ﷺ تھے، اس سے چمٹ کر رہا جائے۔ ان کی اقتداء کی جائے۔ اور نئی ایجادات کو ترک کر رکھا جائے۔ کیونکہ ہر نئی اپج (بدعت) ضلالت ہے۔ اور کلامی بحثوں اور اہل اھواء کی ہم نشینی کو ترک کر رکھنا۔ اور دین کے اندر دلیل بازی اور جدال اور کلام کو ترک کر کے رکھنا''۔

امام اوزاعیؒ اس حقیقت کے بیان میں کیا خوبصورت پیرایہ اختیار کرتے ہیں، گویا منہجِ سلف کی ایک تصویر کھینچ دیتے ہیں:

اِصبِر نَفسَكَ عَلى السُّنَّةِ، وَقِف حَيثُ وَقَفَ القَومُ، وَقُل بِمَا قَالُوا، وَكُفَّ عَمَّا كَفُّوا، وَاسلُك سَبِيلَ سَلَفِكَ الصَّالِحِ، فَإِنَّه يَسَعُكَ مَا وَسِعُهم

(شرح اصول اهل السنة والجماعة للالكائى ١:١٥٤)

''جی مار کر اس (اہل) سنت ☆ راہ پر جمے رہو۔ ان پہلوں کے قدم جہاں رک

(١) امام اوزاعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ ہر دو یہاں ''سنت'' کا لفظ اُسی مفہوم میں لے رہے ہیں جو پیچھے شاطبیؒ کے کلام میں گزرا۔ سلف کے کلام میں دیکھیں تو یہ معنیٰ اُن کے ہاں بکثرت مستعمل ہے۔

گئے ہوں وہاں تم بھی ضرور رُک جاؤ۔ جس بات کے وہ قائل ہوئے ہوں تم بھی اسی کے قائل رہو۔ جس بات سے وہ خاموش اور دستکش رہے ہوں تم بھی اس سے دستکش ہی رہو۔ چلو تو اپنے ان سَلَفِ صالح کی راہ پر چلو۔ اس لئے کہ گنجائش کا جو دائرہ ان کیلئے رکھا گیا ہے وہی تمہارے لئے ہے"۔

مجددِ عہدِ تابعین امیر المومنین عمر بن عبد العزیزؒ کے الفاظ، جو کہ امام مالکؒ کی زبان پر بھی اکثر سنے جاتے تھے:

سنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وولاة الأمر بعده سننا، الأخذ بها تصديق لكتاب الله عز وجل، واستكمال لطاعته، وقوة فى دين الله، ليس لأحد تغييرها ولا تبديلها ولا النظر فى رأى من خالفها، فمن اقتدىٰ بما سنوا اهتدىٰ، ومن استبصر بها بصر، ومن خالفها واتبع غير سبيل المؤمنين ولاه الله عز وجل ما تولىٰ وأصلاه جهنم، وسائت مصيراً

(شرح اصول اهل السنة والجماعة للالكائى ج١: ص ٩٤)

رسول اللہ ﷺ نے اور پھر آپؐ کے بعد والیانِ کار نے کچھ سنتوں کا اجراء کیا ہے۔ ان کو اختیار کرنا اللہ کی کتاب کی تصدیق ہے۔ اُس کی فرماں برداری کی تکمیل ہے۔ دینِ خداوندی کے اندر قوت (پانے کا باعث) ہے۔ کسی کیلئے روا نہیں کہ وہ ان میں ترمیم کرے، یا ان کو تبدیل کرے، یا اُس شخص کی رائے میں نظر تک کرے جو ان کے خلاف چلے۔ پس جو شخص اقتدا کرے اُس چیز کی جسے اُنہوں نے دستور ٹھہرایا وہ ہدایت یافتہ ہوا۔ اور جس نے (اُن کے اِن دساتیر) کی مدد سے راستہ دیکھنے کی کوشش کی وہی ہے جو راستہ دیکھ پایا۔ اور جس نے ان (دساتیر) کے خلاف راستہ اختیار کیا اور پیروی کی اِن اہل ایمان کے راستے کے ماسوا کی تو اللہ اس کو اُسی طرف

کو چلائے گا جدھر کو وہ پھر گیا ہے اور دوزخ میں ڈالے گا، اور برا ہے وہ ٹھکانہ۔

کیوں نہ ہو یہ وہ ہستیاں ہیں جن کے خصوصی تذکرے خدا کی تین برگزیدہ ترین کتابوں کے اندر ہوئے ہیں:

قال الشافعی: وقد أثنى الله تعالى على أصحاب رسول الله ورضی عنهم فی القرآن والتوراة والإنجيل

(المدخل إلى السنن للبيهقى. الجزء الأولىٰ ص ٤٧، الأثر رقم: ٤١)

وقال: وسبق لهم علىٰ لسان رسول الله ﷺ من الفضل ما ليس لأحد بعده (نفس المصدر، الأثر رقم: ٤٣)

امام شافعیؒ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اصحابِؓ رسول اللہ ﷺ کی با قاعدہ ثنا کی ہے قرآن کے اندر، تورات کے اندر، اور انجیل کے اندر''۔

نیز کہتے ہیں: ''اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اُن کے لئے وہ فضل ذکر ہو چکا ہے جو ان کے بعد کسی کیلئے سزاوار ہی نہیں''۔

ذرا تصور ہی تو کر لیجئے، آج کے لاہور یا گوجرانوالہ کے کسی 'دبستان' کا ذکر با قاعدہ نام لے کر تورات میں بھی ہوتا، انجیل میں بھی ہوتا اور قرآن میں بھی جگہ جگہ ہوتا......!

ہاں، پر...... ایں سعادت بزورِ بازو نیست! وہ ایک ہی دبستان ہے اور اس کی اتباع لازم۔

☆☆☆☆☆

پس آپ اہل ایمان و اتباع کے جملہ ذخیرے کھنگال جایئے، اصحابِؓ رسول اللہ ﷺ کی یہی متبوع حیثیت آپ کو ہر کسی کے ہاں ملے گی۔ اہل ایمان کا یہی دستور

ہے، جو عہد اول سے ہے اور قیامت تک رہے گا۔ کبھی کوئی ایک بھی تو عالم ہوا ہو کہ جس کو امت نے عالم مانا ہو، اور اس نے اصحابِؓ رسول اللہؐ کے فہمِ کتاب وسنت کو اپنے لئے حجت ماننے اور ان کے علمی وفقہی تسلسل کا حصہ بنے رہنے سے انکار کیا ہو!

"فہم" کیلئے "سلف" کا حوالہ حجت نہیں تو پھر حجت کیا ہے؟

امت میں باقاعدہ یہ ایک حجت مانی گئی ہے کہ "صحابہؓ وسلفؒ نے فلاں بات کو یوں نہیں یوں سمجھا ہے"۔

آٹھویں صدی ہجری کے شافعی فقیہ خلیل کیکلدی العلائی (متوفی ٧٦١ھ)، جو کہ "إجمال الإصابة فی أقوال الصحابة" کے مؤلف ہیں، اپنی مذکورہ تصنیف میں ایک نہایت طویل وعریض بیان اور استشہادات ذکر کرنے کے بعد، اِس پورے مبحث کی تلخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن أمعن النظر فی کتب الآثار وجد التابعین لایختلفون فی الرجوع إلی أقوال الصحابی فیما لیس فیه کتاب ولا سنة ولا إجماع. ثم هذا مشهور أیضا فی کل عصر لا یخلو عنه مستدل بها أو ذاکر لأقوالهم فی کتبه. (إجمال الإصابة: ص ٦٧)

جو شخص کتبِ آثار کے اندر غور سے نظر کرے، وہ یہی بات پائے گا کہ تابعینؒ اِس معاملہ میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں رکھتے کہ جس مسئلہ میں کتاب سے اور نہ سنت سے اور نہ اجماع سے کوئی دلیل پائی جاتی ہو وہاں صحابیؓ کے اقوال کی جانب رجوع کیا جائے گا۔ پھر یہی چیز مشہور رہی ہے ہر زمانے کے اندر ہی۔ کبھی کوئی زمانہ نہیں ملے گا جس میں فقہاء لوگ اس سے استدلال کرنے والے اور ان کے اقوال کو اپنی کتابوں کے اندر ذکر کرنے والے نہ پائے گئے ہوں۔

یہی لب لباب شاطبیؒ اپنی مایہ ناز کتاب ''الموافقات'' میں دیتے ہیں کہ تابعین کے زمانے سے لے کر آج تک علمائے اسلام اور فقہائے شریعت کا یہی دستور چلا آیا ہے کہ وہ اپنے سب علمی مواقف اور استدلالات کیلئے تائید اور سپورٹ صحابہؓ ہی کے ہاں دیکھتے ہیں اور انہی کو بنیاد بنا کر اپنے فہم واستدلال کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ صحابہؓ کی یہ حیثیت اور ہیبت آج تک مسلم چلی آئی ہے:

ان السلف والخلف من التابعين ومن بعدهم يهابون مخالفة الصحابة ويتكثرون بموافقتهم وأكثر ما تجد هذا المعنىٰ فى علوم الخلاف الدائر بين الأئمة المعتبرين فتجدهم إذا عينوا مذاهبهم قووها بذكر من ذهب إليها من الصحابة وما ذاك إلا لما اعتقدوا فى أنفسهم وفى مخالفيهم من تعظيمهم وقوة مآخذهم دون غيرهم وكبر شأنهم فى الشريعة وأنهم مما يجب متابعتهم وتقليدهم۔ (الموافقات: ٤: ٧٧)

تابعین سے لے کر بعد کے لوگوں تک، سلف تا خلف، علماء اس بات کی ہیبت محسوس کرتے آئے ہیں کہ آدمی کہیں پر صحابہؓ کے مذہب کا خلاف کر بیٹھے۔ اور اس بات کو اپنے حق میں بڑی بات جانتے آئے ہیں کہ ان کی بات صحابہؓ کی بات کے موافق ہو۔ اس بات کے مظاہر سب سے زیادہ آپ کو علوم کے اُن فروع میں نظر آئیں گے جن کے اندر امت کے معتبر علماء کے آپس میں اختلاف ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں آپ دیکھیں گے کہ علماء کا ہر فریق اپنے اپنے موقف کا تعین کر لیتا ہے تو اپنے اُس موقف کو اُن صحابہؓ سے تقویت دیتا ہے جو اُس موقف کے حق میں گئے ہوں۔ اس کی کوئی اور وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اِن علماء کا خود اپنی بابت ہی نہیں اپنے مخالف فریق کی بابت بھی یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ یہاں صحابہؓ کی تعظیم پائی جاتی ہے اور یہ کہ ہر دو اس

بات کے معتقد ہیں کہ صحابہؓ کے علمی مآخذ میں وہ جان ہے جو کسی دوسرے میں نہیں اور یہ کہ شریعت میں صحابہؓ کو خصوصی شان حاصل ہے اور یہ کہ صحابہؓ وہ ہستیاں ہیں جن کی متابعت اور تقلید کرنا واجب ہے۔

علائی اور شاطبی کی ذکر کردہ یہ حقیقت واقعتاً ہر دل پر نقش ہے اور اس کا انکار نرامکابرہ۔ مقرراتِ صحابہؓ کی ایک ہیبت دلوں پر پائی جانا سلف تا خلف ایک نہایت معلوم امر ہے۔ کوئی شخص دین کی کوئی ایسی تفسیر لے کر آتا ہے جو صحابہؓ کی تفسیر سے ہٹ کر ہو، ہر دور کا عالم کیا عامی اس کو شدید حد تک خطرناک چیز ہی جانے گا۔ یہ تو استشراق کی دوسو سال کی شبانہ روز محنت ہے (دوسو سال سے ہزارہا یونیورسٹیوں اور کالجوں اور 'ریسرچ انسٹی ٹیوٹوں' کے 'ورکنگ آورز' کا ذرا اندازہ کرلیں جو عالم اسلام کے اعلیٰ ترین دماغوں پر محنت کے عمل میں صرف ہوئے ہیں) کہ اب جا کر ایسی بات مسلم معاشرے میں کرنا اور سننا آسان ہوگئی۔ ورنہ اس سے پہلے یہ کب ممکن تھا۔ استشراق نے بڑی کامیابی کے ساتھ معاملہ جہاں پہنچا دیا ہے، حالیہ دجالی گلوبلائزیشن کی تحریک ایسے 'سنہری' موقعہ کو عالم اسلام میں کیونکر ضائع جانے دے گی؟

☆☆☆☆☆

کتاب وسنت کے بعد ابو بکر وعمر

إجمال الإصابة فی أقوال الصحابة ہی کے مصنف (خلیل العلائی) اپنی کتاب میں امام شافعیؒ کا ایک مشہور ومعروف واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قول إمامنا الشافعی فیما روینا عنه من طریق عبد الله بن محمد الفریابی قال: سمعت محمد بن إدریس الشافعی رحمه الله ببیت المقدس

يقول: سلونى عم شئتم أخبركم به عن كتاب الله وسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم. قال: فقلت إن هذا لجرىء. ما تقول أصلحك الله فى المحرم يقتل الزنبور. فقال: نعم بسم الله الرحمن الرحيم قال الله تعالى **وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا** وحدثنا سفيان بن عيينة عن عبد الملك بن عمير عن ربعى عن حذيفة رضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: اقتدوا بالذين من بعدى أبى بكر وعمر رضى الله عنهما. وحدثنا سفيان عن مسعر عن قيس بن مسلم عن طارق بن شهاب أن عمر رضى الله عنه أمر المحرم بقتل الزنبور. (إجمال الإصابة: ص ٦٨)

ہمارے امام، شافعیؒ، جس کو ہم نے عبداللہ بن محمد فاریابی کے طریق سے روایت کیا ہے، کہا: میں نے محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ کو بیت المقدس میں سنا، کہہ رہے تھے، مجھ سے جو چاہو پوچھ لو، میں تمہیں اُس کا جواب کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے دے سکتا ہوں۔ فاریابی کہتے ہیں، میں نے (دل میں) کہا، اس شخص میں بڑی جرأت ہے۔ میں نے پوچھا: اللہ تمہیں صالح کرے، اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جو حالت احرام میں زنبور (ڈیمو) کو قتل کر بیٹھا۔ شافعی جواب دینے لگے: جی ہاں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے: **وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا** ’’اور رسول تم کو جو دے اُس کو اختیار کرو، اور جس چیز سے روکے اُس سے رک جاؤ‘‘۔ اور جبکہ بیان کیا ہم سے سفیان بن عیینہ نے عبدالملک بن عمیر سے، اُس نے ربعی سے، اُس نے حذیفہؓ سے، اُنہوں نے نبی ﷺ سے، کہ آپؐ نے فرمایا: اقتدوا بالذين من بعدى أبى بكر وعمر رضى الله عنهما ’’پیروی کرو اِن دو میرے بعد والوں کی، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما‘‘۔ اور جبکہ بیان کیا ہم سے سفیان نے مسعر

سے، اُس نے قیس بن مسلم سے، اُس نے طارق بن شہاب سے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حالت احرام والے شخص کو اجازت دی کہ وہ زنبور (ڈیمو) کو مار لے"۔

☆☆☆☆☆

یہاں واضح رہے، یہ مبحث جو ابھی گزرا ہے، اور جو کہ ائمۂ علم کے اقوال واقتباسات سے نقل ہوا ہے، اِس میں کچھ ٹیکنیکل بحثیں مسئلۂ "قولِ صحابیؓ" کے گرد بھی پائی جاتی ہیں جس کی اپنی ایک تفصیل (1) ہے اور جو کہ ہمارے اِس موضوع سے متعلق نہیں۔

☆☆☆☆☆

إِنَّا نَقْتَدِيْ وَلا نَبْتَدِئ (قول ابنِ مسعودؓ)

ہم اقتداء کرنیوالے ہیں نہ کہ ابتداء کرنیوالے

"پہلے سے' چلاآنے والا راستہ
نہ کہ 'غوروخوض' سے سامنے آنے والی چیز

ترجمانِ سلف، حافظ ابن عبد البرؒ اپنی معروف تصنیف **جامع بیان العلم** میں باقاعدہ ایک باب باندھتے ہیں:

باب: معرفة أصول العلم وحقيقته، وما الذي يقع عليه اسم الفقه والعلم مطلقاً

اس بات کا بیان کہ: اصولِ علم کیا ہیں اور حقیقتِ علم کیا ہے، اور یہ کہ فقہ اور علم کے الفاظ اپنے مطلق معنیٰ میں کس چیز کیلئے آتے ہیں

اس کے تحت ابن عبد البرؒ کچھ نہایت نفیس مباحث لے کر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ سلف کے ہاں "علم" کا لفظ 'رائے' کے مقابلے میں ایک خاص

مفہوم کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ اس کا سادہ مفہوم بیان کیا جائے تو (**دینِ خداوندی کے معاملہ میں**):

''علم'' اس چیز کو کہیں گے جو آپ کو ''بتا دی جائے'' نہ کہ وہ بات جو آپ 'بوجھیں'۔ اس کے مقابلے میں 'رائے' ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کو آپ 'سوچ بچار' اور 'غور وخوض' کے نتیجے میں 'دریافت' کر کے لاتے ہیں۔

دینِ آسمانی اپنی فطرت میں ''سمع'' ہے نہ کہ 'دریافت'۔

''علم'' نہ کہ 'رائے'

ابن عبد البرؒ علمائے سلف کے استعمالات کے اندر یہ بات اس قدر واضح پاتے ہیں — یعنی ''علم'' اور ''رائے'' میں تمیز رکھنا — کہ وہ اس پر کوئی اختلاف تک نہیں جانتے:

ولا أعلم بين متقدمي هذه الأمة وسلفها خلافا أن الرأى ليس بعلم حقيقة، وأفضل ما روى عنهم فى الرأى أنهم قالوا:

(الأثر رقم: ١٤٥١:) "نعم وزير العلم الرأى الحسن"۔

وقالوا: (الأثر رقم ١٤٥٢:) أبقى الكتاب موضعاً للسنة، وأبقت السنة موضعاً للرأى الحسن" (جامع بيان العلم ص ٧٧٩)

میں اِس امت کے متقدمین وسلف کے مابین اس بات پر کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ: **رائے حقیقت میں علم نہیں ہے**۔ رائے کے حق میں جو بہترین بات متقدمین سے مروی ہوئی ہے وہ ان کا یہ قول ہے:

- ''علم'' (بادشاہ ہے اور) اور ''خوب رائے'' اس کا کیا ہی اچھا وزیر۔
- اسی طرح متقدمین کا یہ بھی قول ہے: کتاب نے سنت کیلئے ایک خاص جگہ چھوڑی ہے۔ اور سنت نے خوب رائے کیلئے ایک خاص جگہ چھوڑی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عقیدہ کے احاطہ میں 'رائے' کو پیر دھرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اہل بدعت کی سب مذمت اِسی باب سے ہے۔ ابن عبد البر، دورِ تابعین کے دستور کے حوالے سے یہ بیان لے کر آتے ہیں:

وما ينقم علىٰ أهل البدع إلا أنهم اتخذوا الدين رأيا، وليس الرأيُ ثقةً ولا حتماً (جامع بيان العلم، ١: ٧٧٩۔ الأثر رقم: ١٤٤٩)

اہل بدعات کا اور کوئی بھی جرم بیان نہیں کیا جاتا مگر یہ کہ انہوں نے دین کو رائے بنا لیا ہے۔ جبکہ رائے نہ تو یقینی چیز ہے اور نہ حتمی۔

اپنے فہم دین کی ایک صحیح ترین بنیاد ڈالنے کیلئے کیا منہج ہے، ابن عبد البرؒ یہاں پر ذوالنون مصریؒ کا یہ قولِ زریں لے کر آتے ہیں:

"مِن أعلام البصر بالدين: معرفة الأصول لتسلم من البدع والخطأ، والأخذ بالأوثق من الفروع احتياطاً لتأمن"

(جامع بيان العلم، ١: ٧٨٥۔ الأثر رقم: ١٤٦٩)

دین میں بصیرت رکھنے کی نمایاں ترین علامات میں سے یہ ہے کہ: تم نے اصول کو ٹھیک ٹھیک جان لیا ہو، تاکہ بدعات اور انحرافات سے سلامت رہو۔ پھر فروع میں اُس چیز کو اختیار کرو جو ثقہ تر ہے، از راہِ احتیاط۔ تاکہ محفوظ رہو۔

چنانچہ اصولِ دین (جبکہ مبادیِ فہم کا بھی ایک بڑا حصہ اصول میں آتا ہے) کے معاملہ میں تو 'رائے' کو کوئی دخل ہی نہیں۔ یہاں پر تو سلف کے سب مکاتب کے نزدیک 'رائے' کی وہ مذمت پائی جاتی ہے کہ الامان والحفیظ۔ یہاں پر تو آپ کو وہ چیز "بتائی" جائے گی جو "پہلے سے چلی آ رہی ہے"، یعنی "علم" اور "اثر" ...... "علم" اور "اثر" کے بغیر یہاں زبان ہلانا ہی درست نہیں۔ رہ گئے فروع، تو اُن میں بھی اصل

یہی ہے کہ ''علم'' ہو۔ اور جو ''علم'' مل جائے اُس میں 'رائے' کو دخل بہر حال نہیں ہے۔ ہاں جب ''علم'' حاصل ہو جائے تو آپ اس ''معلوم'' کی مدد سے ''غیر معلوم'' کو بھی دریافت کرتے ہیں اور اس کا نام ''رائے'' ہے، جو کہ نہایت مستحسن ہے۔

پس یہ تین باتیں ہوئیں:

- ایک تو یہ واضح ہوا کہ اصول دین (اور مبادیِ فہم) میں 'رائے' نہیں بلکہ ''علم'' چلتا ہے، جو کہ رسول اللہ ﷺ سے بذریعہ صحابہؓ ہم کو ملتا ہے، منضبط ''نص'' کی صورت میں بھی، مستند ''فہم'' کی صورت میں بھی اور ایک جاری و ساری ''معمول'' اور ''دستور'' کی صورت میں بھی۔ لہٰذا یہ چیز اَصحابؓ سے لئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔

- دوسری یہ چیز واضح ہوئی کہ فروع میں بھی اصلاً ''علم'' ہی چلتا ہے نہ کہ 'رائے'۔ خصوصاً یہ کہ جہاں ''علم'' آ جائے وہاں تو 'رائے' کو کوئی دخل ہی نہیں، خواہ معاملہ فروع کا ہی کیوں نہ ہو۔

- تیسری چیز یہ کہ فروع میں ایک ایریا ایسا رکھا گیا ہے کہ دستیاب ''علم'' کو بنیاد بنا کر دیگر اشیاء کی بابت ''رائے'' قائم کر لی جائے اور یوں ''معلوم'' کی مدد سے ''غیر معلوم'' کی جانب راہنمائی پا لی جائے، بشرطیکہ آدمی کے اندر اس بات کی استطاعت ہو۔

اپنے مطلق معنیٰ میں ''علم'' ایک ایسی ہی شرعی حقیقت پر دلالت کیلئے آتا ہے۔ پس ''علم'' کا کل تعلق اس بات سے ہے کہ آپ نے ''سمع'' کیا کیا، نہ کہ اس بات سے کہ آپ اپنے 'بحرِ تفکیر میں غوطہ لگا کر' کیا چیز برآمد کر لائے۔ (کیونکہ مسئلہ دینِ آسمانی کا ہے جس کا سب کو پابند کرایا جانا ہے نہ کہ زمین کی خانہ سازی

کا[۱]) اور جب اس چیز کا تعلق ''سمع'' سے ہے تو سب کچھ صحابہؓ سے لئے بغیر چارہ نہیں، خواہ اصول ہوں اور خواہ فروع۔ اصول اور مبادی تو من وعن چلیں گے اور ان میں تو آپ کچھ تصرف کریں گے ہی نہیں۔ فروع بھی اولاً آپ ''سمع'' سے لیں گے۔ ہاں فروع میں آپ ایک خاص ایریا کے اندر ''سمع'' کو بنیاد بنا کر ''رائے'' بھی اختیار کریں گے۔ پس ''علم'' درحقیقت ''سمع'' کا نام ہے، ''رائے'' اس سے متفرع ہو سکتی ہے۔

دوبارہ واضح کر دیا جائے: مسئلہ دینِ آسمانی کا ہے نہ کہ زمینی افکار کا[۲]۔

''علم'' اور 'رائے' کے اِس فرق سے چونکہ صحابہؓ ہی سب سے بڑھ کر واقف ہیں، اور صحابہؓ ہی نے اس پر سب سے بڑھ کر زور دیا ہے...... لہٰذا صحابہؓ جب کسی چیز کو ''طریقۂ جاریہ'' اور ''دستور'' کی حیثیت میں چلاتے ہیں تو وہ محض 'رائے' سے بڑھ کر کوئی چیز ہوتی ہے؛ نبی ﷺ سے اُس کا اکتساب ہونے کے بے شمار پہلو اور سطحیں ہوتی ہیں (اور جو کہ نبی ﷺ سے کبار صحابہؓ کو حاصل ہوتی ہیں اور پھر کبار صحابہؓ سے صغار صحابہؓ کو، جبکہ سب صحابہؓ عدول ہیں۔ نبیؐ اور انسانوں کے مابین واسطہ ہیں۔ انسانوں پر نبیؐ کے شہید ہیں اور وہ چیز جو نبیؐ نے ان میں کھڑی کی انہوں نے وہ چیز انسانیت کے اندر کھڑی کر دی، جس میں رویے بھی آتے ہیں، مزاج بھی، احوال بھی، اخلاق بھی، مبادیِ فہم بھی، عقیدہ بھی، اور عبادت بھی، معاملات بھی، اور جہاد بھی، اور دولت بھی اور امارت بھی)۔ یا پھر وہ چیز اجماع کا ایک معنیٰ لئے ہوئے ہوتی ہے☆۔ محض اپنی رائے سے ایک بات کر دی گئی ہو تو صحابی اُسے امت کو جاری کر کے دینے کی چیز جانتا ہی نہیں ہے۔

☆ اس مبحث کے کئی ایک جوانب کو ابن قیم نے اعلام الموقعین میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ بزرگانِ تابعین میں یہ چیز ایک دستور کی حیثیت اختیار کرگئی؛ اور ظاہر ہے اِس دستور کو سب سے پہلے صحابہؓ کی اپنی ہی تائید حاصل تھی، کہ عہدِ صحابہؓ سے جو چیز ایک طریقۂ جاریہ کی صورت میں چلی آتی ہے اُس کو ''علم'' ہی کے ایک درجہ میں لیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہماری اِسی فصل میں پیچھے شافعیؒ اور محمد بن الحسنؒ ہر دو کی تقریر میں گزری ہے۔ ''علم'' کا ثبوت کس طرح ہوتا ہے، اس موضوع پر تقریباً ایک ہی بات ہے جس کو امام شافعیؒ نے ''العلم: خمس طبقات'' کے تحت سمیٹا ہے اور امام محمدؒ نے ''العلم أربعة أوجه'' کے تحت، اور پھر ان کو بیان کرنے کے بعد امام محمدؒ نے کہا ہے: ''ولا يخرج العلم عن هذه الوجوه الأربعة''۔ (دیکھئے صفحہ ۱۹۵، ۱۹۹)۔

چنانچہ دینِ آسمانی کو صحابہؓ سے لینے اور سمجھنے کے حوالے سے ''علم'' کا یہ باقاعدہ ایک تصور ہے جو ہمیں حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اہل الحدیث و دیگر سب متبع سنت و جماعت مذاہب کے اندر نہایت واضح اور باقاعدہ ایک دستور و آئین کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ واحد چیز ہے جو دینِ آسمانی کو بعد ازاں روزنئی شکل اختیار کرنے اور بازیچۂ اطفال بن جانے سے بچا کر رکھتی ہے(۲)۔ اس کی تفسیر اور اس کے معانی کو ایک طے شدہ اور ناقابل تبدیل حیثیت دینے کی یہی صورت ہے جو خود علمائے صحابہؓ نے اور پھر ان کی تعلیم سے بزرگانِ تابعینؒ نے امت کو اختیار کر کے دی۔

'رائے' اور ''علم'' میں کس واضح انداز سے فرق رکھا جاتا ہے، اس پر ابن عبد البرؒ دورِ سلف سے کچھ لفظ بلفظ شواہد لے کر آتے ہیں:

عن طاووس عن عبد الله بن عمر أنه كان إذا سئل عن شيءٍ لم

يبلغه فيه شيءٌ، قال: "إن شئتم أخبرتكم بالظن"۔

(جامع بيان العلم: ص ٧٧٧، الأثر رقم: ١٤٤٣)

طاوسؒ سے روایت ہے: عبداللہؓ بن عمرؓ سے جب بھی کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا جاتا جس میں اُن کو (پہلے سے پائی جانے والی) **کوئی چیز نہ پہنچی ہو، تو وہ** جواب دیتے: ''**تم چاہتے ہوتو میں تمہیں ظن سے کوئی چیز بتا دیتا ہوں**''۔

وعن أبي هريرة أنه كان إذا قال في شيءٍ برأيه قال: هذا من كيسي"

(جامع بيان العلم ص ٨٥١ الأثر رقم: ١٦٠٧)

ابو ہریرہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کا معمول تھا، جب کسی چیز کے معاملے میں وہ اپنی رائے سے بات کرتے تو کہہ دیا کرتے: یہ میری عقل سے ہے۔

وعن ابن مسعود أنه قال في غير ما مسئلة: "أقول فيها برأيي"۔

(جامع بيان العلم ص ٨٥٢ الأثر رقم: ١٦٠٨)

عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے بے شمار مسئلوں کو بیان کرتے وقت یہ صراحت کی کہ ''یہ میں اپنی رائے سے بیان کررہا ہوں''۔

عن سالم بن عبد الله بن عمر أن رجلاً سأله عن شيءٍ، فقال له: "لم أسمع في هذا بشيءٍ"۔ فقال له الرجل: إني أرضیٰ برأيك۔ فقال له سالم: "لعلي أن أخبرك برأيي، ثم تذهب فأریٰ بعدك رأيا غيره فلا أجدك"

(جامع بيان العلم: ص ٧٧٧، الأثر رقم: ١٤٤٢)

سالمؒ بن عبداللہؓ بن عمرؓ سے روایت ہے: **ایک آدمی نے سالمؒ سے ایک** مسئلہ پوچھا۔ سالمؒ نے جواب دیا: **میں نے اِس مسئلہ میں کچھ سن نہیں رکھا۔** آدمی بولا: **مجھے آپ کی رائے پر اطمینان ہے۔ سالم نے جواب دیا: ''شاید کہ**

میں تمہیں اپنی رائے سے ایک بات بتا دوں، پھر تم چلے جاؤ، اور اس کے بعد میری کوئی اور رائے ہو جائے اور پھر تم مجھے نہ ملو‘‘

عن عاصم الأحول، قال: كان ابن سيرين إذا سئل عن شيء: قال: ليس عندى فيه إلا رأى أتهمه۔ فيقال له: قل فيه على ذلك برأيك۔ فيقول: لو أعلم أن رأيي يثبت لقلت فيه؛ ولكنى أخاف أن أرىٰ اليوم رأيا وأرىٰ غداً غيره، فأحتاج أن أتبع الناس فى دورهم‘‘

(جامع بيان العلم: ص ٧٧٧ الأثر رقم: ١٤٤١)

عاصم الاحول سے روایت ہے، کہا:

ابن سیرینؒ سے مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ کہتے: اِس مسئلہ میں میرے پاس صرف رائے ہے جو کہ میرے نزدیک بھروسے کی چیز نہیں۔ تو ابن سیرین سے کہا جاتا: آپ اپنی رائے سے بتا دیجئے۔ فرماتے: اگر میں جانتا کہ میری رائے کسی ایک چیز پر قائم رہے گی تو میں ضرور اپنی رائے سے کچھ کہہ دیتا، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ آج میں ایک رائے رکھوں اور کل کو میری رائے کچھ اور ہو جائے اور مجھے ضرورت محسوس ہو کہ میں گھر گھر جا کر لوگوں کو اپنی نئی رائے بتاتا پھروں‘‘۔

یہاں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں، سلف جس چیز کو ’’علم‘‘ کہتے ہیں وہ کیا چیز تھی۔

عن عثمان بن عطاء، عن أبيه، قال: سئل بعض أصحاب النبى ﷺ فقال: إنى أستحيى من ربى أن أقول فى أمة محمد برأيى‘‘

(جامع بيان العلم، ص ٧٧٨، الأثر رقم: ١٤٤٧ قال المحقق: إسناده ضعيف)

عثمان بن عطاء سے روایت ہے، کہ ان کے والد (عطاء بن ابی رباحؒ) نے روایت

کی: نبی ﷺ کے اصحاب میں سے کسی ایک سے مسئلہ پوچھا گیا تو اُس صحابی نے جواب دیا: میں اپنے پرودگار سے حیاء کرتا ہوں کہ میں امت محمدؐ کے اندر محض اپنی رائے سے کوئی قول جاری کر دوں۔

اِس اثر کی سند میں اگرچہ ضعف بیان ہوا ہے، مگر وہ عمومی تصویر جو ہمیں اصحاب رسول اللہؐ سے اس سلسلہ میں ملتی ہے وہ اس سے کچھ مختلف بہرحال نہیں ہے، اسی لئے ابن عبدالبر نے اس کو اپنی تالیف میں درج کر دیا ہے۔ اِدھر ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ کسی ایک مسئلے میں نہیں، اصول سے لے کر فروع تک پورے دین کی ایک نئی تعبیر خاص اپنی 'تفکیر' اور 'غور و خوض' سے نکال کر امت محمدؐ کے اندر جاری کروانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کو مقبول کروانے کیلئے دنیا بھر کے پاپڑ بیلے جاتے ہیں...... اور پروردگار سے اس پر کوئی حیاء محسوس نہیں کی جاتی...... بلکہ شاید فخر ہوتا ہو۔ فاللّٰھم اھدنا و اھدِ الجمیع۔

پہلے سے چلی آئی چیز یعنی ''علم'' (جو کہ ایک ٹھوس اور غیر متغیر چیز ہوتی ہے) کے مابین...... اور سوچ بچار اور غور و خوض سے دریافت کی گئی چیز یعنی 'رائے' (جو کہ ایک ذہنی پراسیس کا نتیجہ ہوتی ہے اور کسی بھی وقت بدل سکتی ہے)...... کے مابین فرق کرنا سلف کے منہج میں جگہ جگہ نظر آتا ہے:

وذکر عبد الرزاق أیضا عن ابن جریج، قال: سألت عطاءً عن غریب قدِم فی غیر أشھر الحج معتمراً، ثم بدا له أن یحج فی اشھر الحج: أیکون متمتعاً؟ قال: ''لا یکون متمتعا حتیٰ یأتی من میقاته فی أشھر الحج''۔ قلت: أرأی أم علم؟ قال: ''بل علمٌ''

(جامع بیان العلم ص ۷۷۱، الأثر رقم: ۱۴۲۹)

عبد الرزاق نے ہی ابن جریج سے بیان کیا، کہا: میں نے عطاء بن ابی رباحؒ سے مکہ کے غیر رہائشی شخص کی بابت پوچھا جو حج کے مہینوں کے علاوہ ایام میں عمرہ کرنے آیا، پھر اُس کی رائے بنی کہ وہ حج کے مہینوں (تک یہیں رہے اور) حج کر لے، کیا وہ حج تمتع شمار ہوگا؟ فرمایا: نہیں حج تمتع شمار نہیں ہوگا جب تک کہ وہ حج کے مہینوں میں ہی اپنی میقات پار کر کے نہ آئے۔ میں نے دریافت کیا: **کیا یہ رائے ہے یا علم**؟ فرمایا: ''**بالکل علم ہے**''۔

عن ابن جريج، قال: سئل عطاء عن المستحاضة؟ فقال: "تصلى وتصوم، وتقرأ القرآن، وتستثفر بثوب، ثم تطوف۔ فقال له سليمان بن موسىٰ: أيحل لزوجها أن يصيبها؟ قال: نعم۔ قال سليمان: أرأى أم علم؟ قال: "بلىٰ سمعنا أنها إذا صلت وصامت حلَّ لزوجها أن يصيبها"۔

(جامع بيان العلم ص ٧٧١، الأثر رقم: ١٤٢٨)

ابن جریج سے روایت ہے، کہا: عطاء بن ابی رباحؒ (ایک عظیم تابعی) سے استحاضہ والی عورت کی بابت مسئلہ پوچھا گیا۔ عطاءؒ نے جواب دیا: وہ نماز پڑھے گی، روزہ رکھے گی، قرآن پڑھے گی، کپڑا اچھی طرح باندھ لے اور پھر طواف کر لے۔ سلیمان بن موسیٰ نے اس پر ایک اور سوال کیا: کیا اُس کے شوہر کیلئے حلال ہے کہ وہ اُس سے ہم بستری کرے؟ عطاءؒ نے جواب دیا: ہاں۔ سلیمان نے پلٹ کر پوچھا: **یہ آپ رائے بیان کر رہے ہیں یا علم**؟ عطاءؒ بولے: ''کیوں نہیں، **ہم نے باقاعدہ سنا ہے** کہ جب وہ نماز پڑھے گی اور روزہ رکھے گی تو اس کے شوہر کیلئے اُس کے ساتھ ہم بستری کرنا بھی حلال ہوگا''۔

عن بقية، قال: سمعت الأوزاعي يقول: " العلم ما جاء عن

أصحابِ محمد ﷺ ، وما لم يجیء عن واحدٍ منهم فليس بعلم۔

(جامع بيان العلم: ص ٧٦٩ الأثر رقم: ١٤٢١)

بقیہؒ روایت کرتے ہیں، کہا: میں نے اوزاعیؒ کو کہتے ہوئے سنا:

''علم'' وہ ہے جو اصحابِؓ محمد سے ملتا ہو۔ رہی وہ چیز جو کسی بھی صحابیؓ سے نہ ملتی ہوتو وہ ''علم'' نہیں ہے۔

اوزاعیؒ نے یہ بات یونہی نہیں کہہ دی۔ ''علم'' درحقیقت وہی ہے جو صحابہؓ کو دیا گیا:

عن قتادة فی قوله عز وجل: ''وَيَرَى الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْ أُنْزِلَ إِلَيْکَ مِن رَّبِّکَ الْحَقُّ'' (سبأ: ٦) قال: ''أصحاب محمد ﷺ''۔

(جامع بيان العلم: ص ٧٦٩-٧٧٠ الأثر رقم: ١٤٢٢)

''الدين أوتوا العلم'' کی تفسیر صحابہؓ ہیں

تابعی مفسرِ قرآن قتادہؒ سے تفسیر مروی ہے، کہ کلامِ خداوندی {وَيَرَى الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْ أُنْزِلَ إِلَيْکَ مِن رَّبِّکَ الْحَق (سبأ:٦) ''اور وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے وہ دیکھتے ہیں اُس چیز کو جو تجھ پر تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے کہ وہی حق ہے} کہ ''اس میں {الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ ''وہ لوگ جن کو علم دیا گیا ہے'' } سے مراد ہے: اصحابِؓ محمد ﷺ۔

سورۂ محمد میں یہ بات اِس سے بھی زیادہ صریح ہے کہ ''الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ'' یعنی ''جن لوگوں کو علم دے دیا گیا ہے'' سے مراد اصحابِ رسول اللہؐ ہیں۔ اور اسی وجہ سے ابن قیمؒ نے اس کو اپنے قوی ترین دلائل میں ذکر کیا ہے:

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْکَ حَتَّى إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِکَ قَالُوا لِلَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفاً أُوْلَئِکَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ (محمد:١٦)

''ان میں ایسے بھی ہیں جو کان لگا کر تیری بات سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو اُن لوگوں سے جن کو علم دیا گیا ہے کہتے ہیں، اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے''

ابن قیم کہتے ہیں: اِس میں ''**الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ**'' یعنی ''**جن لوگوں کو علم دے دیا گیا ہے**'' سے مراد بلاشبہ اصحابِ رسول اللہؐ ہیں۔ پس بنصِ قرآن، علمائے صحابہؓ تاریخ کا وہ برگزیدہ گروہ ہے جس کو علمِ شریعت (اللہ کے اپنے نبیؐ کے ہاتھوں) دے دیا اور سکھا دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے یہ بات امت میں کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔

عن مجاهد، قال: "العلماء أصحاب محمد ﷺ"

(جامع بيان العلم ص ٧٧٠، الأثر رثم ١٤٢٤ قال المحقق: إسناده ضعيف وصح معناه عن كثير من التابعين فمن بعدهم)

تلمیذِ عبداللہؓ بن عباسؓ، عظیم تابعی مفسر مجاہدؒ سے روایت ہے، کہا:

''علماء (درحقیقت) اصحابِؓ محمد ﷺ ہیں''

کتاب وسنت کی تفسیر وتاویل اِنہی کے آثار میں تلاش کی جائے گی؛ ان کے آثار ہی اصل ''علم'' ہیں۔

اتباعِ اثر

اتباعِ اثر یا آثار......: یعنی کتاب وسنت کی تفسیر وتطبیق کے اِس عمل میں اِن پہلوں کے قدم جہاں پڑ چکے، عین وہیں پر قدم رکھنا اور نئے راستے نہ بنانا۔

عن عبد الله بن المبارك، عن سفيان، قال: إنما الدين الآثار"

(جامع بيان العلم، ص ٧٨١، الأثر رقم: ١٤٥٨)

عبداللہ بن مبارکؒ، سفیان ثوریؒ کا قول روایت کرتے ہیں:

''دین تو صرف اور صرف آثار کا نام ہے''

عن سعید بن جبیر، قال: ما لم یعرفه البدریون فلیس من الدین

(جامع بيان العلم: ص ٧٧١، الأثر رقم ١٤٢٥)

سعید بن جبیرؒ (ایک عظیم تابعی) سے روایت ہے، فرمایا:

''وہ چیز جس سے بدری اصحابؓ واقف نہیں، دین نہیں ہے''

یعنی کسی کے صغریٰ وکبریٰ سے ''دین'' نہیں نکل آیا کرتا۔ ''دین'' وہی ہے جو ایک معلوم حقیقت ہے اور جس پر پہلے لوگ چل چکے۔ ''دین'' کی تفسیر وہی ہے جو پہلوں کے یہاں ہوچکی۔ یہ اب خالی 'غور وخوض' سے نہیں ''پہلوں کے نشاناتِ راہ'' سے ثابت ہوگی...... یعنی ''آثار''۔ راستے ہیں جو بنائے جاچکے۔ بلکہ شاہراہیں ہیں جن پر نسلوں کی نسلیں پورے اعتماد اور وثوق سے چلیں گی اور اس کی ہر اینٹ دوبارہ اکھاڑتی نہیں پھریں گی۔ **بنیادی ترین معاملے اِس امت کے اندر سرے لگ چکے۔** اس میں کھلواڑ کی سب راہیں بند ہوچکیں (٢)۔ امت کی ہر نسل کو اِس پر اب ''چلنا'' ہے 'راستے' نہیں بنانے۔

اتبعوا، ولا تبتدعوا، فقد كفيتم

فإنَّ كلَّ محدَثةٍ بدعة

لفظ ''اثر'' کی صحیح دلالت درحقیقت یہی ہے۔ ''دینِ آسمانی'' اپنی حقیقت و ماہیت میں کیا ہے، اور اس کی ''سرچ'' اور اس کو ''معلوم'' کرنے کی ایک فطری اپروچ کیا ہے، اِن سب مفہومات کو ادا کرنے کیلئے لفظِ ''اثر'' میں جو بلاغت اور جو معنویت ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں۔

پس قرونِ اولیٰ کا یہ ایک باقاعدہ دستور ہے جو دورِ تابعین و تبع تابعین میں ایک گونج کی صورت سنا جاتا ہے:

عن عبد الله بن المبارك، عن سفيان، قال: إنما الدين بالآثار"

(جامع بيان العلم، ص ١٠٤٩، الأثر رقم: ٢٠٢٢)

سفیان ثوریؒ بروایت عبداللہ بن المبارکؒ:

''دین تو ثابت ہوتا ہے آثار سے''۔

عن محمد بن سيرين، قال: "كانوا يرون أنهم على الطريق ما داموا على الأثر" (جامع ص ٧٨٣، الأثر رقم: ١٤٦٢)

محمد بن سیرینؒ (عظیم تابعی) بیان کرتے ہیں:

''لوگ اپنے آپ کو ___ تاوقتیکہ وہ اثر پر ہوں ___ جادۂ حق پر جانتے تھے''

عن محمد بن سيرين، قال: قال شريح: "إنما أقتفى الأثر، فما وجدت فى الأثر حدثتكم به" (جامع بيان العلم ص ٧٨١ الأثر رقم: ١٤٥٥)

محمد بن سیرینؒ، شریح (ایسے عظیم تابعیؒ جس کو عمرؓ نے اپنے زمانے میں قاضی بنایا تھا) کی بابت روایت کرتے ہیں کہ شریحؒ نے کہا:

''میں صرف اور صرف اثر کی پیروی کرتا ہوں۔ پس جو چیز میں اثر سے پاتا ہوں تم کو بیان کر کے دے دیتا ہوں''

عن ابن المبارك، يقول: "لِيَكُنْ الأمر الذى تعتمدون عليه هذا الأثر، وخذوا من الرأى ما يفسر لكم الحديث"۔

(جامع بيان العلم، ص ٧٨١، الأثر رقم: ١٤٥٧)

عبداللہ بن المبارکؒ سے روایت ہے، فرمایا:

''ہونا یہ چاہئے کہ جس چیز پر تمہارا سہارا ہو وہ تو ہو یہ اثر ہی۔ ہاں پھر اس حدیث کو تفسیر کرنے کیلئے رائے سے بھی مدد لے لیا کرو''

عن أيوب السختيانی، قال: قلت لعثمان البتی: دُلَّنی علی باب من أبواب الفقه۔ قال: ''اسمع الاختلاف''۔

(جامع بيان العلم ص ٧٨٤، الأثر رقم: ١٤٦٦)

ایوب سختیانیؒ سے روایت ہے، کہا: میں نے عثمان بتیؒ سے عرض کی: مجھے فقہ کے ابواب میں سے کسی اہم باب کی نشان دہی کر کے دیجئے۔ فرمایا: سلف کے اختلاف کا زیادہ سے زیادہ علم لو۔

☆☆☆☆☆

صحابہؓ خود اپنی بابت کیا کہتے ہیں:

عن الشعبی، عن شريح، أن عمر بن الخطاب رضی الله عنه كتب إليه: ''إذا جاءك شیءٌ فی كتاب الله فاقض به، ولا يلفتنك عنه رجال، فإن جاءك أمر ليس فی كتاب الله فانظر سنَّة رسول الله ﷺ فاقض بها، فإن جاءك ما ليس فی كتاب الله وليس فيه سنَّة من رسول الله ﷺ، فانظر ما اجتمع الناسُ عليه فخذ به، فإن جاءك ما ليس فی كتاب الله ولم يكن فيه سنَّة من رسول الله ﷺ، ولم يتكلم فيه أحد قبلك فاختر أی الأمرين شئت؛ إن شئت أن تجتهد برأيك وتقدم فتقدم، وإن شئت أن تتأخر فتأخر، لا أرى التأخر إلا خيراً لك''۔

(مصنف ابن أبی شيبة كتاب البيوع والأقضية باب فی القاضی ما ينبغی أن يبدأ به فی قضائه الأثر رقم: ٢٢٥٢٩۔ كذلك البيهقی رقم: ١٨٦٨٠۔ كذلك الدارمی رقم: ١٧٢۔ ومثله فی جامع بيان العلم ص ٨٤٥، الأثر رقم: ١٥٩٦، وقد صححه محققه أبو الأشبال الزهيری)

شعبیؒ، قاضی شریحؒ سے روایت کرتے ہیں کہ امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب نے شریح کو اپنے (سرکاری) خط میں لکھا تھا:

’’جب تمہارے پاس کوئی معاملہ آئے جو کتاب اللہ میں ہو تو اُس کے مطابق اُس کا فیصلہ کردو اور آدمیوں کے اقوال ہرگز تمہیں اس سے پھیریں۔ اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جو کتاب اللہ میں نہیں تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کو دیکھو اور اس کی رو سے فیصلہ کردو۔ پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جو نہ تو کتاب اللہ میں ہو اور نہ رسول اللہ ﷺ سے اُس کی بابت کوئی سنت ملتی ہو تو دیکھو کہ لوگوں نے کس بات پر اجماع کر رکھا ہے، اور اسی کو اختیار کرو۔ پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جو کتاب اللہ میں نہیں اور نہ اس کی بابت رسول اللہ ﷺ سے کوئی سنت ملتی ہو اور نہ تم سے پہلے اس پر کسی نے کوئی قول چھوڑا ہے تو پھر اِن دونوں باتوں میں سے جو چاہو اختیار کرلو؛ چاہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرلو اور آگے بڑھو، اور چاہو تو اس سے پیچھے رہو اگرچہ پیچھے رہنا میں تمہارے حق میں زیادہ بہتر جانتا ہوں۔

وعن عبيد الله بن يزيد قال: رأيت ابن عباس إذا سئل عن شيءٍ هو فى كتاب الله قال به، فإن لم يكن فى كتاب الله وقال رسول الله ﷺ قال به، فإن لم يكن فى كتاب الله ولم يقله رسول الله ﷺ وقال أبو بكر أو عمر رضى الله عنهما قال به، وإلا اجتهد رأيه“۔

(جامع بيان العلم، ص ٨٥٠ الأثر رقم: ١٦٠١)

عبید اللہ بن یزید سے روایت ہے، کہا:

میں عبد اللہ بن عباسؓ کو دیکھتا رہا ہوں، جب بھی اُن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا جو کہ کتاب اللہ میں ہوتا تو وہ اس کے مطابق جواب دے دیتے۔ اگر وہ

کتاب اللہ میں نہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ نے اُس کو بیان کیا ہوتا تو وہ اس کے مطابق بیان کر دیتے۔ اگر وہ کتاب اللہ میں نہ ہوتا اور نہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بیان کیا ہوتا، لیکن ابوبکرؓ وعمرؓ نے اس کی بابت کچھ کہا ہوتا تو وہ اس کی رو سے مسئلہ بتاتے، ورنہ خود اپنی رائے کا اجتہاد کرتے۔

عن سعيد بن جبير عن ابن عباس، قال: كنا إذا أتانا الثبت عن عليٍّ رضى الله عنه، لم نعدل به" (جامع بيان العلم ص ٨٥١ الأثر رقم: ١٦٠٣)

سعید بن جبیرؒ سے روایت ہے، کہا عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا: ''اگر کوئی ثقہ قسم کا اثر ہمیں علیؓ سے میسر آ جاتا تو ہم اُس سے ہٹ کر کسی چیز کی جانب نہ جاتے''

عن حارثة بن مضرب، قال: كتب عمر إلى أهل الكوفة: إنى قد بعثت عمارا أميرا وعبد الله بن مسعود معلما ووزيرا وهما من النجباء من أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم من أهل بدر وأُحُد، فاقتدوا بهما واسمعوا من قولهما۔ (المعجم الكبير للطبرانى: ٩: ٨٦۔ أثر رقم: ٨٤٧٨)

حارثہ بن مضرب سے روایت ہے، کہا:

عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کی جانب اپنا مکتوب روانہ کیا تھا:

میں نے تمہاری جانب بھیجا ہے عمار کو بطورِ امیر۔ اور عبداللہ بن مسعود کو بطورِ معلم اور وزیر۔ اور یہ دونوں اصحابِ محمد ﷺ کے لائق ترین لوگوں میں سے ہیں۔ اہل بدر واہل اُحد میں سے ہیں۔ پس اِن دونوں کی اقتداء کرو اور ان کے قول کو سنو۔

لالکائی حضرت حذیفہؓ بن الیمان کا قول لے کر آتے ہیں:

قال حذيفة رضى الله عنه: اتقوا الله يا معشر القراء، خذوا طريق من قبلكم، فوالله لئن سبقتم لقد سبقتم سبقا بعيدا، وإن تركتموه يمينا وشمالا

لقد ضللتم ضلالا بعیدا۔ (شرح أصول اعتقاد أهل السنة ١: ٩٠، جامع ابن عبد البر ٢: ٩٤٧، الأثر رقم: ١٨٠٩ ، الموافقات: ٤: ٧٨)

حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اے علمائے قرآن! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اپنے سے پہلوں کا راستہ اختیار کر کے رہو۔ بخدا اگر تم اس راہ میں سبقت لے جاؤ تو بڑی آگے کی سبقت ہے۔ اور اگر تم اس راستے کو دائیں یا بائیں چھوڑ دو تو یہ گمراہی بھی بڑی دور کی ہے۔

شاطبیؒ، حضرت حذیفہؓ کا اثر اِن الفاظ کے ساتھ بھی نقل کرتے ہیں، ساتھ میں عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی ایک اثر لاتے ہیں:

قال حذيفة: اتبعوا آثارنا، فإن أصبتم فقد سبقتم سبقاً بيناً، وإن أخطأتم فقد ضللتم ضلالا بعيداً۔ وعن ابن مسعود مثله، فقال: اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد كفيتم، وعنه أنه مر برجل يقص في المسجد ويقول سبحوا عشرا وهللوا عشرا، فقال عبد الله: إنكم لأهدىٰ من أصحاب محمد أو أضل، بل هذه بل هذه يعنى أضل، والآثار فى هذا المعنى يكثر إيرادها۔ (الموافقات: ٤: ٧٩)

حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’پیروی کرو ہمارے آثار کی۔ اگر تم نے اِس راہ کو پا لیا تو یہ ایک نہایت بین سبقت ہے۔ اور اگر تم نے یہ راہ کھو دی تو یہ گمراہی بڑی دور کی ہے۔

عبداللہ بن مسعود سے بھی ایسا ہی قول مروی ہے، فرمایا:

ہمارے آثار کی پیروی کرو، اور نئی اپج نہ نکالو، کیونکہ تمہیں کفایت کر دی گئی ہے۔

عبداللہ بن مسعود ہی سے روایت ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو مسجد

میں وعظ کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا: دس بار کہو سبحان اللہ۔ دس بار کہو لا الہ الا اللہ۔ تب عبد اللہ بن مسعودؓ بولے: یقینی طور پر تم اصحابِ محمدؐ سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہو یا پھر گمراہ تر ہو۔نہیں بلکہ گمراہ ہو۔ گمراہ ہو۔

شاطبی کہتے ہیں: اِس معنیٰ کے آثار بہت بڑی تعداد میں مروی ہوئے ہیں۔

عبد الله بن مسعود: إنا نقتدى و لا نبتدئ، و نتبع و لا نبتدع، و لن نضل ما تمسكنا بالأثر۔ (شرح أصول اعتقاد أهل السنة ١: ٨٦)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''ہم اقتداء کرنے والے ہیں نہ کہ ابتداء کرنے والے۔ ہم اتباع کرنے والے ہیں نہ کہ ابتداع کرنے والے۔ اور ہم ہرگز نہیں بھٹکیں گے جب تک اثر کو مضبوطی سے تھام کر رہیں''۔

عن مولى لابن مسعود، قال: دخل أبو مسعود على حذيفة فقال: اعهد إلي۔ فقال ألم يأتك اليقين۔ قال بلىٰ وعزة ربى۔ قال: فاعلم أن الضلالة حق الضلالة أن تعرف ما كنت تنكر وأن تنكر ما كنت تعرف، وإياك والتلون فى دين الله تعالى؛ فإن دين الله واحد

(شرح أصول اعتقاد أهل السنة ١: ٩٠)

مولیٰ ابن مسعود سے روایت ہے، کہا: ابومسعود حذیفہؓ کے ہاں داخل ہوئے اور نصیحت چاہتے ہوئے عرض کی: مجھے کوئی عہد سونپیۓ۔ (نصیحت فرمائیے) فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں آیا؟ عرض کی: کیوں نہیں، میرے پروردگار کی عزت کی قسم۔ فرمایا: تو پھر جان لو کہ ضلالت اور صحیح ضلالت یہ ہے کہ جس چیز کو تم منکر جانتے تھے اُس کو بعد ازاں معروف جاننے لگو اور جس چیز کو معروف مانتے تھے اُس کو منکر

جاننے لگو۔ خبردار اللہ کے دین میں نئے نئے رخ اختیار نہ کرنا؛ کیونکہ اللہ کا دین ایک متعین حقیقت ہے''۔

صحابیِ رسولؐ عبد اللہؓ بن عباسؓ نے خوارج کے ساتھ ایک طویل مناظرہ کیا۔ اِس میں وہ اُن کو چند اصولی امور پر بھی متنبہ کرتے ہیں:

ابن عباس: جئتكم من عند أصحاب رسول الله ﷺ، وليس فيكم منهم أحد، ومن عند ابن عم رسول الله ﷺ، وعليهم نزل القرآن، وهم أعلم بتأويله۔ (جامع لابن عبد البر ۲: ۹۶۳۔ الأثر رقم ۱۸۳٤)

ابن عباسؓ خوارج سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

میں تمہارے پاس اصحابِؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے آیا ہوں جبکہ تمہارے مابین اُن میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ابنِ عم کے پاس سے آیا ہوں۔ اور یہ اصحابِؓ رسول اللہؐ ہی ہیں جن پر قرآن اترا تھا۔ اور وہی ہیں اس کی تاویل کے سب سے بڑے عالم۔

یہاں ایک تو ہم دیکھتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ خوارج کو یہ بات جتلاتے ہیں وليس فيكم منهم أحد یعنی تم (خوارج) لوگوں میں اصحابِؓ رسول اللہؐ میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے۔ عبد اللہؓ بن عباسؓ کی ذکر کردہ اِس بات کو منہج اہلسنت کی بے شمار کتب میں ایک نہایت اہم پوائنٹ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر خوارج (جوکہ نیکی میں تو اصحابِؓ رسول اللہؐ سے کچھ بڑھے ہوئے ہی نظر آتے تھے) کے ساتھ صحابہؓ کی بھی کوئی چھوٹی موٹی جماعت ہوتی (معاذ اللہ) تو معاملہ عجیب وغریب ہو جاتا۔ مگر یہ خدا کی ایک حجت تھی کہ عقائدی انحرافات کے مدمقابل صحابہؓ سب کے سب ایک چیز پر تھے اور یوں یہ ایک نہایت کھلی دلیل تھی کہ حق کس طرف

ہے (ظاہر ہے کہ صحابہؓ کی طرف)۔ دوسری چیز جو ابن عباسؓ نے خوارج کو جتلائی وہ یہ کہ وعلیهم نزل القرآن، وهم أعلم بتأويله یعنی قرآن کی تفسیر پر سب بڑھ کر اتھارٹی کوئی ہو سکتے ہیں تو وہ صحابہؓ ہیں۔

☆☆☆☆☆

صحابی کے ساتھ اتفاق نہیں، صحابی کی پیروی

عن عبد العزيز بن عبيد الله، قال: قال رجل لعامر: اتفق شريح وابن مسعود، فقال عامر: بل تبع شريح ابن مسعود، وإنما يتفق أصحاب النبي ﷺ والناس لهم تبع"

(ذم الكلام وأهله، ٤: ٧١۔ الأثر رقم ٨٠٨)

عبدالعزیز بن عبید اللہ سے روایت ہے، کہا: ایک آدمی امام عامر شعبیؒ کے سامنے یوں بول بیٹھا: فلاں مسئلہ پر شریح نے ابن مسعودؓ کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ شعبی فرمانے لگے: یوں کہو: شریح ؒ نے ابن مسعودؓ کی پیروی کی ہے۔ اتفاق ہوتا ہے اصحابِؓ رسول اللہ ﷺ کے آپس کے مابین۔ رہے لوگ تو وہ ان کے تابع ہیں۔

☆☆☆☆☆

قیامت کی نشانیاں!

علمائے سلف کو چھوڑ کر بونوں سے علم لیا جانا

یہ چیز بھی ذہن نشین رہے کہ اتباعِ سلف کے موضوع پر یہ سب آثار جو ہم نے اوپر دیے اور ابھی آگے چل کر دیں گے، قرونِ اولیٰ کے ائمہ سے ماخوذ ہیں، نہ کہ آج کے اِس دور جہالت و افراتفری کے کسی ایسے مصدر سے جس کا علمی نسب تک امت کیلئے مجہول ہو۔ ہم سب آگاہ ہیں، ''خیر القرون'' تاریخ اسلامی کا وہ زریں عہد ہے جس میں علومِ شریعت بلندی میں آسمانوں کو چھو رہے تھے۔ مسلم

معاشرے خوب جانتے تھے کہ علم و راہنمائی کیلئے وہ کن ہستیوں کے در کی راہ دیکھیں۔ یہ وہ دور تھا جس میں عالم کہلانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ پھر عالموں کے مابین عالم گنا جانا تو اُس خیر القرون میں، کہ جہاں سر برآوردہ علماء کے ٹھٹھ ملتے تھے، ایک نہایت عظیم بات ہے۔ اور پھر ایسے لوگوں کے مابین ''امام'' کہلانا تو اس سے بھی عظیم تر.. اور پھر اماموں کا امام......!!! ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، بخاریؒ اور اس طرح کے نام جو آسمانِ علم پر قیامت تک روشنی کرنے والے ہیں...... کچھ ناقابل قیاس نام ہیں۔ ان کے بعد علم میں نہ ایسے لوگ پائے گئے اور نہ علم کے ایسے بے تحاشا و بے بہا قدرتی مواقع۔ بس ایک دور تھا جو بیت گیا۔ اور کچھ چیزوں کی تاسیس تھی جو بروقت ہوگئی۔

سمجھو ایک ایسی فیکٹری تھی جس نے دو ڈھائی سو سال، رات دن کی شفٹیں لگا کر کام کیا، انسانی تاریخ کے نفیس ترین جوہر کو کام میں لائی، اور قیامت تک کی انسانی ضرورت کی بنیادی ترین اشیاء پیدا کر ڈالیں(۳)۔ بعد کے لوگ اپنے اپنے دور کے اندر اِس کی اِن لازوال مصنوعات کو کام میں لانے کا طریقہ اور سلیقہ ہی سیکھ لیں(٤) تو وہ جہانِ انسانی کی قیادت سے کمتر کسی منصب پر نہ دیکھے جائیں۔

بنا بریں، شخصیت پرستی ہمارے دین میں نہیں لیکن ایک صیرفیِ جوہر شناس اور ایک عام منیاری والے کے مابین فرق ختم کر دینا بھی ہمارے دین کی تعلیم نہیں؛ کہ ہر دو کے ہاں سے 'زیور' ہی تو دستیاب ہے......!

ایسی امت میں کیا خیر، جس کو معلوم ہی نہ ہو کہ دین لینے اور سمجھنے کیلئے اُس کو کس کے پاس جانا ہے اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہؐ کے فہم و استیعاب کیلئے کس کے یہاں جا کر بھیڑ کرنی ہے:

عن أبی أمیة اللخمی (الجمحی)، أن النبی صلی الله علیه وسلم قال:

"إن من أشراط الساعة ثلاثة، إحداهن: أن یلتمس العلمُ عند الأصاغر"۔ (رواہ ابن المارك والطبرانی، و صححه الألبانی) ☆

ابوامیہ جمحیؓ سے روایت ہے، کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

☆ ''قیامت کی نشانیوں میں سے تین ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ: علم بونوں کے ہاں ڈھونڈا جائے گا۔

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه، قال: "لا یزال الناس بخیر ما أتاهم العلم من أصحاب رسول الله ﷺ، ومن أكابرهم، فإذا جائهم العلم من قِبَلِ أصاغرهم فذلك حین هلكوا"۔ (المعجم الکبیر للطبرانی الأثر رقم: ٨٥١١،

☆ (المعجم الکبیر للطبرانی، الحدیث رقم: ١٧٥٣٦، الزهد والرقائق لابن المبارك رقم: ٦١۔ قال الألبانی صحیح انظر السلسلة الصحیحة ج ٢ رقم الحدیث ٦٩٥)۔ **ابن عبدالبر اِس حدیث کے تحت قاسم بن سلام اور عبداللہ بن المبارکؒ کے اقوال لاتے ہیں:**

وذكر أبو عبید فی تأویل هذا الخبر عن ابن المبارك أنه كان یذهب بالأصاغر إلیٰ أهل البدع ولا یذهب إلی السن۔ قال أبو عبید: وهذا وجه۔ قال أبو عبید: والذی آریٰ أنا فی الأصاغر أن یؤخذ العلم عمن كان بعد أصحاب رسول الله ﷺ، فذاك أخذ العلم عن الأصاغر۔

(جامع بیان العلم۔ ج ١ ص ٦١٢۔ الأثر رقم: ١٠٥٢)

ابوعبید نے اس حدیث کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ابن المبارک اس طرف گئے ہیں کہ اس میں ''اصاغر'' سے مراد ہیں اہل بدعات، اور یہ کہ اس کا تعلق کسی کی عمر سے سے نہیں۔ ابوعبید کہتے ہیں: یہ اس کا ایک مطلب ہے۔ ابوعبید نے کہا: اور جو میری رائے ہے وہ یہ کہ اصاغر سے مراد ہے دین کا علم وفہم اُن لوگوں سے لیا جائے گا جو اصحابِ رسول اللہؐ کے بعد ہیں۔ تو یہ ہوا اصاغر (بونوں) سے علم لینا۔

كتاب الزهد والرقائق لابن المبارك، الأثر رقم: ٨٠٢، جامع بيان العلم ١: ٦١٧)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہا:

''لوگ خیر خیریت سے رہیں گے جب تک اُن کو علم اصحابِ رسول اللہؐ سے پہنچتا رہے گا، اور ان کے بڑوں سے پہنچتا رہے گا۔ ہاں پھر جب ان کو علم اُن کے بونوں کے پاس سے آنے لگے گا تو یہ وہ وقت ہوگا جب وہ ہلاک ہوں گے''

كان عمرُ يقول: إنَّ أصدق القيلِ قيلُ الله۔ ألا وإن أحسن الهديِ هديُ محمدٍ ﷺ۔ وشر الأمور محدثاتها، وكل محدثة ضلالة۔ ألا وإن الناس بخيرٍ ما أخذوا العلم عن أكابرهم، ولم يقم الصغير على الكبير، فإذا قام الصغير على الكبير فقد''

(شرح أصول الاعتقاد للالكائی ١: ٨٤، الأثر رقم ٨٨۔ وذكر جزئاً منه فی جامع بيان العلم ١: ٦١٥ الأثر رقم: ١٠٥٤)

عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

سب سے اچھا کلام اللہ کا قول ہے۔سب سے اچھا نمونہ محمد ﷺ کا نمونہ ہے۔ سب سے بری چیز وہ ہے جو دین کے اندر نئی نکال لی گئی ہو، اور ہر نئی نکال لی گئی بات گمراہی ہے۔ خبردار! لوگ خیر سے رہیں گے جب تک کہ وہ علم اپنے بڑوں سے ہی لیں، اور جب تک یوں نہ ہونے لگے کہ چھوٹا، بڑے کے اوپر بڑا بنے۔ ہاں جب چھوٹا، بڑے پر بڑا بننے لگا، تو تب وہ وقت ہوگا کہ..

اس معنیٰ کے کئی دیگر آثار نقل کرنے کے بعد آخر میں جا کر ابن عبد البرؒ ایک تقریر دیتے ہیں، گو اس میں بھی وہ کچھ آثار کی جانب ہی اشارہ کرتے ہیں:

وقال آخرون: معنىٰ حديث ابن عمر وابن مسعود فی ذلك أن العلم

إذا لم يكن عن الصحابة كما جاء فى حديث ابن مسعود، ولا كان له أصل فى القرآن والسنة والإجماع، فهو علم يهلك به صاحبه، ولا يكون حامله إماما ولا أمينا ولا مرضيا كما قال ابن مسعود، وإلىٰ هذا نزع أبو عبيد رحمه الله۔ (جامع بيان العلم۔ ج ١ ص٦١٨۔ الأثر رقم: ١٠٥٦)

دیگر بزرگانِ سلف نے بیان کیا ہے کہ: حدیث ابن عمرؓ و ابن مسعودؓ کا مفہوم اس سلسلہ میں یہ ہے کہ علم اگر صحابہؓ سے چلتا ہوا نہ آیا ہو، جیسا کہ حدیث ابن مسعودؓ میں ہے، اور نہ اس کا کوئی اصل قرآن میں ہو اور نہ سنت میں اور نہ اجماع میں تو وہ ایک ایسا علم ہوگا جو آدمی کو برباد کروا دے۔ ایسے علم کا حامل نہ امام ہوگا، نہ امانت کا محل، اور نہ قابل اطمینان، جیسا کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ اور اسی معنیٰ کی جانب امام ابوعبید (قاسم بن سلام) کا میلان ہے۔

☆☆☆☆☆

وہ دور (خیر القرون) جس سے ــــ صحابہؓ کے علمی اتباع کو لازم ٹھہرانے کے حوالے سے ــــ ڈھیروں کے حساب سے یہ سب آثار اور یہ نقولات ملتی ہیں.. یہاں تک کہ اُس دور کا کوئی بھی امام، علمائے صحابہؓ کے علمی مقررات سے ہٹ کر اور اقوالِ صحابہؓ سے نکل کر اپنی مصنوعات سامنے لانے کا روادار ہی نظر نہیں آتا، (اور اگر کسی نے یہ کام کیا تو وہ خوارج و روافض و معتزلہ وغیرہ ہوئے، جن کو خیر القرون کے اُس معاشرے سے صبح شام سننے کو کچھ ملتا تو وہ بربادی کی وعیدیں ہوتیں).. نہایت ضروری ہے کہ اُس دور کی اُن اشیاء کا جو اُس کے یہاں مسلمات کی حیثیت کر گئی تھیں صحیح صحیح مول لگایا جائے۔ ایک نہایت عظیم بات کو محض ایک جملے میں اڑا دینے کا اسلوب تباہ کن ہے۔

بظاہر 'احترام' پر مبنی یہ رویہ کہ...... مقرراتِ سلف کی اتباع کو واجب ٹھہرانے والے آثارِ شافعیؒ کو ایک جانب لڑھکا دیا جائے، آثارِ ابوحنیفہؒ کو کسی دوسری جانب، آثارِ مالکؒ کی کسی اور طرح توجیہ کر لی جائے اور احمدؒ و اوزاعیؒ و بخاریؒ وغیرہ کے آثار سے کسی اور طرح جان چھڑائی جائے اور زیادہ ہی ہوا تو اِن ائمۂ علم کیلئے کوئی 'عذر' تلاش کیا جائے کہ صاحب وہ تو کوئی دور ہی ایسا تھا کہ سب لوگ ایک سی ہی 'غلطی' کرتے چلے آئے ہیں اور اُن پر تو اقوالِ ابوبکرؓ وعمرؓ و ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ وغیرہ کی دھاک ہی کچھ غیر ضروری طور پر بیٹھی رہی ہے...... اور یہ کہ ہم آئے ہیں تو اَب کہیں جا کر بوحنیفہؒ و شافعیؒ کے اُن نسل در نسل چلے آنے والے دستوروں کی تصحیح ہونے لگی ہے!

ردِ تقلید کے مومنٹم سے زور پکڑنے والا یہ آزادی پسند رویہ جو کئی ایک عوامل کے تحت اَب تیزی کے ساتھ مقبولیت پانے لگا ہے...... شدید حد تک باعث تشویش ہے۔

کچھ اور نہیں تو صرف اِسی ایک بات ہی کو مدنظر رکھ لیا جائے کہ آپ کا یہ دور جس میں کھڑے ہو کر آپ کو ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، بخاریؒ وغیرہ کے یہ متفقہ مقررات 'غلط' نظر آتے ہیں، جہالت اور علمی بوناپن کا دور ہے (ابھی اس کے ساتھ ہم اھواء اور بغی اور بیرونی اثرات - خصوصاً استشراقی اثرات جو کہ ہوا میں پھیلے ہوئے وبائی خصائص کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور آپ سے آپ نفس میں اترتے ہیں - کا ذکر نہیں کر رہے)۔ اور یہ کہ جس دور کے علمی مقررات آج جا کر آپ کو 'غلط' نظر آنے لگے ہیں وہ علم اور ہدایت کا تابناک ترین دور ہے!

جس آسانی کے ساتھ ہمارے آج کے یہ لوگ ابو حنیفہؒ و شافعیؒ وغیرہ کو فارغ کر دیتے ہیں اور ان سب فقہاء کے مابین متفق علیہ چلے آنے والے علمی وفقہی پیمانوں کو (خاص اپنے 'کتاب وسنت' کے فہم کی رو سے!) بیہودہ وفرسودہ بنا کر رکھ دیتے ہیں، حیران کن بھی ہے اور پریشان کن بھی اور افسوسناک بھی۔ تصور کریں اتباعِ صحابہؓ کو لازم ٹھہرانے کے حوالے سے (معاذ اللہ) کوئی ایسا 'بیہودہ قاعدہ'، عمر بن عبد العزیز، قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ بن عمر، عروہ بن زبیر، ابن مسیّب، عطاء، مجاہد، طاووس، عکرمہ، ابن جبیر، حسن بصری، سلیمان بن یسار، شعبی، ابن سیرین، علقمہ، شریح، مسروق، مکحول، زہری، ابن ابی حبیب، ابو ثور، ابن راھویہ، نخعی، حماد، ابو حنیفہ، ثوری، ابن المبارک، ابن سلام، اوزاعی، ربیعہ، مالک، لیث، یحی، معمر، ابن عیینہ، طبری، شافعی، احمد، ابو یوسف، محمد، زفر، ابن القاسم، اشہب، مزنی، ابن معین، بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابو داود، ابن ماجہ، مروزی، حمیدی (رحمہم اللہ) وغیرہ وغیرہ نے (''اتباعِ سلف'' ایسا کوئی ایسا بے بنیاد قاعدہ!) بنا بھی دیا (اور وہ بھی اس متفقہ انداز میں!)، جاری بھی کر دیا اور پھر وہ اِس امت کے اندر چل بھی گیا......!!! (نہ امت نے پیر پیر پر اس کو مخالفت اور مزاحمت دی اور نہ جا بجا اس پر کہیں مناظرے دیکھنے میں آئے.. اور وہ بھی علم کی اُن تابناک ترین صدیوں کے اندر!) اور پھر ان بزرگانِ خیر القرون کا بنایا ہوا کوئی ایسا (بےسر و پا!) قاعدہ برس ہا برس اور صدی ہا صدی چلنے کیلئے... بعد کی صدیوں میں پائے جانے والے ہزار ہا ائمۂ علم (مانند دارمی، بیہقی، ضحاک، خلال، ابن حبان، طحاوی، بربہاری، ابن بطہ، لالکائی، ابن عبد البر، دینوری، اسفرائینی، اشعری، غزالی، ابن جوزی، اصفہانی، رازی، کاسانی، سرخسی، دسوقی،

قرافی، شیرازی، مقدسی، ابوشامہ، قرطبی، بغوی، خرقی، شاطبی، ابوحیان، مناوی، ابن بطال، ابن عبدالسلام، ابن تیمیہ، ابن قیم، ذہبی، نووی، شربینی، ابن کثیر، ابن حجر، ابن رجب، ابن ابی العز، بقاعی، زرکشی، ھیتمی، ماوردی، بلقینی، فیروزآبادی رحمہم اللہ وغیرہ وغیرہ) کے ہاں نہ صرف باقاعدہ رواج اور قبولیت پا کر رہا بلکہ اپنے اپنے دور میں علم کے یہ سب پہاڑ باقاعدہ اسی دستور (صحابہؓ کے منہج کی پابندی) کے مبلغ اور داعی اور اس کے پرزور وکیل بن کر رہے...... تاآنکہ جہالت کی یہ حالیہ صدیاں آئیں جنہوں نے ہمارے یہ نکتہ ور پیدا کر کے دیے اور پھر اِنہوں نے آ کر اُن 'غلطیوں' کی نشاندہی کی کہ دیکھو کیسے کیسے 'غیر علمی' استدلال کر کے یہ لوگ سلف کی اتباع کو لازم ثابت کر لیتے رہے ہیں اور سلف کی 'تقلید' کرتے ہوئے کتنے کتنے 'واضح' مقامات پر یہ لوگ ایک سراسر غیرواجب اور غیرضروری چیز کو واجب بنا دیتے رہے ہیں......!!!!!☆

ایک اتنا بڑا اور ناقابل تصور مفروضہ قائم کرنے کی نسبت کیا یہ کہیں بہتر نہیں کہ جو لوگ آج یہ رائے قائم کرنے لگے ہیں کہ سلف کی اتباع کو غیرضروری طور پر اس امت کے اندر فرض ٹھہرا لیا گیا ہے......، اُن کی اپنی نظر کو ہی مطعون ٹھہرا لیا جائے جو کہ ہماری تاریخ کی اِن مابعد انحطاط صدیوں (٥) میں آ کر کچھ زیادہ ہی فعال ہو چکی ہے!؟

ایک سیدھی مستقیم چیز، جو عہد نبوت سے ایک باقاعدہ علمی تسلسل کی صورت میں چلی آ رہی ہے، آج کسی کو ٹیڑھی نظر آنے لگی ہے تو اس امکان کو کیوں سامنے نہ

☆ استعمار اور اس کے جلو میں استشراق نہ آتا تو اپنی یہ ''نظر'' بھلا کب آزاد ہونے والی تھی! پس اس استشراق کو تو جتنی دعائیں دی جائیں کم ہے!

رکھا جائے کہ دیکھنے والی نظر میں ہی یا اُس کی کسی رگ میں ہی ٹیڑھ ہو؟ آخر اِس ٹیڑھ کو ہی تو ہمارے وہ ائمۂ سنت ''اھواء'' کا نام دیتے تھے اور ''بغی'' قرار دیتے تھے! اور یہ ٹیڑھ بھی کوئی نیا تو نہیں ہے؛ ائمۂ سنت ہمیشہ اہل بدعت کی یہی تو تشخیص کرتے رہے ہیں!

پس مسئلہ اِن کی تشخیص کا ہے...... نہ کہ اُن کی تصحیح کا!؟

☆☆☆☆☆

حواشی

(حاشیہ ۱):

اس سلسلہ میں ائمۂ سلف کا جو اختلاف ہوا ہے، وہ زیادہ تر ان دو نقطوں کے گرد ہی گھومتا ہے:

الف: صحابی کا وہ قول جو صحابہؓ کے مابین مشہور نہیں ہوا ہے، کوئی اختلاف ہے تو وہ اس کے حوالے سے ہے؟ رہ گیا صحابی کا وہ قول جو صحابہؓ میں شہرت اختیار کر گیا ہے اور دیگر صحابہؓ سے اُس کی معارضت یا اُس کا خلاف ثابت نہیں ہے، تو اس کو اِن ائمۂ سلف میں سے کوئی بھی رد نہیں کرتا: نہ ابو حنیفہؒ، نہ مالکؒ، نہ شافعیؒ، نہ احمدؒ اور نہ کوئی اور......، اور جو کہ ہماری کتاب کے اِس پورے کیس کا اصل لب لباب ہے۔

ب: دوسرا یہ کہ اقوال صحابہؓ کے اپنے مابین جہاں تعارض پایا گیا ہے، وہاں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ عمر بن عبد العزیزؒ، امام مالکؒ ودیگر کا مسلک ہے کہ متعارض اقوال اگر صحابہؓ کے ہیں تو ان میں سے کسی کو بھی اختیار کر لو؛ یعنی ایک مسئلہ میں ہر دو قول حجت ہے، اور بذاتِ خود دلیل ہے؛ دلیل کی بنا پر ایک قول

کو دوسرے پر ترجیح دینے کا کیا سوال؟ جبکہ امام ابو حنیفہؒ و شافعیؒ و دیگر کا مسلک یہ ہے کہ صحابہؓ کے اقوال جہاں متعارض ہیں وہاں ان میں سے ایک کو دوسرے پر ادلہ کی بنا پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ البتہ سبھی کے ہاں طے ہے کہ فقہائے صحابہؓ کے اقوال سے مجموعی طور پر باہر نہیں جایا جائے گا، جیسا پیچھے نقولاتِ ائمہ میں آپ دیکھ آئے ہیں (اور جس سے کہ ہمارا کیس پورے طور پر ثابت ہو جاتا ہے)۔

بنا بریں، ''قولِ صحابیؓ'' کے حوالے سے کوئی شخص اگر امام مالکؒ و شافعیؒ کے اختلاف یا شافعیؒ کے قدیم و جدید سے متعلق کوئی ٹیکنیکل تفصیل لا کر ہمیں دیتا ہے کہ دیکھیں جناب سلف کے تو اپنے مابین اِس موضوع پر اختلاف ہے......تو اُس کی وہ ساری بحث ہمارے اِس کیس کو غلط ٹھہرانے کے حوالے سے غیر متعلقہ ہی رہے گی۔

وہ چیز جو ہم اس کتاب میں بیان کرنا چاہ رہے ہیں اور اس پر یہاں کے فکری و تحریکی عمل کی بنیاد اٹھانا چاہ رہے ہیں، اُس پر اللہ کے فضل سے ائمۂ علم کے مابین ہرگز کوئی دو رائے نہیں۔

حاشیہ ۲:

شریعت کے ساتھ کھلواڑ کیلئے کھلا لائسنس

یہاں ایک واردات کے طور پر نکتہ اٹھایا جاتا ہے کہ آسمانی دین کو زمین کی خانہ سازی سے الگ کرنے کیلئے ہی تو ہم صحابہؓ کا یہ منصب تسلیم نہیں کرتے کہ اُن کا فہم اور ان کا منہج کوئی حجت ہو اور یہی وجہ ہے کہ ہم کتاب و سنت کو ابتداءً اپنی عقول سے سمجھتے اور سمجھاتے ہیں!

یہ ایک گمراہ کن حربہ ہے اور شریعتِ امتِ بیضاء کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ایک کھلا لائسنس۔

ظاہر ہے کتاب وسنت کو سمجھنے کیلئے ''فہم'' کے اصول ومبادی اور حدود وقیود درکار ہیں۔ اب جب ''فہمِ کتاب وسنت'' کیلئے درکار اصول ومبادی دینے کی نوبت آتی ہے تو یہاں یہ لوگ صحابہؓ کو فارغ کر کے کہتے ہیں کہ امت کی یہ خدمت کرنے کیلئے ہم جو ہیں! ایک بڑی واردات سمجھو یہیں پر ہو جاتی ہے اور اگلی بہت سی وارداتوں کی اساس پڑ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ معاملہ ''فہمِ کتاب وسنت'' تک ہی نہیں رہ جاتا۔ سرکتے سرکتے ''کتاب وسنت'' کی تعریف تک بھی چلا جاتا ہے۔ ''سنت'' کے تعین اور ''سنت'' کے اثبات کے معاملہ میں ہی خوب خوب وارداتیں ہو جاتی ہیں اور ایسے ایسے گل کھلتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ نے خود تو ''سنت'' کی کوئی ایسی باقاعدہ تعریف بھی جاری کر کے نہیں دی۔ پھر ''سنت'' کو ثابت کرنے کے جو جو ذرائع اور ضوابط ہیں وہ بھی رسول اللہ ﷺ نے نصوص کی صورت میں جاری کر کے نہیں دیے۔ ''مصطلح الحدیث'' کی پوری سائنس آپؐ کے بعد ہی (قرونِ سلف میں) ڈیویلپ ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بخاری'' تک پر بڑے آرام سے ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے؛ اب (معاذ اللہ) اللہ کے رسول ﷺ خود تو آ کر امت کو نہیں بتائیں گے کہ امام بخاریؒ کی تدوین کس درجے کی ہے اور اس کے بعض راویوں کی چھان پھٹک کے کیا حدود وقیود ہوں گے، اور یہ قیود کتنے نرم کر دیے جائیں اور کتنے سخت کر دیے جائیں؛ ظاہر ہے یہ معیارات اور ان کی روشنی میں ایک ایک روایت کا اسٹیٹس آپ کو محدثین سے ملے گا جو کہ مدرسۂ صحابہؓ کا استمرار

حواشی

ہونے کے ناطے ہمیں بتائیں گے اور جو وہ بتائیں گے وہ ہمیں تسلیم کرنا ہو گا، ورنہ ہمارے حدیث کے سب ذخیرے بازیچۂ اطفال بنے ہوں گے اور ہر کوئی ان کو اپنے اپنے 'فہم قرآن' اور اپنی اپنی 'عقل عام' کی سان پر کستا پھرے گا اور گلی گلی حدیثوں کے ساتھ ایک کھلواڑ ہوتا پھرے گا۔ اسی طرح اصولِ تفسیر ہیں۔ اسی طرح اصولِ فقہ ہیں۔ اسی طرح اصولِ عقیدہ ہیں۔ ''صحابہؓ کو بنیاد مان کر آگے چلنے'' ایسی قید سے جب آپ نے جان چھڑا لی تو پھر تو آپ جس طرف مرضی جائیں؛ اور ہر ہر موضوع پر صدیوں تحقیق بھی کریں اور بحثیں بھی، اور 'فائنل' چیز (جہاں بحثوں کی گنجائش ختم ٹھہرا دی جائے) پھر بھی نہ لائی جا سکے۔ (کچھ ماحول کے زیر اثر، اور کچھ نفسیاتی عوامل کے تحت، کچھ تربیت کے نتیجے میں، کچھ طبعی شرافت، اور کچھ شاطر اپروچ اختیار کر کے، آپ بھی بہت سی جگہوں پر عین ویسے ہی نتائج پر پہنچ جائیں گے جن پر صحابہؓ اور سلف پہنچے ہوئے تھے☆ تو کل کو ماحول کے اثرات، اور حالات کے جھکڑ، اور آپ کے اپنے نفسیاتی عوامل، اور تربیتی احوال، اور جولانیِ طبع، اور کہیں کہیں پر ردعمل بھی، اور 'وقت کی ضرورتیں'، اور خود آپ کے اھواء، آپ کو کہیں اور بھی پہنچائیں گے۔ حتیٰ کہ اگر آپ اپنے ذہن میں کوئی حد رکھ کر بھی بیٹھے ہوں کہ اس حد کو تو بہرحال پار نہیں کرنا، تو آپ کے بعد والے تو پھر بھی کہیں سے کہیں پہنچیں گے!)

غرض بہت سے کام ہیں جن سے یہ لوگ صحابہؓ کو فارغ کریں گے تو صحابہؓ سے خالی کروائی ہوئی وہ جگہ یہ خود لیں گے۔ اور واقعتاً یہ صحیح ہے کہ نقطۂ ابتداء کے حوالے سے یہ ایک ''وے کنسی'' vacancy تو ہے اور اس کو پر تو کسی نہ

☆ اِس حوالہ سے دیکھئے، حصہ دوم کی فصل ''فہم کے مراجع'' آخر میں حاشیہ نمبر۲

کسی چیز سے بہرحال کرنا ہوتا ہے؛ یا فہم و دستورِ صحابہؓ سے اور یا اپنی اَقول سے۔ شروع اِس 'متواضع' پیشکش سے ہوتی ہے کہ فہم کے مبادی جو آپ کو صحابہؓ نے رسول اللہؐ سے لے کر اور سمجھ کر دیے ہیں یہ مبادی 'کتاب وسنت' اور 'عقل عام' سے نکال کر آپ کو ہمِ دے دیتے ہیں۔ اور پھر یہاں سے وہ وہ اصول آتے ہیں کہ کچھ ہی دیر میں خود ''کتاب وسنت'' ہی کا گھونٹ بھرلیا جاتا ہے اور ایک سے ایک نیا موڑ ایسا آتا ہے کہ آپ چکرا کر رہ جاتے ہیں کہ سنتِ رسول اللہؐ کے ساتھ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ابھی ایک جھٹکے سے نہیں سنبھلتے کہ ایک اور جھٹکا آیا ہوتا ہے۔ چودہ سو سال سے چلتے آنے ایک معلوم امر سے پٹڑی یوں الگ ہوتی ہے کہ بس چلنے کی دیر ہے معاملہ کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ یوں ڈیڑھ ہزار سال سے چلے آنے والے اسلام کے مسلمات کا ایک ایک کر کے وہ تیاپانچہ ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ۔

صحابہؓ کو بیچ سے نکال کر اور معاملہ اِن آخری زمانے والوں کے ہاتھ تھما کر چوپٹ کھول دیا جائے کہ اھواء سے بھری ہوئی ان کی ہر نسل آئے اور دین کے ساتھ کھیلے، تو تب یہ لوگ مانیں گے کہ آپ 'تقلید' سے بچے ہوئے ہیں!

حاشیہ ۳

اتنے عظیم الشان ''پرزوں'' کا اور وہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر، اور وہ بھی ایک وقت میں، دستیاب ہونا جو کہ اِس فیکٹری کے اُس بڑے اسکیل پر کام کرنے کیلئے درکار تھے، بعد میں نہیں پائے گئے...... تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بات مابعد ادوار کے ساتھ خاص خدائی منصوبوں کے ساتھ ایک طرح سے ہم

حواشی

آہنگ ہی ہے۔ ہم جانتے ہیں، ''بنیادی ترین کام'' کی ضرورت کسی امت کے اندر ابتدا میں ہی ہوتی ہے۔

حاشیہ ٤

سلف کے اِس نایاب وبیش بہا اثاثہ کو کہیں نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس کو موضعِ اقتداء ہی تسلیم کر کے نہیں دیا جاتا اور کہیں ان مصنوعاتِ سلف کو اختیار کرنے کے عمل میں خاصی ناپختگی اور جمود پایا جاتا ہے بلکہ کہیں تو مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے۔ سلف کی وہ فاعلیت اور وہ سپرٹ جو اُن کے ہاں مصادرِ شریعت اور اپنے وقت کے معاشروں ہر دو کے ساتھ تعامل کے اندر پائی جاتی تھی، قریب قریب یہاں مفقود ہے، الا من رحم ربی۔

حاشیہ ٥

تین ادوار، تین مدرسے

اجمالاً، ہماری مسلم تاریخ تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے:

- **دورِ عروج** جو کہ سلف کا زمانہ ہے اور اس سے متصل بعد کی صدیاں۔

اِن صدیوں کے دوران اتباعِ سنت وسلف کی روح جیسے جیسے اوپر اور نیچے جاتی رہی ویسے ویسے ہی ہمارے اِس عروج کا گراف اوپر اور نیچے جاتا رہا۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ دورِ سلف کے بعد اِس امت کو کبھی عروج نہیں ملا (یہ زیادہ تر مستشرقین کی بنائی ہوئی تصویر ہے)۔ تیسری صدی ہجری سے قرامطہ، معتزلہ، خوارج، باطنیہ (فاطمی 'خلافت'، حشاشین، صلیبیین) اور

رافضی بویہیوں کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا اور چوتھی صدی ہجری کے وسط تک یہ عمل اپنی آخری حد کو پہنچ گیا تھا یہاں تک کہ اس کو عالم اسلام پر مبتدعہ کا قریب قریب ایک مکمل قبضہ کہا جا سکتا ہے۔ اور جس کے نتیجے میں بیت المقدس تک صلیبیوں کے پاس چلا گیا تھا اور شوکت اسلامی کی بری طرح خاک اڑنے لگی تھی۔ مگر چوتھی صدی ہجری کے وسط سے ہی اِس امت نے اہلسنت کی سرکردگی میں ایک نئی کروٹ لینا شروع کی تھی (باوجود اس کے کہ اُس کے اندر ایک ''دخن'' بھی تھا)، جس کے نتیجے میں بہت جلد ایسا ہوا کہ سنی سلجوقیوں، غزنویوں، غوریوں، زنگیوں، ایوبیوں، مرابطین، اور غلامان ومممالیک اور بعد ازاں اسی کے مومنٹم کو آگے بڑھانے کیلئے عثمانیوں نے ...... ہند کے سومناتوں سے لے کر یورپ کے قلعوں تک کو پھر سے لرزانا شروع کر دیا تھا اور ایک کثیر خلق خدا کو شرک سے آزاد کرایا تھا۔ اور طویل عرصے تک اللہ کے فضل سے روئے زمین پر یہ صورت قائم رہی تھی۔ علوم سنت کا بھی جو ایک ازدھار اِس زمانے میں از سرنو ہوا اور ائمۂ سنت کے بڑے بڑے نام دوبارہ آسمانِ علم پر نمودار ہوئے وہ ایک ایسا روشن بین واقعہ ہے کہ ایک متعصب شخص ہی اس تاریخی حقیقت کا انکار کرے گا کہ ایک بڑی سطح پر ''سنت'' کی جانب رجوع کا عمل جب بھی اِس امت کے اندر بحال ہوا اس کے پانیوں کی سطح یک لخت بلند ہوئی اور اس کی معطل شدہ کشتیاں پھر سے اُن پانیوں پر نہایت کامیابی کے ساتھ تیرنے لگیں اور اس کے طوفانوں نے پھر سے عالم کفر کو اپنے تھپیڑوں کی زد میں لے لیا۔ آج البتہ ہمیں تاریخ کی جو ایک تفسیر پڑھائی جا رہی ہے وہ بے حد گمراہ کن ہے اور دراصل استشراق کا گھولا ہوا زہر۔

حواشی

- **دوسرا، دورِ انحطاط**۔ ''انحطاط کی صدیاں'' ہماری تاریخ میں وہ ہیں جن میں ہم پر ایک آخری درجے کا اِدبار اور جمود طاری ہوا اور ترکِ جہاد واجتہاد کی ایک وسیع سطح پر بنا پڑی؛ یعنی استعمار سے پہلے کی کوئی تین چار صدیاں؛ جس کے نتیجے میں بالآخر ہمارا سب کچھ ہمارے ہاتھ سے چلا گیا اور خود عالم اسلام ہی کے اندر ہم محکوم اور مستضعف ہو کر رہ گئے۔

- **اور پھر تیسرا، یہ دورِ استعمار و استضعاف**۔ جس کو ہم نے ''ما بعد انحطاط صدیوں'' کا نام دیا ہے۔ ہماری مراد ہے سقوطِ دولت کے بعد کے ادوار۔ اس کو ہم دورِ انحطاط نہیں بلکہ دورِ ما بعد انحطاط کہتے ہیں: یعنی ہمارا آج کا دور، جو کوئی پچھلی دو صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

اپنے اِس حالیہ ''دورِ مابعد انحطاط'' میں عالم اسلام کے اندر بالعموم تین طبقے دیکھے گئے:

۱- وہ طبقے جو ہمارے اُس دورِ انحطاط کا ہی ایک تسلسل ہیں؛ یعنی استعمار کے آنے سے پہلے کی چند صدیوں کے دوران پروان چڑھنے والے رویوں کو ہی لے کر چلنے پر مصر ہیں۔ کہیں ''جمود'' مانعِ اجتہاد ہے تو کہیں ''اِدبار'' مانعِ جہاد.. اور کہیں یہ دونوں رویے ایک ساتھ۔ نہ یہ لوگ ''زمانے کے ساتھ پورا اترنے'' کے حوالے سے خود اپنے دور میں آنے کیلئے تیار ہیں اور نہ اپنی ''فکری ساخت'' کروانے کے حوالے سے دورِ سلف میں جانے پر آمادہ۔ بیچ کی ہی کچھ صدیاں ہیں جن میں یہ لوگ پھنس کر رہ گئے ہیں۔ غرض زوال کا قریب قریب پورا ایک پیکیج ہے جس کو یہ آج بھی، کہ جب ہمارا سب کچھ ہمارے ہاتھ سے چلا گیا ہے، ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں اور اسی کو 'فلاح' کی واحد صورت جانتے ہیں۔

۲- دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے زمانے میں تو کسی حد تک پایا جاتا ہے مگر اپنے ماضی کے اِستنکار کی قیمت پر۔ یہ لوگ دورِانحطاط کی بعض علمی و فکری یادگاروں سے جان چھڑواتے چھڑواتے دورِسلف کے علمی دساتیر سے بھی جان چھڑوا لیتے ہیں اور مقرراتِ سلف کے اندر بھی جا بجا کیڑے نکالتے ہیں۔ صحابہؓ کے فہم کی پابندی تک کے روادار نہیں؛ اور کتاب وسنت کی بالکل ایک نئے سرے سے تفہیم ہی نہیں تعریف تک جاری کر کے دینے کے مشن پر ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے صحابیؓ کو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہ ہوں گے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو بھی ''سنت'' کی سند دینے کا اختیار اپنے ہی پاس رکھتے ہیں بلکہ جب چاہتے ہیں اس کو اِس مقام سے محروم بھی کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کو (معاذ اللہ) بے شمار امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے تا آنکہ وہ شرعِ متّبع ٹھہرے! اِس کی علمی وفکری جہتوں کو زیادہ تحریک اُسی 'اینلائٹمنٹ' سے ہوئی جو استشراق کے جلو میں نہایت شروع کے اندر یہاں پہنچی تھی۔ اِس جہت میں آگے بڑھنے کیلئے داخلی مصادر سے جس قدر 'انسپائریشن' درکار تھی اور تیار اَدلہ کی جس قدر ضرورت تھی وہ مدرسۂ اعتزال کے کچھ بوسیدہ دفاتر نے پوری کر دی (خود مدرسۂ اعتزال کی جڑیں بھی 'قدیم' ہونے کے باوجود بیرونی انسپائریشن سے ہی تعلق رکھتی ہیں)۔ ہمارے ہاں یہ لوگ 'جدت پسندوں' کے نام سے جانے جاتے ہیں اور عرب میں 'عصرانیین' کے لقب سے۔

بہرحال اول الذکر طبقہ اُس انحطاط کے تسلسل کو جاری رکھنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے (زیادہ تر نادانستہ طور پر) تو یہ ثانی الذکر طبقہ اِس استعمار کا

حواشی

عرصہ دراز کروانے اور اس کے استشراق کو ہمارے معاشرے میں راستہ دلوانے کا ذریعہ بنا ہوا (کہیں نادانستہ تو کہیں دانستہ)۔

۳- تیسرا طبقہ وہ ہے جو ''احیائے سنت'' کیلئے سرگرم عمل ہے۔ ''منہجِ سلف'' کو واپس لانے کیلئے کوشاں ہے۔ دورِ انحطاط کی یادگاروں کے خلاف بھی معرکہ آرا ہے اور دورِ استعمار و استشراق کے دیے ہوئے رجحانات کے خلاف بھی برسر جنگ ہے۔ اندرونی بدعات اور بیرونی فساد والحاد ہر دو کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ (لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم) شرک کے پرانے مظاہر کی بھی بیخ کنی کرتا ہے اور شرک کے جدید لشکروں کے مقابلے میں بھی سر بکف ہے۔ جہاد کو بھی امت میں واپس لے کر آ رہا ہے اور اجتہاد کو بھی۔ اپنے زمانے میں پایا اور سنا جانے کیلئے بھی کوشاں ہے اور اپنی فکری ساخت کے معاملہ میں ''دورِ سلف'' کے اندر بھی ڈیرے جما کر بیٹھا ہے۔ بیچ کی صدیوں کی تحسین بھی کرتا ہے اور تنقیح بھی؛ اور ہر دو معاملہ میں معیار ''کتاب اللہ و سنت رسول اللہؐ بر فہمِ سلف'' کو رکھتا ہے۔ نہ کسی کا حق مارتا ہے اور نہ کسی کو اس کے حق سے بڑھ کر دیتا ہے کیونکہ جرح و تعدیل کے پیمانے اِس نے اپنے سلف سے لے رکھے ہیں۔ سختی کے مقام پر نرمی کرنا نہیں جانتا (أعِـزَّةً) اور نرمی کے مقام پر سختی کے پاس نہیں پھٹکتا (أذِلَّةً)۔ ہر ہر معاملہ میں یہ اپنے ''پہلوں'' کے اندر اپنے لئے نمونہ ڈھونڈتا ہے کیونکہ اس کے ''پہلے'' وہ ہیں جو دنیا پر حکومتیں کرتے گئے ہیں اور قلوب پر راج کرتے رہے ہیں۔ نہ حجروں میں بیٹھے رہے تھے اور نہ مسلکی جنگوں میں ملوث پائے گئے تھے۔ جو رزمِ حق و باطل کو بپا کرنا بھی جانتے تھے اور قلوب کی شیرازہ بندی میں بھی اپنی مثال

آپ تھے اور سنتِ رسول اللہؐ کی صحیح روح کے آشنا تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اور بعد ازاں آپؐ کے تربیت یافتہ اصحابؐ سے اپنے اِس منہج پر سند توثیق پا کر رہے تھے۔ ''اسلام'' اور ''شُعَبِ ایمان'' کی جامعیت کا پورا تصور یہ لوگ وہیں سے لیتے ہیں۔ یہی تحریک جو کہ عالم اسلام میں کہیں پر خاصی نمایاں ہے اور کہیں پر پیر جمانے کیلئے تن دہی کے ساتھ کوشاں ہے، اِس زمانہ میں ''مدرسۂ صحابہؓ'' کا احیاء ہے اور اِسی کے عمل کو آگے بڑھانا اِس دورِ انحطاط اور دورِ استعمار ہر دو کی ڈالی ہوئی زنجیروں اور بیڑیوں سے آزاد ہونے کی درست صورت۔ کہ لن يصلح آخرُ هذه الأمةِ إلا بما صلح به أولها !

فاللّٰهم انصر عبادَك الموحدين، أتباعَ السنة، الرافعين لواءَ الجماعة!

15

دلائل ابن قیمؒ از اِعلام الموقعین

صحابہؓ معیارِ حق ہیں اور اُنکے مدرسہ کی اتباع لازم

اعلام الموقعین میں یہ ایک طویل مبحث ہے؛ یعنی صحابہؓ کی علمی اتباع۔ یہاں ہم امام ابن قیمؒ کے ان دلائل سے استفادہ کریں گے۔عموماً یہ امام صاحب کے کلام کی تلخیص ہوگی، تاہم کہیں کہیں پر ہم نے اس کے بعض نقاط کو کھول بھی دیا ہے۔ مسئلۂ ''قولِ صحابیؓ'' کی ٹیکنیکل جہتوں کی طرف یہاں ہم نہیں جائیں گے، جس کی کچھ وضاحت پچھلی فصل کے حاشیہ نمبر ا میں گزری ہے۔

ا) آیت سورۃ التوبۃ

وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَداً ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبة: ١٠٠)

''اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب سے) سابق اور مقدم ہیں اور (بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ اُن سب سے راضی ہوا اور وہ سب اُس (اللہ) سے راضی ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کیلئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔ (ترجمہ: اشرف علی تھانوی)

وجہِ دلالت: آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو قابل ستائش ٹھہرایا ہے جومہاجرین وانصار کے سابقین اولین کی اتباع اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَان**۔

چنانچہ صحابہ(**السَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالأَنصَار**) اگرکوئی قول کہیں، تو اُس قول کی دلیل جاننے سے پہلے اس میں ان کی اتباع کرنے والا شخص ہی **السابقون الاولون من المهاجرين والأنصار** کا متبع کہلائے گا اور وہ لازماً اِس پر قابل ستائش ہوگا اور اللہ کی خوشنودی کا مستحق ٹھہرے گا (کیونکہ فرمایا: **رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ**)۔

صحابہؓ کےقول کی دلیل جاننے سے پہلے اس قول میں ان کی اتباع کیوں؟

وجہ یہ کہ آیت میں **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَان** کے جوالفاظ آئے ہیں اِس میں ''اتباع'' سے مراد اگر'تقلیدِ محض' ہوتی، جیسا کہ ایک عامی کسی مفتی یا عالم کی تقلید کرلیتا ہے،تو لازم آتا کہ صحابہؓ کی اتباع پرخوشنودیِ خداوندی (**رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ**) کے مستحق تب صرف اِس امت کے عامی ہوتے!!! رہ گئے علمائے مجتہدین تو ان کیلئے تو اس صورت میں صحابہ کی ''اتباع'' جائز ہی نہ ہوتی! پس واضح ہوا کہ آیت میں مذکور''صحابہ کی اتباع'' سے مراد کوئی ایسی چیز ہے جو عامی پر بھی لازم ہے اور عالمِ مجتہد پر بھی۔

اب یہاں ہم اِس پر وارد ہونے والے بعض اشکالات کا جواب دیں گے:

پہلا اشکال:

آیت میں **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم** سے مراد ہے''دلیل'' میں صحابہ کی پیروی کرنا۔یعنی جوقول صحابہ نے اختیار کیا وہی قول اختیار کرنا،مگر تب جب کتاب وسنت سے اُس پر

کوئی دلیل پائی جاتی ہو۔ مختصر یہ کہ آدمی پہلے اُس مسئلہ میں صحابہؓ کے اجتہاد اور استدلال کی صحت جانے اور پھر اگر وہ کتاب وسنت کے مطابق نکل آئے تو ضرور اُس کو قبول کرلے۔ کیونکہ صحابہؓ نے وہ قول کسی اجتہاد کی بنیاد پر ہی اختیار کیا ہوگا۔ یہ حضرات کسی کسی وقت یہ نکتہ بھی پیش کرتے ہیں کہ آیت میں مذکور لفظ ''بِإِحْسَانٍ'' اِسی بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کی اتباع ''دلیل'' کی بنیاد پر کی جائے نہ کہ بغیر دلیل۔ کیونکہ جو شخص صحابہ کی محض تقلید کرے گا (کسی قول میں صحابہؓ کی دلیل جانے بغیر اُنکی پیروی کرے گا) وہ ''متبع بإحسان'' (وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ) کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ اگر صحابہ کی مطلق اتباع ہی قابل ستائش ہوتی تو ''اتباع بإحسان'' اور ''اتباع بغیر إحسان'' کا فرق نہ کیا جاتا (جبکہ قرآن میں ''بإحسان'' کی شرط ذکر کر دی گئی)۔

ابن قیمؒ کا جواب:

''اتباع'' کے معنیٰ میں اِس بات کو شرط ٹھہرانا درست نہیں کہ صحابہ نے جو 'اجتہاد' یا 'استدلال' کیا ہے آدمی پہلے اُس کی صحت معلوم کرے اور اُس کو اپنے فہمِ کتاب و سنت پر پیش کرے۔ اور یہ بات اللہ کے فضل سے متعدد پہلوؤں سے واضح ہے:

الف) ''اتباع'' کا ذکر جہاں کہیں قرآن میں آیا ہے، جیسے {**فاتبعوني يحببكم الله** تو پھر میری اتباع کرو} اور {**واتبعوه لعلكم تهتدون** اور اِس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پا جاؤ} نیز {**ويتبع غير سبيل المؤمنين** اور جو شخص اتباع کرے مومنوں کے راستے کے ماسوا کی}.. وہاں ''اتباع'' اِس بات پر موقوف نہیں ہوتی کہ جس قول کی اتباع کرنا ہو آدمی ___ اُس کے قائل کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ___ اُس قول کی اپنی صحت پر ہی دلیل مانگے اور خود اپنی صوابدید سے اُس کو چیک کرے اور

اگر اُس کا خیال بنے کہ اس پر دلیل نہیں پائی جاتی تو اپنے آپ کو اُس کی پابندی سے آزاد جانے! اِس طرح تو آپ نے ہر شخص کو راہِ فرار دے دی کہ جب تک اُس کی اپنی تسلی نہ ہو اور وہ بھی اُس کے اپنے معیارات کی رو سے، تب تک وہ اس کا پابند ہی نہیں!

ب) آیت میں مذکور ''صحابہؓ کی اتباع'' سے مراد اگر یہ ہوتی کہ ان کے قول کی صحت پر دلیل مانگی جائے، یعنی صحابہ کی ''اتباع'' کسی مسئلہ میں اُن کے استدلال و اجتہاد کی چھان بین کر لینے کے بعد ہی کی جائے.. تو پھر آیت میں مذکور ''سابقین اولین از انصار و مہاجرین'' کے مابین اور ان کے مابعد آنے والی جملہ مخلوقات کے مابین کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ بھئی جب دلیل پوچھ کر ہی صحابہ کی بات تسلیم کی جائے گی تو دلیل پوچھ کر تو ہر کسی کی بات ہی تسلیم کر لی جائے گی! پھر صحابہ کی خصوصیت کیسی؟ تب تو آیت میں مذکور صحابہؓ اور دیگر سب لوگ ایک برابر ہو گئے اور آیت میں خاص ان کی اتباع کا ذکر بے معنی ہو گیا! جب آپ نے کہا کہ دلیل دیکھی جائے گی تو ''دلیل'' تو بذاتِ خود واجب الاتباع ہے اور اُس کو تو جس کے بھی ہاں وہ پائی جائے اُسی سے لے لینا ضروری ہوگا! ظاہر سی بات ہے جو شخص بھی صحیح دلیل دے دے اُس کی بات تسلیم کر لینا واجب ہے۔ ''اتباع'' سے مراد اگر یہی ہے پھر تو کائنات میں ہر شخص 'واجب الاتباع' ہے!!! آیت میں مذکور صحابہؓ کا پھر کیا اختصاص باقی رہ جاتا ہے؟!

ج) اگر یہ ضروری ہے کہ پہلے صحابہ کا استدلال ہی دیکھا جائے، تو فرض کیجئے آپ نے صحابہؓ کا استدلال معلوم کر لیا۔ اب یا اُس قول کے معاملہ میں صحابہ کی مخالفت جائز ہوگی یا ناجائز ہوگی۔ اگر آپ کہیں کہ ناجائز ہے تو یہی ہمارا بھی کہنا

ہے کہ صحابہ کے قول کی مخالفت جائز نہیں۔ اور اگر آپ کہیں کہ صحابہ کے قول کی مخالفت جائز ہے تو آپ نے خاص اُس حکم میں صحابہ کے قول کی مخالفت کی اور کہا کہ صحابہؓ کا استدلال درست ہوتا تب میں اُن کی اتباع کرتا۔ اور ظاہر ہے صحابہ کے استدلال کو صحیح یا غلط قرار دینے میں حتمی حیثیت آپ کے اپنے فہمِ دلیل کی ہوئی۔ اب جس شخص کی شرط یہ ہے کہ اُسکا اپنا استدلال صحابہ کے استدلال کے موافق نکل آئے تو تب جا کر ہی وہ صحابہ کے قول کو اختیار کرے گا اُس کو صحابہ کا متبع کیونکر کہا جائے جبکہ خاص اُس حکم میں اُس نے صحابہ کے قول کے مخالف جانا روا کر رکھا ہے؟

د) جس شخص نے صحابہ کے اختیار کردہ حکم کے معاملہ میں صحابہ کے خلاف جانا اپنے لئے روا ٹھہرا لیا ہے اُس کو صحابہ کا متبع کہنا لغو کی قسم میں آئے گا۔ جو شخص کسی مسئلہ میں ایک مجتہد کے اختیار کردہ قول کو جابجا رد کر دیتا اور اس کے خلاف جانا روا کر لیتا ہو اُس کے بارے میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اُس شخص نے اُس مجتہد کی پیروی کر رکھی ہے؟ اور اگر کسی وقت یہ کہا بھی جائے تو اُس کو مقید کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہوگا کہ وہ شخص اُس مجتہد کے اجتہاد یا استدلال کو وہاں اختیار کر لیتا ہے جہاں وہ اُس کے اپنے اجتہاد یا استدلال کے مطابق نکلے!

ھ) ''اتباع'' باب ''افتعال'' سے ہے۔ (یعنی آیت میں لفظ تَبِعَ نہیں بلکہ اتَّبَعَ ہے) ''اتباع'' میں کسی کے پیچھے چلنے اور اُس کا ضرورت مند ہونے کا ایک معنیٰ پایا جاتا ہے۔ جبکہ دو مجتہد اگر ایک سا استدلال کر رہے ہوں تو محض یہ دیکھ کر کہ اُن دونوں کا استدلال ایک سا ہے اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے کا ''متبع'' نہیں کہا جاتا، جب تک کہ ان میں سے ایک مجتہد دوسرے کے پیچھے چلنے اور اُس کی بات کی پابندی اختیار کرنے کا باقاعدہ ایک اعتقاد نہ رکھتا ہو۔ اگر اتفاقاً آپ کا بھی

وہی اجتہاد نکل آتا ہے جو ایک دوسرے شخص کا ہے یا آپ کا بھی وہی فتویٰ ہے جو ایک دوسرے شخص کا ہے، تو یہاں آپ کو اُس کا متبع نہیں کہا جائے گا۔

و: آیت کا مقصود سابقون الاولون کی ثنا کرنا ہے اور ان کی اِس سابقیت کے باعث ان کا یہ استحقاق بیان کرنا کہ بعد والوں کیلئے اب وہ ائمہ متبوعین ☆ قرار پائیں۔ البتہ اگر یہ معنیٰ لیا جائے کہ نہ تو ان کے اختیار کردہ قول کی موافقت ضروری ہے اور نہ اس کی مخالفت میں ہی کوئی شرعی مانع ہے بلکہ اتباع تو ہوگی دلیل اور قیاس واجتہاد وغیرہ ہی کی، تو ان کا یہ منصب نہ رہا کہ وہ ائمہ متبوعین ہیں۔ تب وہ اِس مدح اور ثناء کے مستحق نہیں رہتے کہ بعد والے ان کی اتباع کریں۔

ز) جہاں تک آیت میں آنے والے لفظ ''بإحسان'' کا تعلق ہے (۱) تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی خود اپنا ایک اجتہاد کرے، خواہ وہ اجتہاد صحابہ کے قول کے موافق پڑے یا مخالف۔ کیونکہ اگر اس کا اجتہاد صحابہؓ کے قول کے مخالف نکلتا ہے اور وہ اپنے اجتہاد ہی کو اختیار کرتا ہے تو وہ آیت میں مذکور لفظ ''اتبَعُوهُم بِإِحْسَان'' کے زمرے میں آنا تو درکنار ''اتَّبَعُوهُم'' ہی کے زمرے میں نہیں آتا۔ اپنا استدلال یا اجتہاد کر کے ایک قول کو اختیار کرنا اُس قول میں صحابہ کی اتباع کرنا کیسے ہوگیا؟ ''متبع صحابہ'' کا لفظ تو اسی شخص پر صادق آئے گا جو اعتقاد اور قول میں صحابہؓ ہی کی موافقت اختیار کرے۔ ہاں اِس کے ساتھ ساتھ، خدا کی خوشنودی (رَّضِيَ اللّٰهُ عَنهُمُ کا استحقاق پانے کیلئے) یہ بھی ضروری ہے کہ وہ محسن (بھلائی کرنے والا) ہو یعنی فرائض کا ادا کرنے والا اور محرمات سے اجتناب کرنے والا ہو تاکہ وہ اِس فریب میں نہ رہے کہ وہ قول کی حد تک عین اُسی راستے پر ہے جس پر صحابہ تھے

☆ متبوع یعنی جس کی پیروی کی جائے

(بلکہ ضروری ہے کہ عمل میں بھی وہ احسان کی راہ پر ہو)۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ صحابہ کی پیروی کرنے والا صحابہ کے بارے میں جو الفاظ بولے ان میں وہ محسن (بھلائی کرنے والا) ہو (یعنی صحابہ کیلئے خوب الفاظ استعمال کرے) اوران کی عیب جوئی نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو ضروری ٹھہرایا، اس لئے کہ اُس کو علم تھا کہ بعدازاں ایسے لوگ آئیں گے جو صحابہ پر (معاذ اللہ) لعن طعن کریں گے۔ صحابہ کے ساتھ احسان کا یہ مفہوم سورۂ حشر میں مذکور اُس ذکرِ خیر کے ساتھ جڑ جاتا ہے جو صحابہ کیلئے بعد والوں پر لازم قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں مہاجرین اور انصار کا ذکر کردینے کے بعد"**والذین جاؤوا من بعدھم**" کا ذکر آیا اوران کا وہ اخص الخاص وصف بیان ہوا کہ وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے پروردگار! بخش دے ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے پہلے ہوئے (**سبقونا بالایمان**: یہاں بھی اولین صحابہ کی سابقیت ہی کا ذکر ہوا ہے) اور نہ رہنے دے ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے خلاف کوئی کدورت"۔

دوسرا اشکال:

آیت میں صحابہؓ کی اتباع کا جو ذکر آتا ہے وہ اصولِ دین میں ہے نہ کہ فروع میں۔

ابن قیمؒ کا جواب:

آیت میں صحابہ کی مطلق اتباع کا ذکر ہوا ہے۔ نیز وہ شخص جو اصولِ دین ہی میں صحابہؓ کا متبع ہے اس کو اگر مطلق طور پر صحابہ کا متبع مان لیا جائے تو ہم پچھلی امتوں کے اہل ایمان کے بھی متبع قرار پائیں گے (کیونکہ اصولِ دین سب آسمانی امتوں میں ایک ہی رہے ہیں)۔ تب اِس امت کے سابقین اور دیگر اہل ایمان کے مابین

کوئی بڑا فرق نہ رہ جائے گا۔ جبکہ آیت میں صحابہ کی مطلق اتباع کا ذکر ہے۔ لہذا اِس اتباع کو مطلق ہی رکھا جائے گا جو اصول دین کو بھی شامل ہو گی اور فروعِ دین کو بھی۔ اگر صرف اصول میں صحابہ کی اتباع کی جائے گی تو گویا صحابہ کی مطلق امامت ہم نے تسلیم نہیں کی۔ حالانکہ صحابہ ہر معنیٰ میں ائمہ ہیں۔ اصول میں بھی وہی امام ہیں اور فروع میں بھی۔

تیسرا اشکال:

آیت میں جو چیز قابل ستائش ٹھہرائی گئی ہے وہ ہے اُن سب کی اتباع کرنا۔

ابن قیمؒ کا جواب:

ہم کہتے ہیں آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ شخص قابل ستائش ٹھہرایا جائے جو اُن میں سے ایک ایک کی اتباع کرتا ہے، اُسی طرح جس طرح آیت میں مذکور الفاظ **السَّابِقُونَ الْأَوَّلُون** اور **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم** میں سے ایک ایک کیلئے **رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُم** کی خوشخبری دیتے ہیں۔

پس جس طرح ''**السَّابِقُون**'' میں سے ایک ایک متبوع ٹھہرتا ہے ویسے ہی **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُم** میں سے ایک ایک تابع ٹھہرتا ہے۔ آیت کے الفاظ اُن پر مجتمع طور پر بھی لاگو ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک ایک☆ پر بھی[۲]۔ نیز آیت سب ''سابقون'' کیلئے عام ہے؛ جہاں یہ سب اکٹھے ہوں وہاں ان کے اکٹھوں کی پیروی ہو گی جہاں ان کا ایک ایک فرد پایا جائے بشرطِ امکان وہاں ان کے ایک ایک فرد کی پیروی ہو گی۔ پس یہ مجتمع ہوں تو ان کی پیروی ہو گی، افراد ہوں تو ان کی پیروی ہو گی

☆ ابن قیمؒ یہاں ایک قاعدہ بھی ذکر کرتے ہیں۔ کلام پیچیدہ ہو جانے کے پیش نظر وہ اِس فصل کے آخر میں بصورتِ حاشیہ دیا جا رہا ہے

بشرطیکہ ان کے اپنے میں سے ہی کسی دوسرے نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

نیز سابقون میں سے کئی ایک نبی ﷺ کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ لہٰذا اگر شرط یہ ہے کہ وہ سب کے سب اکٹھے ہوں تو تب جا کر آیت کی رو سے ان کی پیروی درست ہوگی تو یہ شرط پوری ہونا تو ویسے ہی محال ہے۔

☆☆☆☆☆[۳]

ابن قیم کے مزید دلائل

اِس کے بعد امام ابن قیمؒ صحابہ کی اتباع پر کچھ مزید دلائل اختصار کے ساتھ لاتے ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک کو مختصر تر صورت میں بیان کریں گے:

۲) صحابہ کو قرآن نے ''الَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْم'' ہونے کی باقاعدہ سند دی ہے۔ اور یہ سند ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے علاوہ کسی کو نہیں دی:

ابن قیمؒ کے بقول: صحابہ کیلئے ''الَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْم'' کے الفاظ سورۃ المجادلہ میں آئے ہیں:

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (المجادلۃ:۱۱)

''اللہ بلند کرے گا درجہ بدرجہ ان لوگوں کو جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا''

پھر یہی لفظ (صحابہؓ کیلئے) سورۃ محمد (آیت ۱۶) میں بولے گئے:

حَتَّى إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفاً

''یہاں تک کہ جب یہ (منافقین) تیرے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے جن کو علم دیا گیا ہے کہتے ہیں: ''اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟''

پس ایک طرف صحابہؓ ہیں جن کی بابت نصوصِ وحی خود شاہد ہیں کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو بالیقین شریعتِ خداوندی کا علم رکھتی ہیں۔ اور دوسری جانب بعد کی ہستیاں

ہیں جن کی بابت بذریعہ وحی ایسی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی کہ وہ شریعتِ خداوندی کا ٹھیک ٹھیک علم رکھتی ہیں۔

بلکہ سورہ محمد میں آپ دیکھیں تو ایک ہی مقام پر صحابہ کیلئے "لِلَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ" کے لفظ بھی بولے گئے یعنی "وہ لوگ جن کو علم دے دیا گیا"۔ پھر "وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا" کے لفظ بھی، یعنی "وہ لوگ جو ہدایت پا گئے"۔ پھر "زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ" کے لفظ بھی، یعنی "اللہ نے ان کو اور بھی ہدایت سے نوازا اور ان کو تقویٰ نصیب فرمایا"۔ بتائیے اِس امتیاز میں صحابہ کے ساتھ کون شریک ہوسکتا ہے؟

آیت کے الفاظ یوں ہیں:

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّى إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفاً أُولَئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (محمد:۱۶،۱۷)

اور ان (منافقین) میں بعض تیری طرف کان لگائے رکھتے ہیں حتی کہ جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جن کو علم دیا گیا ہے کہتے ہیں: "اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟" یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہ اپنے نفس کی اَھواء پر چلتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو ہدایت پا گئے ہیں اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا ہے اور انہیں تقویٰ نصیب فرما دیا ہے۔

۳) جن کو "ہدایت یافتہ" ہونے کی سند شارع نے خود دی ہے:

یہاں پر ابن قیمؒ چند قرآنی آیات لاتے ہیں:

الف) آل عمران (آیت ۱۰۳) میں خاص صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: وَكُنتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ''اور تھے تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر، تب اللہ نے تمہیں اُس سے بچایا۔ ایسے ہی اللہ تمہارے لئے آیات بیان کرتا ہے کہ تم ہدایت پاؤ''۔ یہاں پر اللہ نے صحابہ کو فرمایا (لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ)۔ جبکہ ہم جانتے ہیں جس واقعہ کیلئے لَعَلَّ کا لفظ اللہ رب العزت بولے وہ واجب اور یقینی ہوتا ہے؛ لہٰذا صحابہ بالیقین ہدایت یافتہ ہیں۔ باقیوں کی بابت ایسی کوئی یقین دہانی نہیں۔

ب) سورہ محمد (آیت ۴،۵) میں صحابہ کی بابت فرمایا: وَالَّذِيْنَ قُتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيْهِمْ ''جو مارے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں، اللہ ان کے اعمال کبھی اکارت نہ جانے دے گا۔ وہ ان کو راہ دکھائے گا''۔ یہاں سے بھی صحابہؓ کی وہ خصوصیت سامنے آتی ہے کہ راہِ راست ملا رہنے کی بابت صحابہؓ سے اللہ کا خاص وعدہ ہے۔

جـ) پھر سورہ عنکبوت (آیت ۶۹) میں اُن کو ہدایت ملی رہنے کی یقین دہانی کروائی: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ''جولوگ ہماری راہ میں جہاد کریں گے، ہم ضرور بضرور اُن کو اپنی راہیں دکھاتے چلے جائیں گے''

ان آیات کو نقل کرنے کے بعد امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں: صحابہؓ میں سے ہر شخص جس نے اللہ کے راستے میں قتال کیا اور جہاد کیا، خواہ وہ ہاتھ کے ساتھ ہو یا زبان کے ساتھ، ان آیات کی رو سے اللہ نے اس کو ہدایت یافتہ کر رکھا تھا۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ نے ہدایت یافتہ کر رکھا ہے وہ راہِ راست پر ہے۔ اور جو راہِ راست پر ہے اُس کا طریقہ اور منہج واجبِ اتباع ہے۔

۴) ''مهتدون'' کی اتباع کا حکم بھی فرمایا:

اتَّبِعُوا مَن لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ (یٰس:۲۱)

''پیروی کروان کی جو تم سے صلہ نہ مانگیں اور جو ہوں بھی راہِ راست پر''

ابن قیم کہتے ہیں: اللہ رب العزت نے یہ قاعدہ سورۂ یس میں مذکور اُس مردِ مومن کی زبان سے برسبیل رضا وتحسین ادا کروایا ہے کہ ان بے لوث لوگوں کی پیروی کی جائے جو ہم سے کسی صلہ کے خواستگار نہیں جبکہ وہ ہوں بھی ہدایت یافتہ۔ اب دنیا کے کسی شخص یا کسی گروہ کے بارے میں دعوی کے ساتھ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ ہدایت پا چکے سوائے صحابہ کے جن کے ایمان اور جن کے راہِ راست پر ہونے کی شہادت قرآن نے بھی دی ہے اور نبی ﷺ نے بھی۔

۵) وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرۃ:۱۴۳)

''اسی طرح ہم نے تمہیں سب سے چنیدہ گروہ بنایا تا کہ تم ہو جاؤ گواہ سب لوگوں پر اور رسولؐ ہو جائے گواہ تم لوگوں پر''۔

امام ابن قیمؒ کہتے ہیں: یہاں وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو سب سے برگزیدہ اور حق بات کرنے والا گروہ بنایا، یعنی امۃً وسطاً۔ اپنے اقول، افعال، اعمال، ارادات اور نیتوں میں صحابہ سب سے بڑھ کر عدل پر ہیں۔ لفظ ''وسط'' کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اپنی اِسی صفت کے بموجب صحابہ لوگوں پر اللہ کے گواہ ہیں۔ گواہ وہی قابل قبول ہوتا ہے جو علم کے ساتھ گواہی دے۔ صحابہؓ انسانیت پر اللہ کے شہداء ہیں تو وہ اپنی اِس صفت کے باعث کہ اللہ نے ان کو اپنے رسولؐ پر اتاری جانے والی حقیقت کا علم اور فہم دے دیا ہے اور اس پر قائم ہونے کی توفیق عطا فرمائی ہے، جس کے دم سے وہ انسانیت پر خدا کی شہادت قائم کریں گے۔ اِسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ صحابہ میں اختلاف بھی ہو تو حق ان سے خارج بہرحال نہیں ہوتا۔ انسانیت پر خدا کے پیغام کے گواہ ___ از روئے قرآن ___

صحابہ ہوں اور حق کسی اور کے ہاں پایا جائے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟؟؟

٦) سورۂ بقرہ کی اِسی آیت کے ساتھ امام ابن قیمؒ سورہ حج کی یہ آیت لے کر آتے ہیں:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ (الحج:٧٨)

''اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا اس کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے اور نہیں کیا تم پر دین کے اندر کوئی حرج۔ اپنے باپ ابراہیم کی ملت کو اختیار کرتے ہوئے۔ اُس نے تمہارا نام مسلم (فرماں بردار) رکھا ہے پہلے بھی اور اِس میں بھی۔ تا کہ رسول تم پر گواہ ہو جائے اور تم انسانوں پر گواہ ہو جاؤ''۔

آیت میں بیان ہونے والے کچھ مطالب کی توضیح کر دینے کے بعد ابن قیم فرماتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ صحابہ کو خبر دیتا ہے کہ اُس نے (ان کا یہ مقام اور ان کا یہ چناؤ) اس لئے کیا کہ رسولؐ ان پر شہادت قائم کر دے اور وہ انسانوں پر شہادت قائم کر دیں۔ پس ان کے حق میں یہ خاص شہادت اس وجہ سے ہے کہ رسولؐ نے ان پر شہادت قائم کر دی ہے جس کے باعث اب وہ اہل ہیں کہ جملہ انسانیت پر شہادت قائم کر دیں۔ مقصود یہ کہ صحابہ اللہ کے ہاں اگر اِس منزلت پر ہیں تو پھر یہ محال ہے کہ ایک مسئلہ میں اللہ ان کے سب کے سب کو قولِ صائب سے محروم رکھے، یعنی ان میں اگر کہیں اختلاف ہو گیا ہے تو ان کے دونوں کے دونوں فریق ایک غلطی پر مبنی فتویٰ ہی دے رہے ہوں، جبکہ ان کے بعد آنے والے اُس مسئلہ کے اندر ہدایت اور حق کی راہ کو پانے کا اعزاز حاصل کر دکھائیں!!! (خدا ایسی کج فہمی سے بچا کر رکھے)

۶) اسی سے متصل امام ابن قیمؒ سورہ آل عمران کی یہ آیت لے آتے ہیں:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰه (آل عمران:۱۱۰)

''تم وہ بہترین گروہ ہو جو انسانیت کیلئے برپا کیا گیا، کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

پھر فرماتے ہیں صحابہ کا ہر معروف کا حکم دینا اور ہر منکر سے روکنا از روئے قرآن ثابت ہے۔ پس اگر ایک واقعہ ان کے زمانے میں پیش آیا ہے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس مسئلہ میں معروف کی نشاندہی کرنے والا گروہ صحابہؓ کے مابین نہ پایا گیا ہو۔

۷) امام ابن قیمؒ مزید فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اصحابِ موسیٰؑ کا منصبِ امامت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُون

(السجدۃ:۲۴)

''اور ہم نے ٹھہرایا ان کو ائمہ، جو راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے، جب وہ صابر ہوئے، اور تھے وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھنے والے''۔

موسیٰ علیہ السلام کی متابعت میں اصحابِ موسیٰؑ کے صبر اور یقین کی کچھ وضاحت کرنے کے بعد امام ابن قیمؒ لکھتے ہیں: یہ تو معلوم ہی ہے کہ اصحابِ محمدؐ اس وصف میں اصحابِ موسیٰؑ کی نسبت کہیں بڑھ کر اور اولیٰ تر ہیں۔ اِن کا یقین بھی اُن سے بڑھ کر ہے اور اِن کا صبر بھی۔ بلکہ صبر و یقین میں صحابہ تاریخ انسانی کے کسی بھی گروہ سے بڑھ کر ہیں۔ پس صحابہ ائمہ ہیں۔ یہ چیز بلا شک وشبہ ثابت اور ظاہر و باہر ہے۔ پس یہ محال ہے کہ کسی مسئلہ میں جو بات حق ہے وہ صحابہ کے تو کسی ایک بھی

فریق کے ہاتھ نہ آئے البتہ بعد والوں کے ہاتھ میں وہ حق آ جائے! ایسا ہوتا تو معاملہ الٹ ہو جاتا، تب تو متاخرین کو'ائمہ' کہلانا چاہیے تھا اور پہلے والوں کو ان کے فتاویٰ اور ان کے اقوال کی جانب رجوع کا پابند ہونا چاہیے تھا، جو کہ عقلاً بھی محال ہے اور حسی طور پر بھی۔حق یہ ہے کہ عقل وحس سے پہلے یہ شرعاً محال ہے۔اور توفیق دینے والا اللہ ہے۔

۸) اسی کے ساتھ متصل یہ بات کہ صحابہؓ کی یہ مناجات اللہ تعالیٰ نے بر سبیل تحسین واقرار ذکر کی ہے:

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْیُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ إِمَاماً (الفرقان:۷۴)

''اور وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پرودگار! بخش دے ہمیں ہماری ازواج اور ہماری اولادوں سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک۔اور کر دے ہمیں متقیوں کیلئے امام''

ابن قیم لکھتے ہیں: قیامت تک کے متقیوں کیلئے صحابۂ کرامؓ امام ہیں۔جس کسی کو متقی بننا ہے اس کو چاہیے صحابہ کی امامت میں چلے اور صحابہ کی اقتدا اختیار کرے۔متقی بننا واجب ہے تو صحابہ کی امامت اور اقتدا اختیار کرنا بھی واجب ہے۔اور صحابہ کے اختیار کردہ قول واعتقاد کی مخالفت کرنا صحابہ کی اقتداء کے ساتھ معارض ہے۔

۹) پھر ابن قیمؒ خیر القرون قرنی ''سب سے بہتر میرا قرن ہے'' والی مشہور حدیث لاتے ہیں۔پھر اس کی کچھ توضیح کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اِسی حدیث کا تقاضا ہے کہ خیر کے ہر باب میں صحابہ کے قرن ہی کو مقدم مانا جائے اور اسی کو بنیاد بنا کر آگے بڑھا جائے۔اگر متصور کر لیا جائے کہ قولِ صواب صحابہ کے قرن میں تو کسی ایک بھی شخص یا ایک بھی فریق کے ہاتھ نہیں آ پایا البتہ بعد میں آنے والے

لوگوں کا اُس پر ہاتھ جا پڑا ہے تو اِس سے یہ لازم آئے گا کہ بعد والوں کا قرن اُس پہلو سے صحابہ کے قرن سے بہتر اور فضیلت میں بڑھ کر ہے۔ ظاہر ہے جس قرن میں قولِ صواب امت کے ہاتھ لگا وہ اُس قرن سے بہتر ہوگا جس میں امت خطا پر پائی گئی! جو شخص کسی ایک آدھ مسئلہ میں اِس اعتقاد کا روادار ہے اُس کو ہزاروں مسئلوں کی بابت بھی یہ اعتقاد رکھنے میں کوئی اصولی مانع نہیں رہ جاتا؛ یعنی بے شمار مسائل میں اِس شخص کا قول صحابہؓ کے قول سے بہتر ہوسکتا ہے! اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ اصل برگزیدگی علم وفضل کی برگزیدگی ہے جو کہ اِس شخص کے خیال میں صحابہ کے دور کی نسبت اِس کے اپنے دور میں پائی جانے لگی ہے! کیا محرومی سی محرومی ہے؛ صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، سلمان فارسیؓ، عبادہ ابن الصامتؓ اور انہی جیسے بے حد وحساب ائمۂ علم تو کہہ رہے ہوں کہ ایک مسئلہ میں خدا کے نازل کردہ حکم کا منشا یوں ہے مگر یہ شخص سمجھے کہ نہیں حق ان سبھی کے ہاتھ نہیں آسکا ہے، بلکہ حق وہی ہے جو کچھ بعد والوں پر منکشف ہوگیا ہے بلکہ جو خود اُس پر منکشف ہوگیا ہے! سبحانک ھٰذا بہتان عظیم۔

۱۰) امام ابن قیمؒ مزید لکھتے ہیں: استدلال اور استنباط اور ترجیح ادلہ کس قدر نازک مبحث ہے، اس کا اندازہ اُسی شخص کو ہوسکتا ہے جس کو علم سے کچھ مس ہے۔ یہاں پر اگر اصحابِ رسول اللہ کے اقوال اور فتاویٰ مل جائیں تو اِس سے بڑھ کر کوئی مدد نہ ہوگی جو قولِ صواب اختیار کرنے میں ایک مجتہد کی رہنما ہو سکے۔ اللہ کے اُن سے راضی ہونے کی سند ہمیں واضح طور پر حاصل ہے۔ امت کے سردار وہ ہیں۔ علم کے امام اور پیشوا وہ ہیں۔ ''تنزیل'' اور ''سنت'' کے سب سے بڑے عالم وہ ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جو تیئیس سال تک تنزیل خداوندی کا مشاہدہ کرتی اور اس کی تاویل

اور تفسیر ہوتی ہوئی خود اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی ہیں۔ جو شخص بھی علمِ حقیقی سے کچھ حظ رکھتا ہے وہ اپنی رائے اور قیاس کو ان کے علمی ذخیروں کے آگے کوئی چیز جاننے سے بے حد اجتناب کرتا ہوا نظر آئے گا۔ ایک حقیقی عالم کو جو تسلی صحابہ کا قول مل جانے پر ہوتی ہے اُس کا ادراک کر لینا بھی اُس کے سوا کسی کے بس میں نہ ہو گا۔

۱۱) مزید یہ کہ صحابہ کے اپنے فہم و ذکاء، اور حق کو پانے اور سمجھنے کی بابت ان کی اپنی حرص کے علاوہ یہ بات بھی واضح رہے کہ کچھ اشیاء خاص صحابہ ہی کے حق میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بات جو ہمیں صحابی سے مل رہی ہے بے حد امکان ہے کہ وہ بات اُس نے رسول اللہ ﷺ سے سن رکھی ہو۔ یا پھر کسی دیگر صحابی سے سنی ہو جس نے وہ بات نبی ﷺ سے سنی ہو، جبکہ صحابہؓ سب کے سب عدول ہیں۔

ابن قیم اِس مبحث کو بھی بہت کھول کر بیان کرتے ہیں کہ:

ضروری نہیں ہر صحابی نے جتنا کچھ رسول اللہ ﷺ سے سن رکھا تھا وہ سب کا سب باقاعدہ روایت کی صورت میں ہی اُس نے بیان کیا ہو (صحابی کی بہت سی باتیں جو وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کے انداز میں ہم سے بیان نہیں کر رہا، وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ہی سنی ہوئی ہو سکتی ہیں)۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر کبار صحابہؓ سے بڑھ کر کس نے کی ہو گی؟ لیکن اِن بڑے بڑے صحابہ سے کوئی بہت زیادہ احادیث مروی نہیں۔

ایسا تو بہر حال نہیں کہ جتنی باتیں ان کبار صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ روایت کے انداز میں ہمیں بیان کر کے دیں انہوں نے بس اُتنی ہی باتیں رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوں۔

ذرا اِسی بات پر غور کر لیجئے: اِس امت کے صدیق (ابو بکر رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر بھلا کس نے نبی ﷺ کے ساتھ وقت گزارا ہو گا؟ جبکہ ابو بکرؓ کی روایت کردہ احادیث کی

تعداد سو کو بھی نہیں پہنچتی! یہ امت کا وہ صحابی ہے جس نے بعثت کے وقت سے نبی ﷺ کا دامن تھاما اور وفات تک نہ چھوڑا، ہر ہر وقت اور ہر ہر مرحلہ پر آپ ؐ کے ساتھ رہا۔ بلکہ یہ آپ ؐ کا وہ ساتھی ہے جو بعثت سے پہلے بھی آپ کے ساتھ ہوتا تھا! نبی ﷺ کے شب و روز کا حتی کہ آپ کے مزاج اور احوال کا ابوبکرؓ سے بڑھ کر کون علم رکھ سکتا ہے؟ علم کا ذخیرہ ابوبکرؓ سے بڑھ کر بھلا کس کے پاس پایا جا سکتا ہے؟ پھر بھی آپ دیکھتے ہیں چند احادیث ہی اِس صحابی سے ہمیں باقاعدہ ''روایت'' کی صورت میں ملتی ہیں۔

حضراتِ ابوبکرؓ و عمرؓ اگر وہ سب کچھ باقاعدہ روایت کی صورت میں ہمیں بیان کر کے دیتے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور دیکھا اور سمجھا اور پایا تو ان کے روایت کردہ ذخیرے ابوہریرہؓ و دیگر راوی صحابہؓ کے ذخیروں سے کہیں بڑھ جاتے[٤]۔ ایسا ہی معاملہ دیگر کبار علمائے صحابہؓ کا ہے۔ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ صحابیؓ کے پاس اِس مسئلہ میں اگر رسول اللہ ﷺ سے سنی یا جانی ہوئی کوئی چیز ہوتی تو صحابی کو لازماً چاہیے تھا کہ وہ 'روایت' کی صورت میں ہی ہمیں بیان کر کے دیتا.. یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو صحابہ کی سیرت اور اطوار سے واقف ہی نہیں۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ روایت کرنے کی ایک خاص ہیبت اپنے دلوں پر محسوس کیا کرتے تھے اور اس کو ایک بے حد بڑی اور عظیم چیز جانتے۔ ان کو نہایت خوف ہوتا کہ کوئی ایک لفظ بھی ان کے اپنے پاس سے زیادہ یا کم نہ ہو جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ ایک چیز جو انہوں نے متعدد مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے سن رکھی ہوتی اس کو بیان کرتے، لیکن یہ صراحت کرتے ہوئے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا پھر بھی ایک خوف محسوس کرتے۔ یعنی وہ رسول اللہ ﷺ ہی سے سنی ہوئی ایک بات کرتے اور یہ کہنے سے بسا اوقات احتراز کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ اور یہ لفظ کہے ہیں۔

۱۲) اپنے اِس بیان میں امام صاحب جندب بن عبداللہؓ سے متعلق ایک واقعہ بھی نقل کرتے ہیں: خوارج کا ایک ٹولہ صحابیِ رسولؐ جندب بن عبداللہؓ کے ہاں وارد ہوا اور ان سے کہنے لگا: ''ہم تمہیں کتاب اللہ کی طرف بلاتے ہیں''۔

جندب بن عبداللہؓ بولے: تم؟؟؟

خوارج کہنے لگے: ہاں ہم!

جندبؓ پھر بولے: تم؟؟؟

خوارج کہنے لگے: ہاں ہم!

جندبؓ فرمانے لگے......: اے خدا کی خبیث ترین مخلوقات! کیا ہماری اتباع میں تمہیں گمراہی نظر آنے لگی ہے اور ہمارے طریقے کو چھوڑ کر کہیں تمہیں ہدایت دکھائی دینے لگی ہے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

خوارج کا یہ واقعہ ذکر کر دینے کے بعد امام صاحب لکھتے ہیں:

ظاہر ہے جو شخص اس بات کا قائل ہے کہ صحابہؓ اپنے فتاوی میں غلط جبکہ بعد والے ان کی نسبت حق کو پانے والے ہو سکتے ہیں (اور ظاہر ہے حق کی پیروی تو صحابہؓ پر بھی ضروری ہے!)، یوں وہ شخص صحابہ کے اقوال کے خلاف جانے کو اپنے لئے روا جانتا ہے تو بلا شبہ اُس کو (خوارج کی طرح) صحابہ کے طریقے کو چھوڑ کر کہیں پر ہدایت دکھائی دیتی ہے اور اپنے تئیں وہ صحابہ کو کتاب اللہ کی طرف بلانے یا صحابہ کو کتاب اللہ سمجھانے کا برتہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ شخص صحابہؓ کو قرآن پڑھا سکتا ہے! آدمی کے جاہل ہونے کیلئے یہی ایک بات کافی ہے۔

استفادہ از: اعلام الموقعین جلد ۴، فصول:

فصل: الأدلة علی أن اتباع الصحابة واجب، فصل: اتباع الصحابة مجتمعین ومنفردین، فصل: اتباع أقوال الصحابة، فصل: أدلة أخریٰ علی وجوب اتباع الصحابة)

حواشی

حاشیہ ۱:

کچھ لوگوں کو کیا سوجھی کہ آیت میں مذکور لفظ ''بـإحسـانٍ'' کی یہ تفسیر کرنا شروع کر دی کہ اس سے مراد ہے استدلال و اِحصائے ادلہ! یعنی آپ صحابہ کے قول کو تو رکھ دیں ایک طرف اور دیکھیں یہ کہ اس کے حق میں شریعت سے کوئی دلیل ہے یا نہیں۔ صحابہؓ کی دلیل آپ کو سمجھ آ جائے اور آپ کا دل اس پر ٹھک جائے تو اس کو قبول کر لیں ورنہ اُس کو رد کر دیں! اس کا جواب ابن قیمؒ دے چکے۔ یہاں ہم نے مناسب جانا کہ آیت میں مذکور لفظ ''بـاحسـان'' کے تحت اردو مترجمین قرآن کے کچھ حوالے بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں:

شاہ رفیع الدین: ''ساتھ نیکی کے''

وحید الزمان: ''نیکی کے ساتھ''

جونا گڑھی: اخلاص کے ساتھ

تھانوی: اخلاص کے ساتھ

حاشیہ ۲:

ابن قیم: قاعدہ یہ ہے کہ جو احکام اسمائے عامہ کے ساتھ معلق ٹھہرائے جائیں وہ اُن اسماء کے تحت آنے والے ہر ہر فرد کے حق میں ثابت ہوتے ہیں۔ أقیموا الصلوۃ کہیں گے تو اُس میں ایک ایک نماز آئے گی۔ لقد رضی اللہ عن المؤمنین کہیں گے تو شجرۂ رضوان کے نیچے بیعت کرنے والا ایک ایک مومن اِس کا مصداق ہوگا۔ کونوا مع الصادقین سے مراد یہ نہیں ہوگی کہ جب تک تم ان سب صادقین کو اکٹھا ایک جگہ نہ دیکھو تب

تک ان کی معیت اختیار کرنا تم پر لازم نہ ہوگا! ہاں البتہ وہ احکام جو ایک مجموع کے ساتھ معلق ٹھہرائے جاتے ہیں اُن کیلئے وہ الفاظ لائے جاتے ہیں جو اُس کو ایک مجموع کے طور پر ہی لیں؛ وہاں ایک ایک فرد کا وہ حکم نہ ہوگا جو کہ اُس مجموعہ کا بطورِ مجموعہ۔ مثلاً **وکذلک جعلناکم امة وسطا** ۔ اسی طرح **کنتم خیر امة أخرجت للناس** ۔ اسی طرح **ویتبع غیر سبیل المؤمنین** ۔ ہاں یہاں البتہ لفظ ''**أمة**'' اور لفظ ''**سبیل المؤمنین**'' کو ان میں شامل افراد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا یعنی **وکذلک جعلناکم امة وسطا** اور **کنتم خیر امة أخرجت للناس** میں جو حکم ''امت'' کا ہے وہی حکم امت کے ایک ایک فرد کا نہ ہوگا۔ اسی طرح یہ بھی درست نہ ہوگا کہ ''**ویتبع غیر سبیل المؤمنین**'' میں جو حکم مومنین کا (بطورِ مجموع) ہو وہی حکم ایک مومن کا ہو۔ برخلاف لفظ ''**السَّابِقُون**'' کے، جو کہ ''**السَّابِقُون**'' میں آنے والے ایک ایک فرد پر صادق آئے گا۔

حاشیہ ۳:

یہاں ابن قیم اِس سوال کا بھی جواب دیتے ہیں کہ:

سابقون وہ ہیں جو دونوں قبلوں کی جانب نماز پڑھ چکے ہیں، یا یہ کہ جو اہل بیعت رضوان ہیں اور اُن سے بھی پہلے کے لوگ۔ البتہ جو اس کے بعد اسلام لائے ہیں اُن کی اتباع پر کیا دلیل ہے؟

ابن قیم کا جواب: اگر یہ چیز مان لی جاتی ہے کہ بیعت رضوان تک ایمان لانے والے اصحابِ رسول اللہؐ کی اتباع واجب ہے، تو ایک بہت بڑا مقصود پورا ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہ بات اپنی جگہ کہ اہل علم میں سے ان میں فرق کسی نے بھی نہیں کیا۔

سب کے سب صحابہؓ ہی اپنے سے بعد والوں کی نسبت سابقون ہیں۔

ابن قیم کا جواب ختم ہوا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۃ توبہ کی یہ آیات غزوہ تبوک کے اختتام پر نازل ہوئی ہیں؛ یعنی دورِ نبوت کے اختتام کے بالکل قریب جا کر۔ یہاں پر اُن اصحابؓ کا یہ درجہ کہ جو ایمان میں پہل کر چکے ہیں بعد والے جیسے جیسے آتے آ جائیں ان پہلے والوں کی پیروی کرتے جائیں، نہایت اہم بات ہے۔ بلکہ اس میں باقاعدہ ایک منہج بیان ہو گیا ہے کہ اس جماعت میں بعد والے پہلے والوں کے پیچھے ہی صف بناتے رہے ہیں اور زمانۂ آخر تک ایسا ہی رہے گا۔

حاشیہ ٤:

اِس نقطے پر مزید غور کرنے کیلئے:

ابو بکر صدیقؓ، رسول اللہ ﷺ کی وفات سے لے کر اپنی وفات تک روزانہ اگر اللہ کے رسول کی ایک بات بھی بیان کرتے تو کوئی پون ہزار احادیث تنہا حضرت ابو بکرؓ سے ہی مروی ہوتیں۔ حضرت عمرؓ روزانہ اللہ کے نبی کی ایک بات بتاتے تو کئی ہزار مرویاتِ عمرؓ ہمارے پاس ہوتیں۔ لامحالہ ''نقل سنت'' کی ایک اور بھی صورت ہے جو ایک عمل اور تواتر اور احوال وتربیت وآثار وغیرہ کی صورت میں کبار صحابہ سے صغار صحابہ اور پھر آگے تابعین کو منتقل ہوئی ہے۔ صحابہؓ جب بھی کسی چیز کو جزم کے ساتھ بطورِ دین پیش کریں اور ان کے مابین اس پر کوئی اختلاف نہ ہو تو وہ ''علم'' ہی کی ایک صورت ہے، جیسا کہ پچھلی فصل میں شافعیؒ ومحمدؒ ودیگر ائمہ علم سے نقل ہوا ہے۔

16

منہجِ سلف
قرونِ ثلاثہ کے بعد

اَتباعِ تابعین کا دور گزرتے ہی عالم اسلام کے مرکزی خطوں میں ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھنے میں آیا۔ یہ اندھیرا تیسری صدی کے وسط سے اٹھنا شروع ہوا اور چوتھی صدی کے نصف کو پہنچتے پہنچتے __ یعنی ایک صدی کے دوران ہی __ تقریباً پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ یہ بنیادی طور پر ایک باطنی و رافضی انقلاب تھا۔ چوتھی صدی کے نصف کے آس پاس پر ذرا ایک نگاہ ڈالئے اور دیکھئے عالم اسلام کی حالت کیا تھی:

۱) جزیرۂ عرب کے بیشتر خطوں میں بحرین کے قرامطہ (۲۸۳ - ۳۷۸ ھ) کا دورِ اقتدار جو کہ رافضی باطنیت کا بدترین نمونہ تھے اور جو کہ کعبہ سے حجر اسود تک اکھاڑ لے گئے تھے اور حجاجِ اہلسنت کا قتل عام کرتے تھے۔

۲) مراکش سے لے کر مصر تک کے طویل وعریض خطہ پر اور بعدازاں شام کے بعض علاقوں تک فاطمی (دراصل عبیدی) خلافت (۳۲۲ - ۵۸۳ ھ) جو کہ باطنی رافضیت کی ایک خبیث شکل تھی اور جس کی ایک فرع آج کے اسماعیلی اور بوہری ہیں۔ اسی 'فاطمی خلافت' کا اقتدار بعدازاں پانچویں صدی میں صلیحیوں کے ہاتھوں یمن تک میں قائم ہوا بلکہ کوئی ایک سال بھر کیلئے بغداد کے اندر بھی قائم رہا اور ایک

معجزانہ طور پر بغداد کی برائے نام سنی خلافت اس کے ہاتھوں مکمل طور پر ختم ہو جانے سے بچ پائی۔

۳) عراق سے لے کر فارس، اصفہان، طبرستان اور جرجان تک بویہی اقتدار (۳۲۳ - ۴۴۷ ھ) جو رافضی عقائد کا پورے دھڑلے کے ساتھ پرچار کرتا تھا اور جس نے کہ دارِ خلافت بغداد پر قابض ہو کر مساجد کے دروازوں پر صحابہؓ کو گالیاں لکھ رکھی تھیں۔

۴) شمالی عراق اور جنوبِ شام پر بنوحمدان کا اقتدار (۳۳۰ - ۴۰۴ ھ) جو ان سب میں بہتر تھے اور جو کہ ان سب میں وہ تنہا ریاست تھی جو عرصہ تک روم کے ساتھ برسرِ قتال بھی رہی۔ گو یہ رافضی نہ تھی مگر تشیع کا میلان رکھتی تھی۔ تشیع تو گویا وقت کا فیشن تھا!

۵) ملتان جو کہ سندھ کے مسلم مفتوحہ خطوں کا پایہ تخت تھا، میں اسماعیلیوں کی سلطنت (۳۴۷ - ۴۰۱ ھ) اور جس نے ملتان کی مساجد میں مصر کے فاطمی خلیفہ المعز لدین اللہ معد بن اسماعیل (۳۴۱ - ۳۶۵ ھ) کا باقاعدہ خطبہ جاری کرایا تھا، اور جو کہ چوتھی صدی ہجری کے اختتام پر محمود غزنویؒ کے ہاتھوں نیست و نابود ہوئی۔

پورے عالم اسلام میں صرف دو خطے بچتے تھے جو رافضی یا شیعی اقتدار کے زیر تسلط آنے سے محفوظ رہے: ایک طرف عالم اسلام کے آخری مشرقی کونے میں ماوراء النہر کی سامانی ریاست اور دوسری جانب آخری مغربی کونے پر اندلس کی اموی امارت جو کہ خود بھی حالات کے ہاتھوں ہچکولے کھا رہی تھی بلکہ فاطمیوں کے توسیع پسندانہ عزائم اور جارحانہ حملوں سے بڑی مشکل کے ساتھ اپنا دفاع کر رہی تھی۔

اس لحاظ سے چوتھی صدی ہجری ہمیں رافضی اور باطنی ظلمت کی صدی نظر آتی ہے۔ اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر صلیبی شام اور فلسطین کے ساحل پر آ بیٹھے اور بالآخر بیت المقدس پر بھی قابض ہوئے۔ جبکہ اسی صدی کے اواخر میں جا کر ہم دیکھتے ہیں کہ اہلسنت ایک نئی کروٹ لیتے ہیں اور پانچویں صدی میں ایک نئے سرے سے سنت اور توحید کا غلغلہ ہونے لگتا ہے۔

یوں پانچویں اور پھر چھٹی صدی ہمیں رافضیت کے خلاف اہلسنت کی فتح کی صدی نظر آتی ہے، گو اس بار اِس میں بہت کچھ 'دخن'[۱] بھی تھا۔ سیاسی اسٹیج پر اس عمل کا آغاز چوتھی صدی کے اواخر میں غزنوی فتوحات (۳۹۰ - ۴۲۱ ھ) سے ہوا جن کی تگ وتاز بغداد سے لے کر ماوراء النہر اور بلاد ہند تک تھی اور جس کے دوران ــــ جیسا کہ امام ابن کثیرؒ البدایہ[۲] والنہایۃ میں بیان کرتے ہیں ــــ اہل بدعت پر زمین تنگ ہو گئی تھی۔ پھر پانچویں صدی کے ربع دوئم میں سلجوقیوں کی دولت (۴۲۹ - ۷۰۰ ھ) قائم ہوئی جو کہ سنت اور شرع کے خادم تھے اور جن کا اقتدار ماوراء النہر سے خراسان تک اور پھر رافضی بویہیوں کا اقتدار ختم کر دینے کے بعد عراق اور جنوب شام تک جا پہنچا۔ حتی کہ سلجوقیوں نے روم سے جہاد کا ازسرنو آغاز کیا اور ایشیائے کوچک میں عرصہ بعد نئے خطے فتح ہوئے۔ پھر زنگی دولت نے (۵۲۱ - ۵۷۶ ھ) چھٹی صدی ہجری کے ربع دوئم میں شام کو اہلسنت کا قلعہ بنا دیا۔ جس کے بعد ایوبی دولت (۵۶۷ - ۶۴۸ ھ) نے مصر سے فاطمی خلافت کا شجرۂ خبیثہ ہی اکھاڑ ڈالا اور بہ کمال قدرت شام اور مصر کو سنت کے پرچم تلے جمع کیا اور بنی عباس

(۱) یعنی دھواں اور آلودگی۔ مراد یہ کہ مجموعی طور پر معاملہ اہلسنت راہ پر تھا مگر بدعت کا ایک گونہ خلط تھا۔

(۲) البدایہ والنہایہ: جلد:۱۱ صفحہ:۲۲۲۔۲۲۷

کی سنی خلافت کا خطبہ بحال کرایا۔ تب اِس سُنی وحدت کے نتیجہ میں چھٹی صدی کے نصف دوئم میں بیت المقدس اہل اسلام کو واپس ملا۔

نورالدین محمود زنکی اور صلاح الدین یوسف ایوبی وغیرہ کا امام ابن تیمیہ اپنی کتب میں ''ملوک السنۃ'' کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔

(دیکھئے فتاوی ابن تیمیہ ج ۱۷ص ۵، ج ۲۷ص ۴۹، ج ۳۳ص ۲۸۰)

☆☆☆☆☆

اَتباع تابعین کا زمانہ گزر جانے کے بعد، کہ جب معاشروں پر سنت کی وہ فرماں روائی قائم نہ رہی تھی، اور نتیجتاً منہجِ سنت تک رسائی اُتنی آسان نہ رہی تھی جتنی کہ قرونِ ثلاثہ خیرہ میں، تو اس معاملہ کی اب ایک اور جہت بنی......

راہِ سلف کے ترجمان طبقے معاشرے میں اب وہ حیثیت نہ رکھتے تھے جو کہ گزشتہ ادوار میں ان کو حاصل رہی تھی۔ معاشرہ اب ان سے اس طرح رہنمائی نہ لے رہا تھا اور نہ لے سکتا تھا جس طرح کہ اس سے پہلے۔ وقت کے علمی، فکری اور معاشرتی رجحانات پر اب یہ اس طرح چھائے ہوئے نہ تھے اور نہ ہی فکری اور تہذیبی حالات پر ان کی وہ گرفت رہی تھی۔ باطنی اور رافضی اور معتزلی غلبہ کے پیش نظر اہل سنت اب اُس پہلے والے انداز میں معاشروں کی قیادت کر ہی نہ کر سکتے تھے۔

پس اب ایک بڑے خلا کا پیدا ہونا یقینی تھا۔

خالص علم کی پسپائی، علماء کا ایک بڑی تعداد میں اٹھ جانا، علمی حلقوں کی رونقیں بڑی حد تک قصۂ پارینہ بن جانا، اور زنادقہ و اہل بدعت کا راج ...... اب یہ وہ دور تھا جس میں سنت اور بدعت خلط ہونے لگے۔ جبکہ اس سے پہلے اس بات کی گنجائش

(۱) بعض کیلئے یہ ایک 'عصبیت' کی شکل بھی اختیار کر گیا، جس کے مظاہر آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔

نہ تھی۔ رفتہ رفتہ 'اہلسنت' ایک نام بن کر رہ گیا جبکہ اس سے پہلے یہ ایک حقیقت تھی نہ کہ محض ایک نام۔ بہت سوں کیلئے اب یہ ایک نسلی تسلسل تھا اور کچھ لگے بندھے کام کر لینے اور کچھ ظاہری علامات اختیار کر لینے کا نام۔[1]

حتی کہ وہ لوگ جن کیلئے یہ ایک نام نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی، ان میں سے بھی بہت سے ایسے تھے جن کیلئے یہ حقیقت اب دن بدن 'جزوی' ہوتی جا رہی تھی۔ اہلسنت کے بعض اصول سے ان کا شدید تمسک تھا تو بعض اصول پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ فکر و فہم کے جن جن خطوں پر سنت کی پسپائی ہو رہی تھی وہی وہی خطے بدعت کے زیرِ آب آ رہے تھے۔ یہی وہ بات ہے جس کو ہم نے سنت اور بدعت کا خلط[1] کہا ہے۔ سو ایک کثیر تعداد اب ایسے لوگوں کی ہونے لگی، بلکہ باقاعدہ ایسے طبقے وجود میں آئے، جو جزوی طور پہ سنت افکار پر تھے اور جزوی طور پہ بدعت افکار پر۔[2] جبکہ شمار بدستور یہ سب لوگ اہلسنت ہی ہوتے رہے۔

چنانچہ اب یہ دیکھنا لازم ہو گیا تھا کہ: کوئی شخص یا طبقہ اہلسنت ہے تو اسکے ہاں منہجِ سنت وسلف اپنی حقیقت کے اعتبار سے کس قدر ہے۔ یعنی معاملہ 'فیصدی' کا ہو گیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کے بارے میں یہ بات صادق آنے لگی تھی۔

سنت اور بدعت کے خلط کا یہ وہ دور ہے جس میں کئی ایک اہلسنت طبقوں میں نئے رجحانات نے جنم لیا اور یہ رجحانات آگے چل کر خود بھی کسی چھوٹی یا بڑی بدعت

---

(۱) اہلسنت کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک ہی شخص میں سنت اور بدعت دونوں وصف مجتمع ہوں اور وہ اپنی سنت کے بقدر قابلِ ستائش ہو اور اپنی بدعت کے بقدر قابلِ گرفت یا ___ خاص حالات میں ___ قابلِ عذر (دیکھئے فتاوی ابن تیمیہ ج ۲۸، ص ۲۰۹)

(۲) اس تاریخی اور واقعاتی مسئلہ کو وضاحت سے پڑھنے کیلئے دیکھئے: مجموع فتاوی ابن تیمیہ (ج:۳۰، ص ۳۴۸)

کی صورت دھار گئے۔ تب سے اب تک، اہلسنت کے کئی ایک طبقوں کی ان مبتدعہ رجحانات سے جان نہیں چھوٹی۔ صوفیت کے بہت سے سلسلے، عقائد میں اشاعرہ اور ماتریدیہ وغیرہ کا پھیل جانا اور وقت کا ایک فیشن بن جانا سب اسی دور کی یادگار ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ بدعت کے بعض پہلوؤں کا سدباب کر رہے تھے مگر دوسری جانب منہج سلف کے بعض پہلوؤں سے خود بھی بیگانہ ہو رہے تھے۔(۲) پس یہ ایک ملی جلی صورت حال تھی۔ جبکہ وہ لوگ جو معاملہ کو زیادہ سے زیادہ خالص کرنے پر زور لگا رہے تھے، ایک نہایت خاص طبقہ تھا۔

☆☆☆☆☆

مذہبی تعصب بھی اسی دور کی یادگار ہے۔

مذاہبِ اربعہ ودیگر فقہی مذاہب درحقیقت اہلسنت کے معتبر فقہی مذاہب ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا اہلسنت ہی کا فقہی تسلسل بن کر رہنا ہے۔ ''اصول دِین'' کے اندر ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی اختلاف ہے تو فروع کے اندر، جس کی سلف کے ہاں گنجائش رہی ہے۔ چنانچہ فروع کے اندر فقہی مذاہب کا یہ تنوع، دورِ سلف کا ہی ایک تسلسل تھا۔ ان فقہی مذاہب کے اپنائے جانے میں ___ جب تک کہ معاملہ اندھی تقلید اور ضد بازی تک نہ پہنچے ___ کوئی بھی حرج کی بات نہ تھی۔ امام طحاوی (۲۳۹ھ ......۳۲۲ھ) ایسے ائمہ سنت اور ترجمانِ عقیدۂ سلف کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فروع میں خود حنفی مذہب رکھتے ہیں البتہ ''اصولِ دین'' میں وہ پوری اُمت کو سلف کے اس منہج پر لاتے ہیں جس کی اِتباع حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اہل الحدیث، اہل الظاہر وغیرہ سمیت سب پر یکساں لازم ہے۔ یہی طریقہ اصولِ اہلسنت کی تعلیم دینے والے سب ائمہ کا رہا

اور صدیوں چلتا رہا۔ فروع کو میدانِ کارزار کسی نے بھی نہ بنایا۔ لوگوں کے فقہی مذاہب چھڑوانے یا بدلوانے کی تحریک کبھی نہیں چلائی گئی۔ صرف تعصب اور تقدیسِ رجال سے ممانعت کی گئی۔ یہی طریقہ ہمیں آجری (م ۳۶۰ھ) ابن بطہ (م ۳۸۷ھ) ابن مندہ (م ۳۹۵ھ) اور لالکائی (م ۴۱۸ھ) وغیرہ کا دکھائی دیتا ہے جو کہ اپنے دور کے ائمہ سنت تھے اور اصولِ سلف کے بہترین ترجمان۔ یہاں تک کہ آج بھی ''اصولِ اہلسنت'' کیلئے انہی کے مؤلفات سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پھر یہی اسلوب ہمیں بعد ازاں ابن تیمیہ، ابن قیم، نووی، ذھبی اور ابن حجر وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے دور میں سنت کے امام تھے۔ فروع کے اندر بحث وتحقیق میں بھی گو انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی مگر 'شافعی، مالکی' یا 'حنفی، اہلحدیث' والی جنگ بھی کبھی نہیں کروائی۔ البتہ اصولِ دین میں نزاع اور افتراق کی سرکوبی کی اور اس پہلو سے اُمت کو ''پہلے والی راہ'' پر لے آنے اور قائم رکھنے کیلئے سرگرم رہے۔ اُمت کی تالیف اور شیرازہ بندی کی ان کے ہاں یہی اساس تھی۔

چنانچہ فروع کے اندر فقہی مذاہب کا تنوع پایا جانا حرج کی بات تھی اور نہ اب ہے۔ مگر چوتھی صدی ہجری میں جو فرق آیا وہ مذہبی تعصب کی بدعت تھی۔ اس کے باعث فروع ہی لوگوں کیلئے اصول بن گئے۔ اب لازماً یہ ہونا تھا کہ اصول سرے سے ہی ان کی نگاہ سے روپوش ہو جائیں۔ سو سب معرکے اب اسی میدان میں سر ہونے لگے! یہاں تک کہ فقہی مذاہب بہت سوں کیلئے قریب قریب 'ادیان' کی شکل اختیار کر گئے!

☆☆☆☆☆

بہرحال اسلام کی پہلی تین نسلیں گزر جانے کے بعد معاً جو دور آیا اور حالات نے جس انداز سے پلٹا کھایا (سیاسی پلٹا تو صحابہ کے دورِ آخر میں ہی آ گیا تھا مگر ہم ایک فکری اور نظریاتی پلٹے کی بات کر رہے ہیں) اس کے بعد اہلسنت سے منسوب کئی ایک طبقوں میں کچھ مبنی بر بدعت رجحانات در آنے لگے۔ نتیجتاً یہ بھی فکر وعمل کی کچھ ایسی جہتوں سے مانوس ہوتے چلے گئے کہ اہلسنت فلک میں گردش کرنے والی ایک کثیر تعداد آج تک ان رجحانات کے زیر اثر ہے۔ خصوصاً برصغیر۔ ان تمام تر صدیوں میں اصلاح کی کوششیں بھی گو کم نہ رہیں پھر بھی اہلسنت کا داخلی میدان مکمل طور پر صاف نہ ہو سکا۔ تا آنکہ زوال کی یہ آخری صدیاں آئیں اور بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ یوں اصلاح اور تبدیلی اور دِین کو خالص کرنے کا عمل اور بھی بہت پیچھے چلا گیا۔

تیسری صدی ہجری کے بعد سے لے کر یوں بھی ائمۂ اہلسنت پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا جو شدید طور پر ہنگامی دور نہ ہو۔

بہرحال اہلسنت کی یہ پسپائی جو دورِ سلف کے متصل بعد آئی (مابین تیسری صدی کا وسط تا چوتھی صدی کا وسط) ...... یہ ایک ایسا دھچکہ تھا جس سے آج تک اہلسنت کا وجود سنبھلنے نہیں پایا۔

☆☆☆☆☆

اب جب یہ دیکھنے کا وقت آ گیا تھا کہ کسی آدمی کا منہج 'کتنے فیصد' سنت پر ہے تو طبعی بات تھی کہ اصولِ سنت اور منہجِ سلف کی ایک از سر نو تنقیح بھی ہونے لگتی۔ 'اہلسنت' جب ایک نسلی اور گروہی پہچان ہو گئی تھی تو اصل حقیقت کو جلی کیا جانا وقت کی ضرورت تھا۔ سنت اور بدعت کا جہاں خلط ہو قدرتی طور پر وہاں

یہ تمیز لازم تھی کہ کونسی چیز ''شروع سلف'' سے چلی آ رہی ہے اور کونسی چیز 'بعد میں' کہیں سے آ شامل ہوئی ہے۔

پیش ازاں، قرون ثلاثہ کے دوران، اصول اہلسنت سے تمسک ایک نہایت معلوم حقیقت اور ایک حد درجہ متعین امر سے چمٹ جانے کا نام تھا۔ مگر اب اس معاملہ کی جو نئی جہت بنی وہ یہ کہ ''اصول اہلسنت سے تمسک'' کے معنی میں ''چمٹ جانے'' کے علاوہ ''تنقیح کر لینا'' (کہ آیا یہ وہ پہلے والی چیز ہی ہے) بھی شامل ہو گیا۔

پس اب اس دور کا تقاضا تھا کہ یہاں اصولِ اہلسنت کے نہایت ثقہ قسم کے ترجمان پائے جائیں۔ چنانچہ وقت کے اچھے اچھے مجاہدانہ کردار کے حامل علماء اپنے اپنے دور کے حوالے سے اصولِ اہلسنت کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دینے لگے۔ کچھ اہل علم تھے جنہوں نے خاص متعین میدانوں میں اصولِ سنت اور منہجِ سلف کی ترجمانی کی۔ جبکہ راہِ سلف کے کچھ خاص شہسواروں نے منہجِ سلف کی ایک جامع انداز کی ترجمانی کا فرض نبھایا۔ چنانچہ اِن بعد کی صدیوں میں کچھ خاص چہرے آپ کو اصولِ سنت اور منہجِ سلف کی شناخت بنے ہوئے نظر آئیں گے۔

'آپریشن' بغیر تکلیف کب انجام پاتا ہے؛ لازم تھا کہ اہلسنت سے تاریخی نسبت کے حامل طبقے اب آپس میں بھی الجھیں اور خود انہی کے بہت سے لوگ اس ''تحقیق'' اور ''تنقیح'' (درحقیقت احیاء وتجدید) کے عمل کو خوش آمدید کہنا اپنے لئے دشوار پائیں بلکہ اسکو بُرا بھلا کہنے، حتی کہ اسکو 'اہلسنت' ہی سے انحراف قرار دینے تک چلے جائیں!

چنانچہ تجدید کے سرخیل، منہجِ سلف کے ترجمان ائمۂ سنت کو ہر دور میں اپنوں کو گھر لانے کی خدمت بھی انجام دینا پڑی اور پرایوں سے اِس گھر کا تحفظ بھی کرنا پڑتا رہا۔

تب سے یہ معاملہ مختلف انداز میں اور مختلف سطحوں پر چلتا رہا ہے۔ اس میں اب ایک فرق پچھلے دوسوسال سے یہ آیا ہے کہ مغربی استشراقی افکار کے پوری دُنیا پہ چھا جانے کے باعث زمانہ ایک بالکل ہی نیا رخ اختیار کر گیا ہے اور یکا یک اب یہ ضرورت آن پڑی ہے کہ وہ اصولِ سنت جن کی ترجمانی یہاں کے آج سے دو سوسال پہلے کے روایتی معاشروں کے اندر ہوتی رہی ہے انہی اصولِ سنت کی ترجمانی اب آج کے اِن غیر روایتی معاشروں میں کر کے دکھائی جائے۔ آج کے ان 'غیر روایتی مسائل' اور 'غیر روایتی بدعات' اور 'غیر روایتی انحرافات' کے مدمقابل سلف کے اس ٹھیٹ منہج کو لے کر آیا جائے اور سنت اور بدعت کے اس 'غیر روایتی' خلط کی بھی اسی منہج کی بنیاد پر ایک تنقیح کی جائے۔ یہ بہرحال کوئی چھوٹا چیلنج نہیں ہے؛ بہت سے اہل علم حضرات جو یہاں کے 'روایتی معاشروں' میں منہج سلف کی ایک اچھی ترجمانی کر سکتے تھے آج کے ان 'غیر روایتی' معاشروں میں کچھ بھی پیش کر سکنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو ہکا بکا دیکھے جاتے ہیں۔ **الا ماشاء اللہ**.

اس لحاظ سے اب ہم جہاں کھڑے ہیں وہ تاریخ کا ایک پیچیدہ مقام ہے۔ اہلسنت کی اس بار کی پسپائی ہرگز کوئی چھوٹی پسپائی نہیں۔

17

تنقیح 'بعد والوں' کے مناہج کی
نہ کہ "دورِ اول" کے مسلمات کی!

جس ''تنقیح'' یا ''تحقیق'' کی ضرورت کا پچھلی فصل میں ذکر ہوا ہے، اور جس کا پچھلی بارہ صدیوں سے ہمارا ہر دور ضرورت مند رہا ہے، خصوصاً ہمارا آج کا برصغیر.. اس ''تنقیح'' یا ''تحقیق'' سے ہماری مراد واضح ہو جانی چاہیے......

اِس ''تحقیق'' یا ''تنقیح'' سے اگر ہماری مراد واضح نہیں ہوتی تو اس کا سارا فائدہ یہاں کے وہ طبقے اٹھا لے جاتے ہیں جو کہ ویسے ہی اپنی کسی مار پر ہیں اور جو کہ دراصل کوشاں ہیں کہ اس امت کے فکر وفہم کو اُس قدیم پٹڑی سے سرکا دیں جس پر یہ قرونِ اُولیٰ میں پائی گئی ہے؛ اور پھر قرونِ اُولیٰ والی اس قدیم پٹڑی سے اتار کر یہ اِس کو اپنی ہی کچھ پیچیدہ راہوں پر کھینچتے اور دھکیلتے پھریں۔

وہ ''تحقیق'' جس کی صدا ہم بلند کرتے ہیں، اُس سے مراد 'پہیے کی از سرِ نو ایجاد' نہیں، جیسا کہ اسلام کی 'از سرِ نو تعبیر' کے شیدائی خیال کرنے لگے ہیں اور اپنی اِس ٹیڑھی رگ کے باعث یہ لوگ 'تنقیح'، 'تحقیق'، اور 'چھان پھٹک' ایسے الفاظ سن کر باغ باغ ہونے لگتے ہیں!

قرآن حدیث کو خود اپنی محنت اور ذہانت سے، یا زیادہ سے زیادہ کسی عربِ مبین کی مدد سے، سمجھ لینے کی کوشش وہ 'تحقیق' نہیں جو یہاں مطلوب ہے۔

کتاب وسنت کو سمجھنے کے معاملہ میں خاص اپنے زورِ بازو پر انحصار کرنا یا زیادہ سے زیادہ پچھلے کسی سو پچاس سالہ 'مکتبِ فکر' کا التزام کر لینا جادۂ بدعت و انحراف پر آپ کا پہلا قدم ہوگا۔ سلف کے راستے کی پابندی کیے بغیر کتاب وسنت کے فہم کا کوئی طریقہ نہیں۔

وہ ''تنقیح'' یا ''تحقیق'' جس کی ضرورت خاص خیر القرون کے گزر جانے کے بعد پڑی، اور اب تک ہے، اور ہمیشہ رہے گی...... وہ یہ ہے کہ: بعد والوں کے یہاں جو اشیاء پائی گئیں اُن کو سلف کے منہج پر پیش کیا جائے اور سلف ہی کے اصول اور سلف ہی کے فہم کی بنیاد پر اُن کا ایک محاکمہ ہو۔ اس تنقیح کا مطلب ہوگا: اُن اضافوں اور اُن جزوی انحرافات کو ورثۂ اہلسنت سے بے دخل کرنا جو زمانۂ سلف کے بعد اِس کے اندر راہ پالینے میں کامیاب ہو جاتے رہے ہیں۔ اِس ''چھان پھٹک'' کا مقصد ہوگا: کچھ سنی طبقوں کے ہاتھ سے منہج سلف کے جن پہلوؤں کا دامن چھوٹ جاتا رہا ان کا ازسرنو احیاء کرنا۔ ایک 'نسلی تسلسل' بن جانے کے ناطے اہلسنت کے یہاں اگر کچھ نادرست رجحانات در آ گئے ہیں، ان کا خاتمہ کرنا۔

اس 'تنقیح' کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خود اس ''منہجِ سلف'' ہی کا محاکمہ شروع کر دیا جائے! جیسا کہ کچھ ھویٰ پرستوں کو خیال چرانے لگا ہے کہ قدیم سے چلی آنے والی ہر بات کی ہی آج چھان بین ہونی چاہیے! ایسی 'تحقیق' کے نتیجے میں تو لازم ہے شرعی مصادر سے استنباط واستدلال کے مناہج ہی ہزاروں کے حساب سے میسر ہوں، جو کہ ان نابغوں کے خیال میں زمانے کی مشکلات آسان کر دے گا! جب سلف کو محاکمہ سے معاف نہ رکھنے کا منہج سند ٹھہرے گا تو پھر ہر شخص کا ہی محاکمہ ہوگا! دلچسپ بات یہ کہ کسی ٹھوس بنیاد کے بغیر ہوگا! پس ہر شخص

یہاں صحابہؓ کے استدلالات کی چھان بین کرے گا!!! ایسی صدائیں جو 'تحقیق' کے نام پر بلند کی جا رہی ہیں وہ دراصل اُمت کو اسکی تاریخی بنیاد سے ہلا دینے ،اور اسکو انتشار اور افتراق کے اُس لق ودق صحرا میں چھوڑ آنے کی ایک بے رحم کوشش ہے جہاں سب سمتیں ایک ہو جائیں اور فہم شریعت کی بابت کوئی 'نقطۂ حوالہ' reffering point ہی دستیاب نہ رہے۔ آج کی اِس جدت پسند 'تحقیقاتی' روش کی رُو سے امت پر گویا فرض ہے کہ یہ قیامت تک 'سیمینار' کرے؛ ایک کے بعد ایک مفکر کو ہی سنتی اور داد دیتی چلی جائے؛ اور اسی شغل میں صدیاں پار کر دے؛ کیونکہ اپنے معاشرے اور اپنے زمانے میں اس اُمت کو اب اور کچھ نہیں کرنا!

یہ ایک فکری طوائف الملوکی ہے جس میں امت کو جھونک دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں؛ اندازہ کیجئے فہمِ کتاب وسنت کے معاملہ میں کوئی نقطۂ حوالہ اسکے پاس ہو ہی نہ!

جہاد کی مامور ایک بھاری بھرکم اُمت کو، جسے پورے کرۂ ارض پر صفیں باندھنا اور شرق تا غرب جماعتِ واحدہ کی صورت چلنا ہو، زمانے کی چھاتی پر پیش قدمی کیلئے ایک ٹھوس بنیاد چاہئے اور اپنے پیر دھرنے کو ایک پختہ زمین...... ایک ایسی پختہ زمین جس کے ہر ہر قدم پر 'بحث' کرنا ضروری نہ ہو اور جس پہ ہزاروں لاکھوں لوگ پورے اعتماد سے پیر دھریں اور نسلوں کی نسلیں، مطمئن، اس پر چلتی چلی جائیں۔

ہمارے آج کے بعض 'محققین' یہ ثابت کرنے جا رہے ہیں کہ ایسی کوئی زمین اس اُمت کو میراث میں نہیں ملی؛ لہٰذا اُمت اگر چاہے تو اب اِنہی محققین کے

'کتاب وسنت سے استنباط کردہ' اصولِ استدلال ومبادیِ استنباط اختیار کرلے اور پھر جیسے جیسے یہ گھومیں، اِنکے ساتھ گھومتی چلی جائے! جبکہ عملاً صورتحال یہ ہے کہ آج کے اِن 'تحقیقی' رجحانات میں ایک اصولِ استدلال کی بابت ہی اتنی متضاد جہتیں پائی جاتی ہیں کہ اِن میں اگر فیصلہ کرنا ہو تو پوری کی پوری اُمت اِنکے اختلاف میں ہی کہیں گم ہوکر رہ جائے۔

سو اِن لوگوں کے پاس تو خود اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کیلئے کوئی بنیاد نہیں، سلف کا محاکمہ تو بڑی جرأت کی بات ہے!

کتاب وسنت بلاشبہ کسوٹی ہے۔ مگر کتاب وسنت کی کسوٹی، کیا اِن کے فہم کے ساتھ یا سلف کے فہم کے ساتھ؟ فہم تو بہرحال ضروری ہے خواہ ان کا ہو یا سلف کا۔ پس سوال ہے تو وہ یہ کہ ''کس کا فہم''؟ بیمار کا...... یا صحتمند کا؟

کتاب وسنت کی جانب رجوع، اہلسنت کا اصلِ اول ہے۔ 'فہم سلف' معاذ اللہ 'کتاب وسنت' کے کسی متبادل کا نام نہیں۔ جیسا کہ بعض متعصب لوگ اپنے کسی بڑے کی بات کو نصوصِ شریعت پر ترجیح دے کر کرتے ہیں۔ اصل سوال صرف یہ ہے کہ کتاب وسنت کی جانب رجوع کس کے فہم اور کس کے اصولِ استدلال اور کس کے طریقے پر ہو، ان کے یا سلف کے؟؟؟

شریعت کے معانی کا تعین جادۂ حق پر آپکا پہلا قدم ہے۔ اِس سلسلہ میں فہمِ سلف کی صورت آپکو جو چیز حاصل ہے وہ حق بھی ہے اور وہ پائدار بنیاد بھی کہ جس پر قوموں اور معاشروں کی ایک دوررس اور طویل المیعاد بنا رکھی جا سکے۔ اسکے علاوہ آپکو اور کیا چاہیے؟

_ اصول ومسلمات جو قوموں کی ناگزیر ضرورت ہیں، کہ جن پر وہ پورے اعتماد

کے ساتھ چلیں، اور جن پر چلتے ہوئے قدم قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھنے اور فکر میں پڑ جانے اور بحثیں اٹھانے کی حاجتمند نہ رہیں......، آپکی بنیادی ضرورت ہے۔ سلف کا چلا ہوا راستہ آپ کے اسی دکھ کا مداوا تو ہے۔

_ نیز یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمات جن پر آپ اپنے دور اور معاشرے میں فکر وعمل کی ایک بلند وبالا عمارت اٹھانا چاہتے ہیں (اور عمارت ایسی جو بار بار نہ ادھیڑنی پڑے)، عین حق اور درست ہوں اور انکے درست ہونے پر مطمئن رہنے کی آپکے پاس کوئی ٹھوس بنیاد ہو (اُسکو نبی ﷺ کی توثیق حاصل ہونا)۔ سلف کا راستہ آپکے اِس دُکھ کا بھی علاج ہے۔

اس کے علاوہ اور آپ کو کیا چاہیے؟ چلنا رہ جاتا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ آپ کو ہی چلنا ہے۔

کتنا فرق ہے ایک ایسی قوم میں جس کو راستے کی نشاندہی ہو اور اس کے درست ہونے کی ضمانت بھی اس کو حاصل ہو.. محض اس پر چلنا باقی ہو...... اور ایک ایسی قوم میں جس کا چلنا تو ابھی باقی ہو ہی، راستہ ڈھونڈنا بھی ابھی باقی ہو بلکہ راستہ کے ایک ایک قدم (ایک ایک استدلال) پر طویل بحثیں کرنا بھی۔

حضرات! اصولِ اہلسنت کی تعلیم پر آپ کا کچھ وقت ضرور صرف ہوگا مگر یہ برصغیر میں آپکے ایک بڑے معضلہ dilemma کا پائیدار حل اور آپکے ایک دیرینہ مرض کا دائمی علاج ہوگا۔ نیز یہ آپکی ایک ایسی طویل المیعاد سرمایہ کاری long term investment اور ایک ایسے کثیر المقاصد انفراسٹرکچر multi-purpose infra structure کی تعمیر ہوگی جو آپکو نسلوں آرام دے۔

☆☆☆☆☆

پس وہ تمام مناہج اور وہ تمام رجحانات جو قرونِ سلف کے بعد سامنے آئے ہیں، اگرچہ وہ اہلسنت کا عنوان لئے ہوئے ہوں، لازماً ایک تنقیح کے عمل سے گزارے جائیں گے۔ ان میں جو خیر ہے وہ قبول کی جائے گی اور اگر کوئی ناخالص چیز ہے وہ رد ہوگی۔ کتاب وسنت کی بنیاد پر اور منہجِ سلف کی روشنی میں محاکمہ سے کوئی چیز بالا نہ رکھی جائے گی۔ محض یہ بات کہ ایک چیز امت کے اندر 'صدیوں' سے چلی آتی ہے، اس کے قبول کرلیا جانے کی دلیل نہ ہوگی، الا یہ کہ اس کا ثبوت قرونِ ثلاثہ کے علمی ذخیروں ہی سے دے دیا جائے۔ بعد کے بزرگ بھی یقیناً بزرگ ہیں اور نہایت قابل احترام، مگر ان کی بات کو پہلے والوں کے منہج کی جانب بہرحال لوٹایا جائے گا۔

18

دورِ صحابہ وسلف کی
"اتباع"، نہ کہ محض 'تعظیم'!

دورِ صحابہ وسلف کی جانب دیکھنے کا انداز درست کرلینا بھی ہماری ایک اہم ترین وبنیادی ترین منہجی ضرورت ہے......

اگر آپ بغور دیکھیں..، تو ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ہاں صحابہؓ اورقرون اولیٰ کا تذکرہ کم ہوتا ہو۔ البتہ سوال یہ ہے کہ صحابہؓ کا یہ تذکرہ ہوتا کس حیثیت میں ہے؟

عقیدت کے طور پر۔ سیرت کے تذکرہ و بیان کے دوران۔ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ فضائل اورمناقب کے طور پر۔ حیاتِ صحابہؓ کے ایمان افروز واقعات کے بیان میں۔ رقائق، زہد، دین داری اورتقوی ونیکی کی تاب ناک مثالیں دیتے ہوئے۔ فتوحات کے حوالہ سے۔ بہادری، دلیری اور جہاد کی روح پرور داستانیں بیان کرتے ہوئے۔ کچھ عظیم الشان وناقابل یقین کارناموں کے حوالہ سے، جو صحابہؓ کے ہاتھوں دنیا میں انجام پائے۔ تبلیغِ اسلام کے حوالہ سے۔ رافضی الزام تراشیوں کے مدمقابل صحابہؓ کا دفاع کرتے ہوئے اور باطنی بغض کے بالمقابل صحابہؓ کے ساتھ اپنی ایمانی وابستگی جتاتے ہوئے...... جو کہ سب کے سب نہایت مستحسن کام ہیں۔ پھر بھی ایک نہایت اہم منہجی بات اِس پوری تصویر کے اندر مفقود ہے۔

یہاں تک کہ صحابہؓ کا تذکرہ ایک 'اسوۂ' اور 'نمونہ' کے طور پر بھی ہمارے ہاں ہوتا ضرور ہے، اور اقتدائے صحابہ کی تاکیدیں بھی اللہ کا شکر ہے بے حد وحساب ہوتی ہیں...... لیکن اگر آپ غور کریں تو ایسی بیشتر تلقینیں صحابہؓ جیسا 'سیرت وکردار' اپنانے کے حوالوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔

رہی یہ بات کہ صحابہ فہمِ دین کا معیار ہیں ...... رہی یہ بات کہ **عقائد، اعمال، تزکیۂ نفس کیلئے اختیار کردہ طریقے، شریعت (وطریقت)، اور اصول ومبادی وغیرہ** ایسے سب امہات المسائل فہمِ صحابہ سے لیے جانا ہیں اور صحابہؓ کے مابعد ظاہر ہونے والے محدثاتِ امور کو بدعت جاننا اور ان سے احتراز اور ممانعت کی جانا ہے خواہ وہ کتنے ہی بڑے بڑے بزرگوں کے ہاں کیوں نہ پائے گئے ہوں ...... رہی یہ بات کہ کتاب وسنت کے **معانی** اور **مفہومات** اور **اصولِ استدلال** کی بابت کسوٹی صحابہؓ ہیں...... رہی یہ بات کہ صحابہؓ سنت اور بدعت کا مفرقِ طریق cross road ہیں......تو ان حوالوں سے صحابہ کا تذکرہ کبھی کم ہی سننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔

کوئی صاحب جہاں صحابہؓ کے ایمان افروز واقعات کے پرتاثیر ذکر سے دلوں کو صبح شام گرمائیں گے وہاں تعبیرِ دین کے معاملہ میں وہ کتاب وسنت سے اپنا ہی فہم پیش کریں گے اور اپنی ہی 'اَقول' سنائیں گے......؛ یہاں پر ''اصحابِؓ رسول اللہﷺ'' شاید ان کو نظر تک نہ آ رہے ہوں!

کوئی صاحب خطبہ میں بڑی پابندی سے **خیر القرون قرني، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم** کے الفاظ 'تلاوت' کریں گے مگر 'عقیدہ' اور 'طریقت' اور 'مشرب' وغیرہ کے معاملہ میں کل انحصار اور سب کے سب حوالے جب دیں گے دورِ آخر کے کچھ بزرگوں کے ہی دیں گے۔ (کیونکہ اِن مستحدث طریقوں اور

ریاضتوں کے سب حوالے مل ہی دورِ آخر کے بزرگوں کے ہاں سکتے ہیں)۔ نہ صرف یہ، بلکہ ان کے ان بزرگوں پر جو لوگ انحصار نہیں کرتے ان کو تقریباً تقریباً اہل بدعت سے بھی بُرا جانیں گے!

مختصر یہ کہ قرون اولیٰ کی جانب تعظیم اور عقیدت سے دیکھنے کے باوجود ہمارا زاویۂ نگاہ درست ہو جانے میں ابھی اس اہم امر کا فقدان ہے۔ خیر القرون کو ''فہمِ دین کے معیار'' کے طور پر نہ لیا جانا ___ اسکی تمام تر تعظیم کے باوجود ___ اسلام کے زمانۂ اول کو گویا ایک سلیقہ سے طرح دے جانا ہے۔ گو اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس امر کی جانب بہت سے لوگوں کی توجہ نہیں جا سکی، وگرنہ صورتحال شاید بہت مختلف اور بہت بہتر ہوتی۔

پس لازم ہے کہ صحابہ وقرونِ سلف کی جانب رجوع کا ایک صحیح ومستند اسلوب متعارف کرایا جائے، جس میں صحابہؓ اور ان کے تلامذہ تابعین و تبع تابعین کے لئے جہاں ''حمیت'' پائی جائے وہاں ''اتباع'' اور ''اقتداء'' کا منہج بھی مفقود نہ ہو۔

وَالسَّابِقُونَ الأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّهُ عَنْهُمْ وَرَضُواْ عَنْهُ ...... (التوبة: ١٠٠)

19

دورِ اول کے "سَلَف" اور
زمانۂ آخر کے "اکابرین"

گو یہ اس گفتگو کا ایک نازک پہلو ہے مگر خدا شاہد ہے اس موضوع کی حرمت کا تقاضا نہ ہوتا تو ہم ہرگز اس طرف نہ آتے۔

ہمارے برصغیر کے کئی ایک روایت پسند طبقے اپنی روزمرہ اصطلاحات میں 'اکابرین' اور 'بزرگوں' اور 'بڑوں' کے الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اصطلاحات کے استعمال میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں۔ اور پھر ہر طبقے کے ہاں خود ان کے اپنے دور میں بھی بڑوں اور بزرگوں کا پایا جانا اور ان کا احترام اور التزام کیا جانا بے حد مستحسن ہے، بلکہ ضروری۔ ہم صرف اُس خلط کو دور کرنا چاہیں گے جو کسی کسی وقت اِس معاملے کو پیچیدہ کر دیتا ہے: ''سَلَف'' کی اصطلاح جو کہ اصولِ اہلسنت کا ایک اہم سنگ میل ہے ابھی پچھلی فصول کے اندر بیان ہو چکی ہے۔ کیا ''بزرگوں'' اور ''بڑوں'' اور ''اکابرین'' کے الفاظ سے ہمارے ان قابل احترام حضرات کے نزدیک عین وہی مراد ہے جو اصولِ اہلسنت میں ''سلف'' سے لی جاتی ہے؟

ظاہر ہے یہ دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں؛ جس میں اصولاً کوئی غلط بات نہیں۔

البتہ جس کثرت سے ان حلقوں میں لفظ 'اکابرین' وغیرہ استعمال ہوتا ہے اور جس کثرت سے اکابرین کی اتباع اور ان کے طریقے کو لازم پکڑ لینے کی تلقین اور تذکیر کی جاتی ہے اور جس شدت کے ساتھ اکابرین کا راستہ ہاتھ سے چھوٹ جانے کے خطرہ سے متنبہ کیا جاتا ہے......، اس کو دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس شدید تاکید و تذکیر کا اصل محل درحقیقت اُمت کے سلف کو ہونا چاہیے۔ ہماری یہ بات اگر کسی کی گستاخی پر محمول ہوتی ہے تو ہم اس پر معافی کے خواستگار ہیں مگر ہماری اس گزارش پر براہِ کرم غور کیا جائے۔

جہاں تک ان الفاظ کے مقصود اور محل کا تعلق ہے......تو یہ سمجھ آنا کچھ مشکل نہیں کہ ''اکابر'' اور ''بزرگوں'' کے الفاظ یہاں کچھ ایسے قابلِ قدر فضلاء کیلئے بولے جاتے ہیں جو آج سے کوئی پچاس یا سو سال پہلے پائے گئے۔ یا زیادہ سے زیادہ جو پچھلی دو تین صدیوں کے دوران یہاں برصغیر میں ہو گزرے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ''اکابر'' اور ''بزرگوں'' ایسے الفاظ سے ان حضرات کے ہاں اُمت کے سلف بہرحال مراد نہیں لئے جاتے۔

یہاں جو سوال سامنے لایا جانا ضروری ہے وہ یہ کہ...... روایت پسندی بلاشبہ ایک مستحسن بات ہے اور دورِ آخر کے بزرگوں کا ادب بھی بلاشبہ قابل تحسین ہے مگر روایات اور بزرگوں کا یہ سارا سلسلہ آخر پچھلے سو دو سو سال پر ہی کیوں محیط ہے؟؟؟

بزرگوں کے راستہ پر چلنے کی تلقین کی جانا بھی حرج کی بات نہیں۔ دورِ آخر کے بزرگوں کو بزرگ ماننے میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی بات قابل فکر ہے تو وہ یہ کہ جہاں ''دورِ آخر کے اکابر'' کے چھوڑے ہوئے طریقے اور راستے کا پابند رہنے

کی صبح شام اس قدر تذکیر ہوتی ہو وہاں ''دورِ اول کے سلف'' کے چھوڑے ہوئے طریقے اور راستے کے حوالے دیا جانا اور ان کا پابند رہنے کی تذکیر کی جانا تو پھر اس سے ہزار ہا گنا بڑھ کر ہونا چاہیے۔ مگر کیا ایسا ہوتا ہے؟

اپنے اکابر کا سلسلہ اگر پچھلے دو تین سو سال پیچھے تک ہی جا پاتا ہے تو سلف کے دور تک آپ کیونکر پہنچیں گے؟

پس ہمارا سوال دورِ آخر کے سلف کا التزام کیا جانے کے 'تذکرہ' پر نہیں بلکہ ہمارا سوال دورِ اول کے سلف کا التزام کیا جانے کے ''عدم تذکرہ'' پر ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ ''سلف'' کا تصور تو ہو مگر وہ اپنے محل پر نہ رہنے دیا گیا ہو؟ یعنی 'سلف' کا تصور کوئی دس بارہ صدیاں نیچے سرک آیا ہو؟ اگر ایسا ہے تو ''اوپر چڑھنے'' کا عمل ہمیں پھر سے زور لگا کر اور شاید بہت کچھ برا بھلا سن کر از سر نو شروع کرنا پڑے گا۔

پھر ایک اہم غور طلب بات تو یہ ہے کہ پچھلی چند صدیاں دراصل اپنے زوال کی صدیاں ہیں۔ ان میں جو رجحانات ایک بڑی سطح پر عام ہوئے وہ تو بطور خاص تنقیح کئے جانے کے قابل ہیں۔ اس کیلئے بھی کسوٹی ہمارے پاس وہی سلفِ اول کا منہج ہے جس پر دورِ آخر کے سب رجحانات اور یہاں پائے جانے والے سب ایجابیات و سلبیات کو پیش کیا جانا ہے۔ (شخصیات اور افراد کا محاکمہ البتہ ہمارا موضوع ہے اور نہ ہماری دعوت)۔

ہم سب جانتے ہیں، قرونِ خیّرہ کے گزر جانے کے بعد اہلسنت کے بعض طبقوں کے ہاں بھی سنت اور بدعت کے خطوط کئی ایک مقامات پر گڈ مڈ ہوئے ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا۔ پھر ہم جانتے ہیں یہ خلط شدہ اُمور امت کے اندر صدیوں سے چلتے اور منتقل ہوتے بھی آئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اشعری اور ماتریدی عقیدہ کے وہ پہلو جو عقلیات اور تاویلِ صفات سے تعلق رکھتے ہیں اور آج تک ہمارے بہت سے مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھائے جاتے ہیں اور پھر نقشبندی وچشتی وسہروردی وغیرہ طریقہ ہائے عبادت و روحانی اعمال کیا ابوبکرؓ وعمرؓ اور ابن مسعودؓ وابن عباسؓ وغیرہ ایسی اسلام کی نسلِ اول سے مروی ہیں یا عمر بن عبدالعزیزؒ اور مجاہدؒ اور عکرمہؒ اور عطاءؒ، اور حسنؒ اور علقمہؒ وغیرہ ایسی اسلام کی نسل دوئم سے ماثور ہیں اور یا پھر ابوحنیفہؒ، مالکؒ،ثوریؒ، ابن عیینہؒ، شافعیؒ، اوزاعیؒ، ابن حنبلؒ اور بخاریؒ وغیرہ ایسی نسل سوئم کے علمی ذخیروں سے ثابت ہوتے ہیں...... یا پھر یہ اشیاء پہلے تین زمانے گزر جانے کے بعد امت میں دیکھی جانے لگیں؟؟؟

قرونِ ثلاثہ کے بعد نیا جو کچھ آیا اور پرانا جو کچھ پس منظر میں چلا گیا.. وہ پورا فنامنا اِس چیز سے بالاتر نہیں کہ قرونِ ثلاثہ کے دستور و آئین کی روشنی میں اُس کا ایک بے لاگ جائزہ اور محاکمہ نہ کیا جا سکتا ہو۔

کتاب وسنت کا وہ استنباط اور استخراج اور فہم اور تطبیق جس کے قابل اعتماد ہونے کی ہمیں شریعت میں یقین دہانی ملتی ہے وہ صحابہ کا استنباط اور استخراج اور فہم ہے۔ رہے آخری صدیوں میں مقبول اور مشہور ہو جانے والے سلسلے تو اُنکو شریعت نے کوئی ایسی حیثیت نہیں دے رکھی کہ ہم پر اُنکو من وعن لینا اور ہر قسم کے نقد و جرح سے بالاتر جاننا ضروری ہو؛ ورنہ خرابِ ایمان کا اندیشہ ہو۔ ہاں جس بات پر ایمان کو اندیشہ ہو جانا چاہیے وہ یہ کہ آدمی جانتے بوجھتے ہوئے دیانت اور عدل کا دامن محض رجال کی تعظیم میں ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے یا یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو حکم ماننے سے پس و پیش کرے یا یہ کہ صحابہؓ کے راستے پر کسی اور راستے کو

ترجیح دینا یا صحابہؓ کے عہد سے چلی آنے والی ایک چیز میں کوئی کمی یا کوئی بیشی ہو جانا قبول کرلے۔

کسی چیز کی تعظیم میں سر نیچا کیا جاسکتا ہےتو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ ہے اور یا پھر خیر القرون کا فہمِ اسلام۔ اسکے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بات نہ ہوسکے۔

کیا ایسا تو نہیں کہ یہاں کے پڑھے لکھے طبقے کا جدت پسندی کی جانب متوجہ ہونا، اپنے اِس پچھلے دو تین سو سالہ جمود ہی کا ردعمل ہو؟ یہ جدت پسند جوکہ کتاب وسنت ☆ کی تعبیر کرتے وقت سوائے اپنی اَھــواء کے کسی قید کے پابند نہیں اور جو کہ سلف تا خلف سب کو بلا امتیاز لتاڑ دیتے ہیں.. یہیں سے ایک بنیاد پا کر لوگوں کو اپنے چنگل میں لاتے ہوں!

اگر ایسا ہے تو اس صورتحال کا شکوہ پھر کیا صرف اِس جدید تعلیمیافتہ طبقہ سے کیا جائے؟

آج اگر ہم لوگوں کو ’’غیر سلف‘‘ کی راہ سے برگشتہ ہو جانے پر قائل کر لیتے ہیں؛ اور اس کے نتیجے میں وہ وقت کے اِن جدت پسند رجحانات کو رد کر دیتے ہیں...... تو کیا اس کے بعد ان کو پھر اُنہی جامد رجحانات کا پابند کیا جائے گا؟ جن سے بھاگ کر ہی وہ اِس جدت پسندی کی جانب مائل ہوتے رہے ہیں؟ اور جن کی اپنی تاریخ بھی دورِ زوال کی پچھلی چند تاریک صدیاں ہی ہیں نہ کہ سلف کا دورِ تابندہ!؟

☆ بلکہ ان میں سے کئی ایک تو صرف قرآن سے ہی ’اپنی سمجھ کے مطابق‘ دین اخذ کرنے کو کافی جانتے ہیں۔

کیا واقعتاً پچھلے ایک عرصہ سے ہم ایک بند گلی پر نہیں پہنچ چکے؟ اور کیا ہر فریق غلط جگہ پر زور نہیں لگا رہا......؟ 'جدت پسندی' کا قلع قمع کرنے کا مطلب لوگوں کو پچھلی دو تین صدیوں کے بزرگوں کا پابند کرانا ہو، اور ان بزرگوں کی پابندی چھوڑ بیٹھنے کا مطلب جدت پسندی!...... اِن دونوں آپشنز کی بجائے، کیوں نہ آدمی پیچھے جائے اور سَلَف کے راستے کی پابندی اختیار کرے؟ محض جدت پسندی کے راستے بند کر کر کے، کیا آج ہم یہاں کے پڑھے لکھوں کے آگے سب راستے تو بند نہیں کر رہے؟ راستہ تو ایک ہی ہے جو آخر تک کھلا ہے اور جو کامیابی اور منزل پر پہنچنے کی ضمانت ہے، باقی تو سب راستے ہی کہیں نہ کہیں بند ہوتے ہیں۔ اور یہ جمود کا راستہ بھی بند گلی تک پہنچا تو اپنے ہاں جدت پسندی کی یہ نوبت آئی تھی!

شرطیہ کامیابی کا راستہ صرف سلف کا راستہ ہے۔ متاخرین کے راستے ضرور اچھے ہوں گے مگر وہاں جہاں یہ راہِ سلف کے پابند ہوں اور جہاں اِن راستوں کا ثبوت سلف کے عملی ذخیروں سے دیا جا سکتا ہو۔ البتہ وہ راستے جن کی تنقیح و محاکمہ واِثبات، آثارِ سلف کی روشنی میں نہ ہو سکتا ہو وہ بہرحال ہمیں کہیں پہنچانے والے نہیں۔ اور عملاً؛ ایک عرصہ سے ایسا ہے۔ بقول امام مالکؒ:

لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها

''اِس اُمت کا آخر بھی عین اسی چیز سے سدھرے گا جس سے اس کا اول سدھرا تھا''۔

☆☆☆☆☆

البتہ جہاں تک مذاہبِ اربعہ کا تعلق ہے تو یہ قرونِ ثلاثہ سے ہی چلی آنے والی چیز ہے۔ یہ ورثۂ سلف ہی ہے۔ اِن آخری عشروں میں جو ایک تاثر اپنے یہاں

تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا ہے کہ متبعِ سلف ہونے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی فروع میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ ایسے فقہی مذاہب سے دستبردار ہو کر دکھائے، وہ سراسر ایک غیر سلفی رویہ ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی وغیرہ سلف کے مذاہب نہیں تو پھر سلف کے مذاہب ہیں کونسے!؟ ''سلف'' جس عہد کا نام ہے وہ مذاہب اربعہ کو شامل ہے نہ کہ مذاہب اربعہ کے مغایر کوئی 'فقہی مذہب'۔ ''سلفیت'' کسی فقہی مسلک کا نام نہیں؛ دورِ سلف سے چلے آنے والے کسی بھی فقہی مذہب کو اختیار کر لینا سلف ہی کی پیروی ہے؛ کوئی چیز ممنوع ہے تو وہ ہے کسی ایک مذہب کیلئے تعصب رکھنا۔ ہمارے سامنے، طحاویؒ و ابن ابی العزؒ حنفی، ابن عبد البرؒ و شاطبیؒ مالکی، بیہقیؒ و ابن حجرؒ شافعی اور ابن قدامہؒ و ابن رجبؒ حنبلی ہوتے ہوئے منہجِ سنت و سلف کے امام ہوتے ہیں۔ پس منہجِ سلف تو وہ چیز ہے جس پر تمام اہلسنت طبقے اپنا تمام تر فقہی تنوع برقرار رکھتے ہوئے اکٹھا ہو سکتے ہیں۔ یہ ہرگز اتنا 'تنگ' نہیں جتنا آج کچھ لوگ دیکھنے لگے ہیں۔ اِس باب میں، شاہ ولی اللہؒ کی طرح، صرف تعصب سے روکئے اور علوم سنت کو پھیلایئے۔

20

کوئی چیز کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہؐ کا متبادل نہیں

''فہمِ سلف'' جتنا بھی قیمتی اور ضروری ہے ''کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ'' کا قائم مقام بننے کیلئے نہیں ہے۔ ''قرآن'' کو علم اور ایمان اور تحریک کا موضوع بنانا اور ''سنت'' کو اُمت کی اس نئی اٹھان کی بنیاد بنانا اپنی جگہ فرض ہے اور اُمت کی بنیادی ترین ضرورت۔ ''فہمِ سلف'' اس عمل کیلئے آلہ کا کام دے گا مگر خود اس عمل ___ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ پر شبانہ روز محنت ___ کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے۔

اس بنا پر وہ جامد سکہ بند رجحانات:

- جو اپنے منہجِ تربیت اور اپنے منہجِ تحریک میں اصل انحصار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ پر نہیں کراتے..
- جو عام آدمی کو قرآن اور سنت کو محض ہاتھ لگا تا دیکھ لیں تو ان علوم اور فنون کی ایک طویل فہرست گنوانے بیٹھ جاتے ہیں جن کے بغیر ان کے خیال میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو ہاتھ لگانا درست نہیں، اور جو کہ درحقیقت ایک 'مجتہد' کی ضرورت ہو سکتے ہیں نہ کہ ایک 'طالب علم' کی......
- جو وقت کے انسان کو وحی کی نصوص میں غوطہ زن نہیں کراتے اور جو مصادرِ دین کا کوئی 'آسان متبادل' دینے پر ہی اصرار کرتے نظر آتے ہیں......

تو دراصل یہ وہ رجحانات ہیں جن کو آپ اس معاملہ میں دوسری انتہا کہہ سکتے ہیں۔

اصل نصاب ہمارے ایمان اور عمل کیلئے خدا کی کتاب ہے اور اسکے رسولؐ کی سنت۔ ہاں البتہ اسکو پڑھنا ہمیں سلف سے ہے اور اسکے پڑھنے میں سلف کے فہم اور طریقہ سے مستغنی نہیں ہونا۔ اور نہ ہی اس میدان میں 'خود کفیل' ہونے کا کوئی زعم رکھنا ہے۔ مگر یہ کہ 'شرح' ہی ''متن'' سے کفایت کر جائے، ''اصل نصاب'' کہیں پس منظر میں ہی چلا جائے اور صرف 'ٹیسٹ پیپر' چلیں!......تو یہ منہج بھی نہ صرف غلط ہے اور ہم کو مصادر دِین سے ہی غافل کر دیتا ہے بلکہ سب سے پہلے یہ سلف ہی کے طریقے سے متصادم ہے۔

یہ سوچ کہ بزرگوں نے کتاب وسنت سے جو نچوڑ نکالنا تھا وہ نکال لیا ہے اور ایک بڑی سطح پر بس اب ہم کو بزرگوں پر ہی سب انحصار کرنا ہے، نسل در نسل اب قیامت تک ہمیں انہی کا التزام کرنا اور انہی کی دہرائی ہوئی عبارتیں دہراتے چلے جانا ہے .. یہ طرزِ عمل یا اندازِ فکر بھی اول الذکر (جدت پسند) انتہاء کی نسبت کچھ کم خطرناک نہیں۔

کتاب اور سنت کا 'نچوڑ نکال' لینے کا کیا مطلب؟؟؟ یہ تو وہ چشمہ ہے کہ اس سے جتنا بھی نکالا جائے اس کی سطح ذرہ بھر نیچی نہ ہو۔ زمانے اس سے سیراب ہو لیں اس میں کچھ بھی کمی نہ آئے۔ اور پھر اس کی تازگی کا تو کوئی بدل ہی نہیں۔ اشرف المخلوقات کی پیاس ہر دور میں ایمان کے صرف اس منبع سے بجھ سکتی ہے۔ کوئی چیز بھی اس کا 'متبادل' نہیں۔ کسی چیز کو اس کا نعم البدل ماننا یا عملاً ایسا تاثر دینا، احسنِ تقویم میں پیدا کی جانے والی اس مخلوق کے رتبہ سے فروتر ہے۔ انسان کی یہ تاریک دُنیا صرف آسمان کی روشنی سے ہی جلا پا سکتی ہے۔

سلف کا فہم اور سلف کا منہج تو جس چیز کا نام ہے وہ اس وحی کے چشمہ سے سیراب ہونے کا ہی دراصل وہ ادب اور وہ طریقہ ہے جس کے بغیر اس چشمہ سے انسان کو شفا اور سیر یابی ہونے کی بجائے کوئی روگ لگ سکتا ہے {يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيراً (البقرہ:۲۷)[۱] فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاء الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاء تَأْوِيلِه (آل عمران:۷)[۲] } رہا یہ کہ دُنیا کی کوئی چیز انسان کو اس بات سے ہی مستغنی کردے کہ تاعمر وہ اسی چشمہ سے ہی بھر بھر کر پیئے، تو اس بات کا، منہجِ سلف اور اصولِ اہلسنت سے دور نزدیک کا بھی کچھ واسطہ نہیں۔ وحی کے سوا کوئی گھاٹ نہیں جس سے خدا کی مخلوق پیئے اور اپنی درماندگی کا مداوا کرے۔

ایک ایسا آدمی جو آپ کو بادشاہ کا پتہ دے سکتا ہے یا یقینی طور پر آپ کو بادشاہ تک پہنچا کر آ سکتا ہے ___ اپنی تمام تر اہمیت وافادیت کے علیٰ الرغم ___ کیا 'بادشاہ' کا متبادل ہوسکتا ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو اس سے بڑی محرومیت کیا ہوسکتی ہے؟!!

معاملہ یہ ہے کہ کلام اللہ ایک ایسا محیط کلام ہے کہ اس میں علم، ایمان اور حقیقت کے سمندر پوشیدہ ہیں۔ سنت، جوامع الکلم پر مشتمل ہے اور اس ذات کی وحی ہے جو وقت اور زمانے سے بلند وماوراء ہے۔ ایسی جامع چیز زمین پر اسکے سوا کبھی اتری ہی نہیں۔ اصولِ سلف اسکی وسعت کو محدود کر دینے کا نام نہیں بلکہ اسکی وسعت سے مستفید اور محظوظ ہونے کے صحیح منہج کا نام ہے کیونکہ وحی کی تلقی کا یہ وہ انداز ہے جو خود صاحبِ وحی کے زیر نگاہ اور اسی کے زیر ہدایت پروان چڑھا اور جس کی سب تراش خراش صاحبِ وحی کے اپنے ہاتھوں ہوئی۔ البتہ اس میں قیامت تک کی جو ضروریات

---

(۱) ''بہتوں کو وہ اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور بہتوں کو گمراہی''

(۲) ''پس البتہ وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے تو وہ اس (کلام) کے ان حصوں کے پیچھے جاتے ہیں جو متشابہ ہوں، فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل کی تلاش میں''

عمدگی کے ساتھ سمو دی گئی ہیں وہ اپنی جگہ باقی ہیں۔ سلف نے کلام اللہ یا رسول اللہؐ کے جوامع الکلم کو معانی کے لحاظ سے محصور یا مقید نہیں کر دیا ہے۔ سلف نے کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہؐ کا فہم لینے کے عمل کو دراصل وہ رخ دے دیا ہے جس کے نہ ہوتے ہوئے انسانی فہم منتشر ہوسکتا تھا اور کسی ایسی سمت میں جا سکتا تھا جو کہنے والے کا مقصود نہیں یا جو انسان کے زمین میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرنے میں مانع ہو۔

ہمیں جو کرنا ہے وہ یہ کہ فہمِ سلف کا استیعاب کرتے ہوئے خود اپنے دور میں خدا کی اس وحی سے ہی اپنا علمی، شعوری، روحانی، تہذیبی اور واقعاتی وجود برآمد کریں البتہ اس عمل کے ہر مرحلے میں اِسکے درست ہونے کی توثیق منہج سلف سے کراتے رہیں۔

یعنی نہ 'وحی' کا کام کبھی کسی دور میں ختم ہوتا ہے اور نہ 'انسان' کا۔ البتہ اس کا فورمیٹ وہی ہوگا جس کو منہجِ سلف یا اصولِ اہلسنت کہا جاتا ہے۔

پس یہ تین چیزیں ہیں:

- وحی، اپنی خالص حالت میں۔
- اپنے دور کا انسان، بلکہ اپنے دور کا ایک بھرپور اور جیتا جاگتا باشعور انسان۔
- اور پھر انسان کے وحی سے تعامل کرنے کا وہ درست طریقِ کار جو شارع کے اپنے زیرِ نگاہ قرنِ اول میں پایۂ تکمیل کو پہنچ کر بعد والوں کیلئے نظیر precedent کی حیثیت اختیار کر گیا۔

ہدایت پانے کا عمل انہی تین امور کا اجتماع ہے۔ ان تینوں میں سے کسی بھی چیز کا روپوش ہو جانا یا اس کا اپنی جگہ سے ہٹا دیا جانا غیر مطلوبہ نتائج برآمد کرنے کا ہی سبب بنے گا۔

حصہ چہارم: **تحصیل**

'مجمع' سے ''جماعت'' تک!!!

21

'مجمع' سے....."جماعت" تک!!!

تاریخ اسلام میں آپ دیکھتے ہیں.. ایک کردار اہل سنت واتباع کا رہا ہے اور ایک کردار اہل بدعت وانحراف کا......

ایک کا موثر ہونا خودبخود دوسرے کا غیر موثر ہونا تھا۔

اول الذکر جب بھی میدان میں اترا، خدائی نصرت کو بحال کرالایا۔

ثانی الذکر نے جب بھی میدان مارا، اپنی ذلت اور خاک اڑی۔

پس یہ کہانی کبھی سمجھ نہیں آ سکتی جب تک تاریخ اسلام کے اِن دو اصل کرداروں کونہیں سمجھ لیا جاتا......؛ اور جب تک اِنہی دو کرداروں کی درست پہچان نہیں کر لی جاتی اور اِنہی دو کا خود اپنے دور میں ٹھیک تعین نہیں کرلیا جاتا: اہل سنت واہل بدعت۔

☆☆☆☆☆

''ملتِ سلام'' اُس صالح وجود کا نام ہے جس میں فاعلیت ہمیشہ ''اہل اتباع'' کا خاصہ رہے گی۔ اہل انحراف کا کردار یہاں کتنا ہی سنگین ہو، مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک 'خلا' کو پر کرنا ہے۔ اندھیرے کا ایک کردار یقیناً ہے؛ بلکہ اندھیرے سے آپ جب کہیں وہ اپنا یہ کردار ادا کرنے کیلئے مستعد ہو گا؛ مگر اندھیرے کی یہ

سب کارگزاری اِس ایک چیز پر موقوف ہے کہ روشنی پیچھے ہٹ کر اُس کو اپنا یہ ’تاریخی کردار‘ ادا کرنے کا موقعہ کب دیتی ہے! اندھیرے کا کردار پس جتنا بھی موثر ہو، ”فاعلیت“ صرف اورصرف روشنی کا خاصہ ہے۔ ”روشنی“ پیدا کرنے پر بہت محنت اورتوانائی صرف آتی ہے تو اس کی وجہ روشنی کی اپنی یہی خاصیت ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھیں تو اصل کردار امت اسلام کے اندر”اہل اتباع“ کا رہ جاتا ہے۔ کچھ کریں گے تو یہ کریں گے۔ کچھ نہیں ہورہا ہوگا تو اِس لئے کہ یہ غیرموجود ہیں۔ اِن کے عروج کو آپ اسلام کی شان وشوکت کہیں گے اور اِن کے زوال کو اسلام کی پسپائی۔

پس عمل کے میدان میں بے شک یہ دو متحارب کردار نظر آئیں، مگر کارکردگی کے اعتبار سے اِس کہانی کا مرکزی کردار ایک ہے: اہل سنت و جماعت!

اپنے حالیہ انحطاط کا اصل حوالہ پس یہ نہیں ہے کہ یہاں کے ”بے دین“ یا یہاں کے ”بدعتی“ زوال کا شکار ہوئے! ہمارے اِس افلاس کی تفسیر، ظاہر ہے، یہ نہیں ہے کہ یہاں کے ”باطنی“ یا ”رافضی“ یا یہاں کے ”قبر پرست“ یا یہاں کے ”ملحد اور زندیق“ ہمارے مسلم معاشرے کے اندر اپنا ”تاریخی کردار“ ادا کرنے میں ناکام ہوئے ہیں......! اُمت کے دورِعروج میں بھی یہ منحرف طبقے پائے گئے تھے۔ یہ اِس کے وجود کو گھن کی طرح کھاتے بھی رہے تھے۔مگر جب تک اہلسنت ، اُمت کے جسم میں خون کے مرض کش جسیمے بن کر دوڑتے رہے، مرض کے یہ سب جراثیم ایک بڑی سطح پر غیر موثر ہی رہے۔ البتہ جیسے ہی ان صحت افزا جسیموں کا کام سست پڑا، تباہی کے یہ اندرونی عوامل پوری شدت کے ساتھ اُمت کے وجود پر حملہ آور ہوئے اور اپنا وہ کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوتے چلے گئے جو اِس سے پہلے تشنہ

رہ جاتا رہا تھا۔ تب یہ گھن کا کھایا ہوا وجود تباہی کے ''بیرونی اسباب'' کا سامنا کرنے سے بھی قاصر ہونے لگا۔ اور بالآخر، حالیہ صدیوں میں مغرب سے اُٹھنے والے طوفانی جھکڑوں کے آگے ڈھیر ہو گیا۔

اس اندوہناک کہانی کی اصل کڑی پس نہ تو گھر کے ''منحرف'' ہوئے اور نہ باہر کے ''حملہ آور''، باوجود اس کے کہ دونوں کا کردار تباہ کن تھا اور ابھی تک ہے......

اِس کہانی کا اصل کردار کوئی ہے تو وہ ''گھر کے محافظ'' ہیں۔

یوں بھی تباہی کے اندرونی اور بیرونی عوامل یہاں کب نہیں پائے جاتے؟ اصل سوال تو آپ کی اپنی ''فاعلیت'' اور ''قوتِ مدافعت'' کا ہے۔ تباہی کے یہ سب عوامل چاہے نظر نہ آئیں، پس پردہ ضرور کام کرتے ہیں۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے؛ ایک صحت مندترین جسم میں بھی تعمیر اور تخریب کے عوامل بیک وقت سرگرم ہوتے ہیں۔ ''صحت مند جسم'' کی تعریف یہ نہیں کہ اس پر بیماری کے جرثومے سرے سے حملہ آور نہ ہوں! بلکہ ''صحت مندی'' کی تعریف ہم یہ کرتے ہیں کہ یہ وہ جسم ہے جس سے ٹکرا کر بیماری کے جرثوے پسپا ہو جاتے ہوں، جس میں مرض کُشی کی صلاحیت زیادہ ہو اور جو قوت کے عوامل کی افزائش زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہو۔ جبکہ لاغر جسم وہ ہے جس میں بیماری کے عوامل کے خلاف مزاحمت سست پڑ جائے اور جو غذا کو قوت میں تبدیل کرنے سے قاصر ہو۔

نبوت کی روشنی پہ قائم وہ حسین واقعہ جو اس اُمت کی تاریخ میں ''اہل سنت'' کے نام سے پہچانا گیا...... یہ دراصل اُمت کے جسم کی اس ''صحت'' اور ''فاعلیت'' کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ اِس کا وہ جوہر ہے جو اس کی ''مرض کشی'' کو بڑھاتا اور اِس کی ''افزائشِ قوت'' کو بحال رکھتا ہے۔ یہاں اصل فرق اگر کہیں آیا تو وہ اِسی حسین

واقعے کا ایک بڑی سطح پر سمٹ جانا ہے۔”اہل سنت“ کا حاشیائی ہو جانا یہاں کا اصل المیہ ہے؛ باقی سب واقعات جتنے بھی اہم اور سنگین مان لئے جائیں، اِس کی نسبت اضافی ہی رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

پس ایک اصلاح کار کی کل دلچسپی یہاں اُسی تاریخی کردار کو بحال کرانے سے ہوسکتی ہے جو ملت کے وجود کے اندر”فاعلیت“ اور”روح“ کا ہم معنیٰ رہا ہے...... اور یہ تاریخی کردار ہے: اہل سنت و اتباع۔ یہی فرقۂ ناجیہ ہے، یہی طائفۂ منصورہ، اور یہی سوادِ اعظم۔ سب امیدیں اِس کو اٹھانے سے وابستہ رکھی جائیں گی اور سب اندیشے اِس کی پسپائی سے جڑے رہیں گے۔ کچھ ہوگا تو اِس کے میدان میں آنے سے۔ کچھ نہیں ہوگا تو اِس کا کردار کمزور پڑ جانے کے باعث۔

پس اگر ہماری کل امید جسدِ امت کے اس حصے کو جگانے اور بحال کرانے سے وابستہ ہے جس کا نام اہل سنت ہے......تو پھر ہماری کل توجہ اِس سوال پر مرکوز ہونی چاہئے کہ اِس طبقۂ حق کو آج جو شدید عدم استحکام لاحق ہے اُس کا سبب کیا ہے؟ اور اس کی وہ فاعلیت جو بڑی حد تک سرد پڑ چکی ہے اُس کو عود کرانے کی کیا صورت ہے؟

اِس عمل کی بنیادی ترین ضرورت یہ دو باتیں ہوں گی:

اول) اُس چیز کو اِس سے الگ تھلگ کرنا جو اِس میں سے نہیں ہے۔ یعنی مبتدعہ کو اِس سے بے دخل کرنا۔

وہ سب باطل پرست طبقے، وہ سب منحرف گروہ، اور وہ سب بدعتی ٹولے جو اِس ”روشنی“ کے مقابلے میں ’اندھیرے‘ کا درجہ رکھتے ہیں...... آج اِس کے ساتھ

یوں گھل مل گئے ہیں کہ ایک ہی جل تھل نظر آنے لگا ہے اور 'اتحادِ امت' کا ایک ایسا عجیب وغریب نقشہ پیش کرنے لگا ہے جس سے ہمارے قرونِ سلف کبھی واقف نہیں رہے۔ وہ حسین کہانی تب تک شروع نہ ہوگی جب تک اِن دونوں کا یہ "آمنے سامنے" کا کردار ہی بحال نہیں کرایا جاتا۔ یعنی ایک طرف باطل پرست طبقے :: تو دوسری طرف متبعینِ حق۔ اِن دونوں کے مابین اگر کچھ مزاحمت ہوتی ہے تو یہ اِس جسم کے صحت پانے کی دلیل ہوگی۔ اِن کے مابین جب بھی کشمکش ہوگی معاملہ اہل حق کے حق میں بیٹھے گا۔ اِن کے مابین جب بھی مزاحمت سرد پڑے گی معاملہ اہل باطل کے حق میں بیٹھے گا۔ اِس "اختلاف" کو جو سنت اور بدعت کے مابین ہے، توحید اور شرک کے مابین ہے، اتباع اور انحراف کے مابین ہے.. سامنے لانا بدعت کی موت ہے؛ اور اس کو روپوش کرانا سنت کی پسپائی۔

پس یہ "اختلاف" یہاں باقاعدہ طور پر مطلوب ہے اور طائفہ حق کے احیاء کا اولین نقطہ۔

اِس "اختلاف" کا سامنے آنا جن بنیادی ترین اشیاء پر انحصار کرتا ہے، اُن میں سے ایک: "مراجعِ فہم" ہے۔ کم ہی کوئی طبقہ ہوگا جو "اللہ اور رسولؐ" کو رد کرے گا۔ اصل مسئلہ "اللہ اور رسولؐ" کی جانب رجوع کرنے کا وہ طریقہ ہے جو اہل اتباع اور اہل انحراف کو ممیّز کرتا ہے اور جس کی واحد اساس "اصحابِؓ رسول اللہؐ" ہیں جن کے "اللہ اور رسولؐ" کی جانب رجوع کرنے کو خود "اللہ اور رسولؐ" نے ہی معیار قرار دے رکھا ہوا ہے۔ یہاں سے "اتباع" اور "انحراف" کے راستے الگ الگ ہوتے ہیں؛ اور یہیں سے وہ "فرق" سامنے آتا ہے جس کا اٹھایا جانا حق کی زندگی ہے اور باطل کی موت۔

چنانچہ جیسے ہی آپ اِس "اختلاف" کو زندہ کریں گے، باطل اِس طائفۂ حق سے الگ تھلگ ہونے لگے گا اور اِس کا اپنا صالح وجود ممیّز ہو کر سامنے آنے لگے گا۔ قدیم سے چلے آنے والے باطنی، رافضی، وجودی، اعتزالی اور قبر پرست رجحانات وغیرہ.. اور دورِ جدید میں پائے جانے والے ملحد، سیکولر، قومیت پرست، و جمہور پرست رجحانات وغیرہ.. سب اِس سے چھٹنے لگیں گے اور حق اپنے بے ساختہ روپ میں نمایاں سے نمایاں تر ہوتا چلا جائے گا...... اور وہ تاریخی عمل ازسرنو بحال ہونے لگے گا جس کے سست پڑ جانے کے باعث یہ صورتحال ایک کھڑے پانی کا نقشہ پیش کرنے لگی ہے۔

دوم) اُس چیز کو اِس سے الگ نہ ہونے دینا جو اِس میں سے ہے۔

مراد ہے: **اِس طائفۂ حق کے تنوع کا صحیح صحیح تعین** کرنا۔ اور جس کی رو سے:

آپ اُن سب فرعی تقسیمات کو قبول کرتے اور بیک وقت ساتھ چلاتے ہیں جن کے دم سے اِس طائفۂ حق (اہل سنت) کے وجود کو ایک عظیم الشان وسعت اور ایک تنوع حاصل ہے۔ جیسے احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ، ظاہریہ، اہل الرائے واہل الحدیث وغیرہ۔

یہاں؛ اُس تنگ نظری کا علاج کرنا ہوگا جو ایک جزء کو کل جاننے لگتی ہے؛ اور 'اپنے' علاوہ کسی مسلک اور کسی فقہی گروہ کو "اہل سنت" ماننے یا "اہل حق" کا درجہ دینے کی ہی روادار نہیں رہتی۔

آپ اتفاق کریں گے، طائفۂ حق کی یہ وسعت اور یہ تنوع آدمی پر کبھی واضح نہیں ہو سکتی جب تک آدمی پر "مراجعِ فہم" کا مسئلہ واضح نہ ہو: تاوقتیکہ آپ پر یہ واضح نہ ہو کہ صحابہ ؓ کے آراء و اجتہادات اور ان کے فقہی رجحانات کیونکر متنوع

ہوئے اور ان پر قائم ''مدارس'' عالم اسلام کے اندر کیونکر پھیلے؛ اور یہ کہ اِن ''مدارس'' کا یہ تسلسل پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم تک کیونکر پہنچتا ہے...... تب تک آپ اُس بند ذہنی سے نہیں نکلیں گے جو آپ کو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر ہی محصور کرا دیتی ہے اور رفتہ رفتہ آپ اُسی کو ''اہل سنت'' کا دائرہ باور کرنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک فقہی مسئلے پر حق و باطل کے معرکے کھڑے کر لئے جاتے ہیں! کسی ایک نص کی تصحیح یا تضعیف پر عداوت کا بازار صدیوں گرم رکھا جاتا ہے۔ ایک ایک فرعی مسئلے پر آپس میں برأت نامے اور اعلان ہائے بیزاری صادر ہوتے ہیں؛ اور محض جزوی امور کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کو منحرف اور باطل پرست گردان لیا جاتا ہے بلکہ ایک دوسرے کی نجات تک کی بابت سوال اٹھا دیا جاتا ہے! اِس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ''اللہ اور رسولؐ'' کی جانب رجوع کرنے کا وہ سلیقہ جو اصحابِ رسول اللہؐ کے ہاں ملحوظ رہا اور قبول وفہمِ نصوص کے معاملہ میں اُن کے ہاں جو ایک وسعت اور تنوع پایا گیا اور باقاعدہ برقرار رکھا گیا...... اصحاب رضی اللہ عنہم سے موروث وہ پورا منہج ہماری نظروں سے آج روپوش ہو گیا ہے۔

یہ دونوں باتیں {۱- طائفہ حق کے وجود سے باطل کو بے دخل کرنا......، اور ۲- طائفۂ حق کے تنوع کی صحیح صحیح نشاندہی کروانا} ہماری اِس کتاب کا موضوع رہی ہیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا، اِن ہر دو موضوع کا تعلق جتنا ''مراجعِ فہم'' کے مسئلہ سے ہے اُتنا کسی اور مسئلہ سے نہیں۔

{ تیسری چیز (گو یہ ہماری اِس حالیہ تالیف میں زیر بحث نہیں آئی)، یہ ہے کہ: اُن جزوی انحرافات کی بھی پیمائش و درجہ بندی ہو جو اِس طائفۂ حق کے اپنے ہی بعض افراد یا بعض طبقوں میں پائے جا سکتے ہیں۔ نیز ان جزوی

انحرافات کے ساتھ پیش آنے، ان کی اصلاح کرنے، البتہ ان (جزوی) انحرافات کے علی الرغم طائفہ حق کی شیرازہ بندی جاری رکھنے، کی بابت اہلسنت کا طریقہ و دستور معلوم کیا جائے۔☆ }

یہ وہ تین کامیاب بنیادیں ہیں جن پر ایک قافلۂ حق صدیوں چلتا رہا ہے۔ اِس قافلہ کا وہ زوال جس کا آج ہمیں سامنا ہے، دراصل اِنہی تین جہتوں سے ہے۔ اِس 'مجمع' کو ایک بار پھر "جماعت" میں بدل دینے کیلئے آپ کو اِن تینوں محوروں پر بیک وقت کام کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

تاریخ کے اِس منفرد ترین موڑ پر جس کو "گلوبلائزیشن" کا نام دیا جاتا ہے اور جہاں پر بڑی بڑی بلاک بندیاں ہونے والی ہیں بلکہ ہو رہی ہیں......فکری یکجہتی کے جس قدر مواقع قدرتی طور پر آج زمین پر بسنے والے اُن طبقوں کو حاصل ہیں جو "ہدایت" کیلئے کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہؐ اپنے پاس رکھتے ہیں، اور "ہدایت" کے اِن دو مصادر کو لینے اور سمجھنے کیلئے اصحابِؓ رسول اللہؐ سے موروثہ مناہج اور مدارس.. فکری یکجہتی اور نظریاتی یکسوئی کے اِس قدر مواقع کرۂ ارض کی کسی اور جماعت کو میسر نہیں۔ لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے یہ دینی طبقے ہی آج اِس فکری یکجہتی اور نظریاتی ہم آہنگی سے سب سے بڑھ کر دور ہیں.. بلکہ اس کی ضرورت سے ہی ناآشنا!

کیا اِس سے بڑھ کر بھی تاریخ نے کوئی عجوبہ دیکھ رکھا ہوگا؟

☆ اِس پر کچھ مواد ہماری ترجمہ کردہ کتاب "اہل سنت فکر وتحریک۔ فتاویٰ ابن تیمیہ کی روشنی میں" کے اندر دستیاب ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے بہ عنوان "اهل السنة والجماعة۔ معالم الانطلاقة الكبرىٰ" مولفہ عبدالہادی المصری

مستقبل کی وہ تحریک جو عالم انسان کے اندر پائے جانے والے اِن سب نیک مواقع اور اِن سب صالح وسائل کو بروئے کار لائے گی، خصوصاً برصغیر میں پائی جانے والی اِس زرخیزیِ مواقع کو عمل اور جہاد کا رخ دکھائے گی، اور جس کے نتیجے میں یہاں باطل کے بڑے بڑے برج الٹیں گے، اور آخر تو ان شاء اللہ یہ ہونا ہے......، اِس مبارک عمل کے جہاں اور بے شمار لوازمات ہیں وہاں ''منہجیتِ فہم'' کا مسئلہ حل کر کے دینا بھی اِس عمل کا ایک بہت بڑا رخنہ پر کرنے کے مترادف ہوگا..اور اپنے برصغیر کی ایک بہت بڑی ضرورت......؛ جہاں مسلمان 'مسلکوں' میں پھاڑا جا چکا ہے اور اپنی تمام تر نیکی و جذبۂ عمل کے باوجود باطل کیلئے لقمۂ تر بنا ہوا ہے۔ پس یہ معاملہ کسی بے رغبتی، یا مٹی ڈالنے کا ہرگز متحمل نہیں۔

بنا بریں......فہم کے مراجع کو ''دورِ سلف'' تک پیچھے لے جانا اور اپنا ایک تسلسل وہیں سے برآمد کراتے ہوئے، 'گروہی' انداز سے بلند ہوکر ''امت'' کی سطح پر آنا اس عمل کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔

حصہ پنجم:

ازالۂ اشکالات

- ابوجہل اور ابولہب دین کو سمجھ سکتا ہے تو مستشرقین اور جدت پسند کیوں نہیں؟

- منہجِ سلف حل کیسے، اِس کی تو حجیت ثابت کرنے کیلئے گھنٹے چاہئیں!

- کیا ہر نئی بات ممنوع ٹھہرادی جائے گی؟

- اختلافِ سلف کا جو دائرہ آپ بنا کر دیتے ہیں، ہم بھی اُس سے باہر تو نہیں!

22

ابوجہل اور ابولہب دین کو سمجھ سکتا ہے تو مستشرقین اور جدت پسند کیوں نہیں؟

نصوصِ شریعت کو امرؤ القیس، نابغہ اور عمرو بن کلثوم وغیرہ کے کلام پر قیاس کرنے والا ایک سطحی ذہن یہ سوال اٹھاتا ہے کہ قرآن ایسا کلام فصحائے عرب کو سنانے کیلئے ہی اتارا گیا تھا، اور ظاہر ہے جب یہ قرآن عربوں کو سنایا جاتا تھا تو اُس وقت لوگ 'تفاسیر' لے کر ساتھ نہیں بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک عام عرب کو قرآن سے جو معنیٰ ملتا وہی اس کلام کا ماحصل ہوتا۔ لہٰذا ایک عربی ذوق رکھنے والے شخص کو اِس کلام سے جو سمجھ آتی، اگر وہ ایسا ہی ناقص اور ناکافی فہم تھا تو عربوں کو قرآن پڑھ کر سناتے وقت ہی تفاسیر بھی کھول کر رکھ دی جاتیں!

قرآن اِن حضرات کے خیال میں گویا محض ایک ادبی شہ پارہ ہے نہ کہ ایک کامل، جامع ومفصل شریعت کی کتاب......!

ایک عربی ذوق رکھنے والا شخص اِس کلام کو محض سن کر اور اس پر غور کرکے یقیناً ہدایت کی راہ پا سکتا ہے، اُس کو مقصد زندگی کا سراغ ملتا ہے، وہ خالق سے ایک بہترین انداز میں متعارف ہوسکتا ہے، وہ بندگی کے بہت سے دلنشیں معانی سے بہرہ یاب ہوتا ہے، وہ جاہلیت کے دیے ہوئے بے شمار تصورات سے برائت و بیزاری کیلئے اپنے اندر ایک تحریک پاتا ہے، آسمان سے اترنے والی شریعت کی اتباع کا سبق ذہن نشین کرتا ہے، اور رسولؐ سے رجوع کرنے اور اُس کے اصحابؓ کے پیچھے صفیں بنانے کا ایک نہایت واضح پیغام وصول کرتا ہے۔ نیز شریعت خداوندی کی بے شمار تفاصیل سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ یقیناً یہ چیزیں ایک عربی ذوق کے مالک شخص کو

جس خوبصورت انداز میں اور جس قوتِ تاثیر کے ساتھ قرآن سے ملتی ہیں کہیں سے نہیں ملتیں۔ سننے والے جب اِس کلام کو سنتے تو ان کیلئے اس پر ایمان لانے سے رکا رہنا اوراس کی تاثیر کے خلاف مزاحمت کرنا دشوار ہو جاتا۔ یہ چیز ابو جہل اور ابولہب کیلئے بھی تھی اور آج کے ایک مستشرق کیلئے بھی ہے۔

تاہم ایک سطح وہ ہے جہاں آدمی اِس قرآن پر باقاعدہ ایمان لے آتا ہے؛ اور جس کے بعد وہ اس نبیؐ کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہے اور اپنی مہار اِس نبیؐ کو تھما دیتا ہے۔ یہاں؛ اب اس کیلئے نبیؐ کے الفاظ تو کیا نبیؐ کے اشارے بھی حرفِ آخر ٹھہرتے ہیں۔ نبیؐ کے ہاں جن لوگوں نے پزیرائی پا رکھی ہے اور برسہا برس سے وہ اس کے حلقہ نشین چلے آتے ہیں، خصوصاً وہ لوگ جو نبیؐ کے دربار میں نہایت سینئر سمجھے جاتے ہیں اور جن کی بابت نبیؐ کی توثیق پائی جاتی ہے کہ وہ نبیؐ سے شریعت کے اصول وفروع کو نہایت خوب سمجھ چکے ہیں، ایسی ہستیوں کے ''تعامل'' کی بھی اب اُس شخص کے ہاں ایک خاص حیثیت ٹھہرتی ہے۔ وہ سب باتیں جو قرآن سے ایک مجمل انداز میں اُس کو سمجھ آئی تھیں، اب وہ نبیؐ سے اور نبیؐ کے اعتماد وتوثیق یافتہ اصحابؓ سے زیادہ مفصل اور زیادہ دقیق انداز میں ایک بار مزید سمجھتا ہے؛ بلکہ جو کچھ اُس نے سمجھا وہ یہاں سے اُس کی توثیق بھی لیتا ہے۔

پہلی سطح ایک ابتدائی عمل تھا؛ اور وہ عربِی مبین کی بنا پر ہر کسی کو حاصل ہے۔ دوسری سطح ایک پختہ وتوثیق شدہ عمل کا نام ہے؛ اور وہ ''متبعین باِحسان'' کو حاصل ہوتی ہے۔

ایک فطین آدمی یقیناً ایک کلام کو سن کو اس سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے اور بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ پھر بھی اس میں وہ بات نہیں جو اُس صورت میں ہو گی جب وہ فطین آدمی، خود صاحب کلام ہی کے پاس بیٹھ کر، یا اُس کے سند یافتہ شارح

سے، اُس کلام کی ایک ایک دلالت اور ایک ایک اشارے کو سمجھ لے، نیز جب وہ اپنی سمجھی ہوئی اشیاء کی اُس سے توثیق بھی کرا لے۔

خاص طور پر جبکہ ہم نے کہا کہ قرآن کوئی محض ادبی شہ پارہ نہیں یہ ایک مفصل شریعت کی کتاب ہے اور اس کی اَن گنت جہتیں ایسی ہیں جو نبی ﷺ کے بیان سے ہی واضح ہوں گی۔ پس اِس کو سمجھنے کیلئے منطق، عقلِ عام، لغت اور ادب وغیرہ ایک حد تک ہی کام دیتے ہیں؛ یہ سب چیزیں نبیؐ کے ''بیان'' سے کفایت بہر حال نہیں کرتیں۔

منطق، لغت اور ادب وغیرہ آپ کو نصوصِ کتاب کا ایک ابتدائی و سرسری وغیر حتمی فہم ہی دے سکتے ہیں اور جو کہ ایک مبتدی کیلئے بہرحال مددگار ثابت ہوتا ہے؛ یہاں تک کہ اگر وہ خوش قسمت ہو تو اس سے مدد پا کر وہ نبیؐ کی تابعداری اختیار کرنے تک جا سکتا ہے اور جبکہ نبیؐ زمین پر خدا کا متعین کردہ شارح و مبیّنِ قرآن ہیں۔ البتہ اس قرآن کا ایک پختہ تر اور عمیق تر اور مستند تر فہم وہی ہے جو آدمی کو نبیؐ سے اور نبیؐ کی حلقہ بگوش ہستیوں سے ملے۔ وہ ابتدائی فہم جو آدمی کو قرآن سے صرف عربِ مبین کی مدد سے حاصل ہوتا ہے نہایت خوب ہے، مگر وہ اُس پختہ تر و مستند تر فہم جو نبیؐ اور اُس کے سند یافتہ تلامذہ سے ملتا ہے، پر حَکَم arbiter بننے کیلئے بہرحال نہیں ہے؛ کہ آدمی معاذ اللہ نبیؐ یا آپؐ کے سینئر اصحابؓ کا اپنی 'عربی' کی بنیاد پر محاکمہ کرتا پھرے!

''بیان'' کے کئی درجے ہیں۔ خود قرآن نے اپنے آپ کو ''بیان'' کہا ہے۔ **هٰـذا بَيَـانٌ لِّـلنَّاسِ** مگر اِس ''بیان'' کو مزید ''بیان'' کرنے کا ایک باقاعدہ منصب بھی خود یہ قرآن ہی نبی ﷺ کو تفویض کرتا ہے: **وَأَنـزَلْـنَـا إِلَيْـكَ الذِّكْـرَ لِتُبَيِّنَ**

لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (النحل:۴۴)'' (اے نبی) ہم نے تجھ پر یہ ذکر نازل فرمایا، تاکہ تو بیان فرما دے لوگوں کے واسطے، وہ (کلام) جو اُن کی طرف نازل کیا گیا، اور تاکہ وہ خود بھی غور کریں''۔

چنانچہ شریعت کا ایک ''بیان'' وہ ہے جو قرآن ہمیں کر کے دیتا ہے اور وہ قرآن ہی کر کے دے سکتا ہے۔ لیکن ایک ''بیان'' وہ ہے جو اِس قرآن کی بابت نبیؐ کر کے دیتا ہے اور وہ نبیؐ ہی کے بیان کرنے کا ہے۔ جبکہ یہ موخر الذکر بات بھی، از روئے آیتِ مندرجہ بالا، قرآن ہی سے ثابت ہے۔

ظاہر ہے وہ ''بیان'' جو صحابہؓ رسول اللہ ﷺ سے حاصل کر کے ہم تک پہنچائیں گے اور اس کو ایک باقاعدہ دستور کی صورت دے کر رکھیں گے ___ جبکہ صحابہؓ عربی دانی میں بھی نہایت اعلیٰ مقام رکھتے ہیں ___ وہ اُس ابتدائی و سرسری فہم سے بہت آگے کی چیز ہے جو آج کا کوئی مستشرق یا جدت پسند محض لغت کے اوزاروں سے کام لے کر ہمیں قرآن سے نکال کر دینے کی کوشش کرے گا۔

یعنی وہ اوزار جن کا مستشرقین یا جدت پسندوں کو کچھ بھی زعم ہے......، لغت کے وہ سب اوزار رکھنے میں بھی صحابہؓ وتابعینؒ ہمارے آج کے اِن لوگوں سے بہت آگے ہیں، لبتہ اُن کو وہ چیز بھی بدرجۂ تمام حاصل ہے جو اِن کے پاس سرے سے نہیں ہے، یعنی تنزیلِ وحی کی فضاؤں کے اندر زندگی گزارنا اور صاحبِ وحیؐ کی ایک خاص قربت حاصل ہونا، بلکہ صاحب وحی کے ہاتھوں فکری، ذہنی، روحانی وعلمی تربیت کے ایک طویل عمل سے گزرنا اور نبیؐ کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنے کے نتیجے میں ہی تفسیر دین کی یہ قابلیت اور جوہر اپنے اندر پیدا کرنا۔ مراد یہ کہ جس چیز کا اِن حضرات کو دعویٰ ہے اُس میں بھی صحابہؓ اِن سے بہت آگے۔ اور جس چیز کا یہ

دعویٰ کر ہی نہیں سکتے وہ بھی صحابہؓ کے پاس بدرجۂ اتم۔ کیا پھر بھی اِن کے اخذ کردہ معانی ہی صحابہ کے دیے ہوئے معانی اور مفاہیم پر فیصل اور حَکَم ٹھہریں؟!

''عربی'' کے حوالے سے بھی یہ بات واضح رہنا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ اَفصح العرب ہیں۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اَفصاح عرب ہیں۔ یہ تاثر کہ ہمارے لاہور ساہیوال کے پنجابی سپیکنگ جدت پسند کم از کم 'عربی' کی بنیاد پر ضرور یہ برتہ رکھتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول اللہؐ سے ماثور تفسیر و معانی کے جھول نکال نکال کر دکھانے لگیں، ایک مضحکہ خیز امر ہے۔ بلکہ اِسے علاماتِ قیامت میں شمار کیجئے۔ دین اور شریعت کا علم تو ہے ہی صحابہؓ کے پاس، عربی کے اسالیب کی وسعتیں بھی جو صحابہ کو معلوم ہیں (کہ وہ خلاصۃ العرب ہیں)، وہ ہمارے اِن معلقاتِ سبعہ کے رٹے مارنے والوں کو کہاں حاصل ہونے والی ہیں؟

مختصر یہ کہ: جی ہاں یقیناً ایک وہ سطح ہے جہاں عتبہ، شیبہ اور ربیعہ کو ایک اعلیٰ عربی ذوق حاصل ہونے کی بدولت قرآن کا بیان سمجھ آتا ہے اور وہ چاہیں تو اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ تاہم یہ وہ سطح یقیناً نہیں ہے جس کے برتے پر عتبہ، شیبہ اور ربیعہ کسی دن ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ سے جا کر کہیں کہ تمہارے قرآن سمجھنے میں از روئے لسانِ عرب فلاں اور فلاں اور فلاں جھول ہے اور شریعت کے فلاں اور فلاں مسئلہ میں تو ــــــ اصولِ لغت کے اعتبار سے ــــــ تم نے غلطی کی حد ہی کر دی ہے!

منہجِ سلف 'بحثیں' ختم کہاں کرے گا،
اِس کی تو حجیت ثابت کرنے کیلئے گھنٹے چاہئیں!

خصومات سے تحفظ

فصل ششم میں، ہم یہ مبحث بیان کر آئے ہیں کہ آدمی جب تک انبیاء کا اور انبیاء کے حواریُّون واصحاب کا راستہ نہ اپنا لے...... ''دین'' یا ''فہمِ دین'' کی بابت اس کا یہ دعویٰ کہ وہ اَھواء سے تحفظ کی کوئی صورت اپنے پاس رکھتا ہے، دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ کیونکہ اَھواء ایک ایسی چیز ہے جو ''حق'' کے روپ میں ہی آدمی کے پردۂ ذہن پر جلوہ آرا ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ حواریُّون واصحاب کا راستہ چھوڑ بیٹھنے والوں کیلئے یہ ''حق'' تغیر پزیر رہتا ہے اور ان لوگوں کو اپنا یہ سفر زیادہ تر ''ارتقاء'' کے دشت میں ہی طے کرنا ہوتا ہے؛ جہاں دینِ خداوندی کے معاملہ میں ان پر نت نئے ''انکشافات'' ہوتے ہیں۔

بیشتر لوگ ''اھواء'' کو 'شہوات' کا کوئی ہم معنیٰ لفظ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جبکہ علمائے سلف کا استعمال دیکھیں تو ''اھواء'' انسان کے اُن فکری میلانات کا نام ہے جن سے کام لے کر انسان حق اور باطل کا تعین کرتا ہے؛ وہ جس انداز کے فکری میلانات رکھے گا ویسے ہی فکری نتائج اس کے سامنے آتے چلے جائیں گے جن کو وہ ''حق'' سمجھ کر اختیار کرتا چلا جائے گا۔ انسان کو اِس سے بچانے کیلئے، اور اُس کے فکری میلانات کو درست حالت میں رکھنے کیلئے، دنیا کے اندر:

(i) انبیاء پائے گئے ہیں...... جن کا دامن تھام لینے سے آپ خود بخود ''اھواء''

کے ایک بہت بڑے حصے سے محفوظ ہو جاتے ہیں؛ بصورت دیگر آپ اُن فلاسفہ اور زنادقہ کے دین پر ہوتے ہیں جو ''حق'' اور ''حقیقت'' کا تعین کرنے میں انبیاء کی ہمسری کرتے ہیں۔

(ii) البتہ ''اھواء'' کا ایک حصہ ہے جو پھر بھی آپ پر حملہ آور ہو سکتا ہے، تاوقتیکہ آپ انبیاء کے حواریون و اصحاب کے راستے کا بھی پابند نہ ہو جائیں؛ جیسا کہ خوارج، روافض، جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ وغیرہ ایسے طوائف کے ساتھ ہوا۔ یہ سب فرقے یقیناً انبیاء پر ایمان رکھنے والے ہیں؛ مگر اصحابؓ کا راستہ چھوڑ بیٹھنے کے باعث بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتے رہے ہیں۔ ''اتباعِ انبیاء'' کے معاملہ میں ان کا بھٹکنا اور بہکنا جس پیمانے سے ماپا جائے گا وہ پیمانہ ''اصحابِ رسول اللہؐ'' ہیں؛ کوئی جتنا اُس سے دور ہو گا اتنا ہی وہ حق سے دور ہو گا اگرچہ وہ نبیؐ کی لائی ہوئی ہدایت کا دم کیوں نہ بھرتا ہو اور اپنے صغریٰ و کبریٰ لگا کر جا بجا 'کتاب و سنت' سے استدلال کیوں نہ کر لیتا ہو۔

چنانچہ آپ دیکھتے ہیں، **اِن بدعتی طوائف میں سے کوئی ایسا گروہ نہ ہو گا جس نے 'کتاب و سنت' سے رجوع کے کچھ خاص اپنے معیارات وضع نہ کر رکھے ہوں!**

پس ''اھواء'' کی اول الذکر صورت وہ ہوئی جو دنیا میں ''انبیاء'' کے ہم سر کھڑے کرتی ہے۔ اور ثانی الذکر صورت وہ جو دنیا میں ''اصحابؓ'' کے ہم سر کھڑے کرتی ہے۔

بنا بریں...... ''اھواء'' کی ثانی الذکر صورت وہ ہے جو آدمی کے قرآن اور نبیؐ کو قبول کر لینے کے بعد بھی اُس پر حملہ آور ہونے کیلئے موجود رہتی ہے...... تاوقتیکہ

آدمی اصحابِؓ رسول اللہؐ کے راستے کو ہی اپنے لئے دستور کا درجہ نہ دے لے؛ اور تاوقتیکہ اپنے ''فہمِ کتاب وسنت'' کو اسی کے مطابق نہ کر لے۔

یہاں آ کر؛ آدمی کو ''اتباع'' کی نعمت نصیب ہوتی ہے، جوکہ ''ہدایت'' کی اصل روح ہے۔ ''اھواء'' سے تحفظ پانا خود بخود ''بحث و آراء'' سے آپ کی جان چھڑوا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں اصولِ سلف میں ''اَھواء'' کے ساتھ ساتھ جس دوسرے لفظ کی بے حد وحساب مذمت پائی جاتی ہے وہ ہے ''خصومات''۔ کہیں پر اِس کو ''خوض فی الدین'' کہا گیا ہے، کہیں پر ''مِـرَاء فی الدین''، کہیں پر ''کلام'' اور کہیں پر ''بحث وجدال''۔ اِس معنیٰ کو واضح کرنے کیلئے یہاں ہم ''خصومات'' کا لفظ ہی زیادہ استعمال کریں گے۔ یہی سلف کے ہاں بھی سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔

امام احمدؒ ''اصولِ سنت'' کا لب لباب بیان کرتے ہیں:

أصول السنة عندنا: التمسك بما كان عليه أصحاب رسول الله ﷺ، والاقتداء بهم، وترك البدع؛ وكل بدعة فهي ضلالة، وترك الخصومات، وترك الجلوس مع أصحاب الأهواء، وترك المراء والجدال والخصومات في الدين۔ (أصول السنة للإمام أحمد ص ١)

اصولِ سنت ہمارے ہاں یہ ہیں: جس چیز پر اصحابِؓ رسولؐ رہے، اُس سے شدید تمسک رکھنا۔ اصحابِؓ رسولؐ کی اقتداء کرنا۔ بدعات کو ترک کرنا کیونکہ جو بھی بدعت ہے وہ ضلالت ہے۔ نیز بحث و آراء کو ترک کرنا۔ اَھواء کا شکار لوگوں کی ہم نشینی ترک کرنا۔ اور دین کے اندر بحث وجدال اور خصومات سے مکمل طور پر دامن کش رہنا۔

چنانچہ...... جن اقوام کو انبیاء کا دامن پکڑنا نصیب نہیں ہوا...... نہ صرف یہ کہ اپنی دنیا کے ایک ایک 'میٹافزیکل' مسئلے پر، اور ایک ایک اقتصادی یا سیاسی یا سماجی یا

تہذیبی گتھی سلجھاتے وقت، وہ ''اھواء'' کا شکار ہوں گی.. بلکہ وہ ''خصومات'' (بحث و آراء) کے ایک لق و دق صحرا میں بھی بھٹکتی چلی جائیں گی۔ جبکہ انبیاء پر ایمان رکھنے والے پوری بصیرت وطمانینت کے ساتھ.. نہ صرف اِن ''اھواء'' سے محفوظ رہیں گے (فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ) بلکہ وہ ''خصومات'' کی اس اذیت سے بھی بچالئے جائیں گے۔ ہاں ان کو زور صرف کرنا ہوگا تو وہ ان دو باتوں پر کہ:

۱) وہ انبیاء پر اپنے یقین اور وثوق ہی کو پختہ سے پختہ تر کریں

۲) وہ انبیاء کی لائی ہوئی ہدایت میں اپنی دنیا کے اِن مسائل کی تلاش کرنے میں پورے اخلاص اور جستجو سے کام لیں

تاہم انبیاء کی لائی ہوئی چیزوں کو لینے، سمجھنے اور تطبیق کرنے میں ''اَھواء'' اور ''خصومات'' کی پھر بھی جو ایک گنجائش رہتی ہے، اور جس کے باعث انبیاء کے نام لیوا کسی وقت ''خوارج'' بن جاتے رہے ہیں، تو کسی وقت ''روافض''، تو کسی وقت ''جہمیہ''، تو کسی وقت ''قدریہ'' تو کسی وقت ''معتزلہ'' و ''جدت پسند'' وغیرہ وغیرہ...... ''اَھواء'' کے حملہ آور ہونے کی اِس اتنی سی گنجائش کو ــــــ ''حواریُّون و اصحاب'' کے راستے کی پابندی کے ذریعہ سے ــــــ ختم کرا دیا جاتا ہے۔ ایسی امت کو اپنے نبی پر اتری ہوئی ہدایت کی ایک نہایت متعین اور کنکریٹ صورت میسر آجاتی ہے؛ اس کی ہر ہر نسل اور ہر ہر فرد کو ایک ایک مسئلہ پر 'بحثوں' اور 'ریسرچوں' کے کنویں جھنکوانے کی نوبت نہیں آتی؛ اور وہ اپنے زمانے میں ''حق'' کی ایک نہایت واضح بنیاد پہ ہوتے ہوئے اور کرۂ ارض پر شرق تا غرب کمال یکسوئی و ہم آہنگی کے ساتھ تہذیب کی تعمیر کرتی ہے اور باطل سے جہاد کرتی ہے۔

''وحی'' سے استدلال کے دوران، اور کسی کسی وقت ''وحی'' کے تعین کے سوال پر، اور ''وحی'' کے نقل اور ضبط کے موضوع پر...... اس امت کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اِس پر کیا طرزِ عمل پایا گیا ہے۔ پوری دلجمعی کے ساتھ اِس کو اُس کا ''اتباع'' کرنا ہوتا ہے اور خود اپنے پاس سے طریقے اور راستے گھڑنے سے احتراز کرنا ہوتا ہے۔ الفاظِ وحی کا کوئی نرالا مفہوم اس کے سامنے لایا جائے، تو اِس کو پیچھے دیکھنا ہوتا ہے کہ آیا قرونِ اولیٰ سے اس کی توثیق ہوتی ہے یا نہیں۔

کوئی اس کو حدیث سے فإذا أحببته كنت سمعَه الذی یسمع به، وبصرَه الذه یبصر به، ویدَه التی یبطش بها، ورجلَه التی یمشی بها کے الفاظ دکھا کر حلول اور اتحاد ثابت کر کے دے، یا یا ابن آدم مرضتُ فلم تعدنی سے تجسیم یا حلول، یا إذا قاتل أحدكم أخاه فليجتنب الوجه، فإن الله خلق آدم علىٰ صورته سے تشبیہ، یا فیسبق علیه الکتاب اور **وَلَوْ شَاء اللّهُ مَا أَشْرَكُواْ** سے جبر، یا **اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْض** والی آیت سے صوفیہ کے کچھ بے سر و پا تصورات جو وہ خالق اور تخلیق کی بابت قائم کرواتے ہیں، یا **وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي** سے انسان کے اندر خدا کی روح اتری ہونا اور ''روح'' کے اعتبار سے خالق اور مخلوق کا ایک ہونا، یا **وَهُوَ اللّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الأَرْض** سے ذاتِ خداوندی کا ہر جگہ ہونا (اِن مثالوں کی تفصیل کیلئے دیکھئے فصل چہارم)...... تو وہ ایسی کسی تعبیر کو جس پر اصحابؓ و تلامذہؒ اصحابؓ نہیں پائے گئے، درخورِ اعتناء نہیں جانتی۔ الفاظِ وحی کی ہر وہ خطرناک تعبیر، جو سلف سے ماثور نہ ہو، آپ سے آپ اِس کے کان کھڑے کرتی ہے؛ اور یہ کسی لمبی بحث میں پڑے بغیر، اُس کو قبول کرنے سے اِباء کر دیتی ہے؛ جس سے نہ صرف اس کا ایک فکری تسلسل قائم رہتا اور کڑی در کڑی

''اصحابؓ'' تک پہنچتا ہے بلکہ اس کا بہت سا وقت اور توجہ بھی فریضہ ہائے وقت پر پورا اترنے میں صرف ہوتی ہے۔

یہ ہے ''خصومات'' یعنی ''بحث و آراء'' یا ''جدال فی الدین'' سے بچنا؛ جو کہ منہجِ سلف کا ایک نہایت اہم خاصہ ہے۔

اب یہاں پر بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''سلف'' کا حوالہ دے کر لوگوں کو ''بحث و آراء'' اور ''جدال فی الدین'' کے اِس دشت نا پیدا کنار سے نکال لانا خیال تو بہت اچھا ہے...... مگر جو آدمی الفاظِ وحی کی اپنی ایک تفسیر کر رہا ہے اُس کو ''سلف کے منہج'' کا پابند کروانے پر بھی تو آپ کو ایک لمبی بحث کرنا ہوگی! **پس ایک چیز مسئلے کا حل کیونکر ہوئی، جبکہ اُس کے ثبوت پر ہی آپ کے اور اُس کے مابین ایک لمبی تکرار ہو جاتی ہو؟!**

اِس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر ایک چیز حق ہے؛ اور آپ کو راہِ راست پر رکھنے کا ذریعہ ہے...... تو اُس کی اصل جگہ 'بحثیں' اور 'مناظرے' نہیں۔ بلکہ اس کا اصل محل یہ ہے کہ وہ امت کی ساخت کے اندر بولے۔ وہ امت کی نئی نسلوں کی فکری و نظریاتی تربیت کی اساس بنے اور اس پر لوگوں کے اندر ابتداءً ایک دلجمعی و یکسوئی پیدا کرائی جائے۔ نتیجتاً جب بھی کوئی مسئلہ سامنے آئے اور کوئی 'نئی بحث' چھڑے، ہمارے اِس نوجوان کی نظر آپ سے آپ اسلام کے قرنِ اول کی طرف اٹھ جایا کرے اور وہ اسی ''سلف کے فہم وطرزِ عمل'' پر کفایت کرتے ہوئے وہاں ''خصومات'' سے بچ جایا کرے۔

چنانچہ ''اصولِ سنت'' اور ''اصولِ سلف'' کا اصل استعمال امت کی تعلیم اور تربیت اور ذہن سازی.. اور امت کی تعمیر و ترقی.. کے اندر ہوتا ہے۔

رہ گئے وہ طبقے جو کچھ غیر طبعی اسباب کے باعث دین کے کسی اصل سے ہٹ گئے ہوئے ہیں اور برسوں کے برس یا نسلوں کی نسلیں اپنے اسی انحراف پر گزار آئے ہیں......تو اُن کے ساتھ تو ہمارا جو بھی اختلاف ہوگا وہ ہماری اچھی خاصی محنت لے گا۔ ان کے ساتھ تو ایک ''اصولِ سلف'' ہی کیا، ہر ہر مسئلے پر ہی طویل بحثیں ہوں گی! دین کا واضح سے واضح مسئلہ بھی ان کے ساتھ گھنٹوں کے گھنٹے تو کیا برسوں کے برس بھی لے لے گا۔ اب ___ مثلاً ___ توحید سے بڑھ کر کونسا مسئلہ ہے جس کو کتاب وسنت نے واضح کیا ہو؟ لیکن جس شخص کی توحید خراب ہو چکی ہو ___ جبکہ وہ قرآن اور سنت پر ایمان کا دعویدار بھی ہو ___ اُس کے ساتھ آپ کو قرآن اور حدیث کی نصوص کے ہوتے ہوئے بھی کیسی کیسی بحثیں نہیں کرنا پڑتیں؟ بلکہ کیسے کیسے شرکیات ہیں جن کا ثبوت وہ آپ کو قرآن اور حدیث سے ہی نکال کر نہیں دے رہا ہوتا؟ غرض شرک اور توحید ایسے واضح ترین مسئلے پر بھی، ایسے شخص کے ساتھ، ''ایک منٹ میں'' بات ختم کرنا کسی وقت ممکن نہیں ہوتا؛ بلکہ طویل بحث کے باوجود بسا اوقات آپ کی بات اُس کے ساتھ سرے نہیں لگتی۔

جو بھی شخص کسی انحراف کا شکار ہو کر ایک حق بات کا انکار کر رہا ہوگا، اُس پر وہ حق بات واضح کرنا کسی وقت ڈھیروں محنت کا متقاضی ہوگا۔ خوارج نے قرآن کی تفسیر کا ایک خاص اسلوب ''ڈیویلپ'' کر لیا تھا، چنانچہ اُن کو اپنے اختیار کردہ منہج کے ثبوت ہی قرآن میں جابجا اور اِس قدر 'واضح' نظر آنے لگے کہ بسیار کوشش کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم اُن کو اپنی بات کا قائل نہ کر سکے۔ اور وہ 'قرآن کی بات' چھوڑ کر کسی صورت 'صحابہؓ کی بات' اختیار کر لینے پر آمادہ نہ ہوئے! یہی معاملہ کم وبیش دوسرے منحرف فرقوں کے ساتھ رہا۔

پس یہ چیز ایک ''اتباعِ اصحابؓ'' کا مسئلہ ثابت کرنے کے ساتھ خاص نہیں......؛ آپ بخوبی واقف ہیں، جو لوگ ''اتباعِ انبیاء'' کے منکر ہیں اُن کو''انبیاء کے راستے'' پر لانے کیلئے آپ کو کیسی کیسی لمبی بحثیں نہیں کرنا پڑتیں؟ جبکہ ایک نوآموز شخص کو آپ بڑے آرام سے ''انبیاء کی اتباع'' پر یکسو کر لیتے ہیں۔

منکرین حدیث ہی کو لے لیجئے، جو کہ ''قرآن کی اتباع'' پر بے حد و حساب زور دیتے ہیں، اور یہ تو آپ جانتے ہیں قرآن میں ''اتباعِ حدیث'' کا پورا پورا ثبوت موجود ہے۔ کہنے کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ لوگ ''قرآن کی اتباع'' پر اِس قدر زور دیتے ہیں تو اِن کو قرآن سے ہی ''حجیتِ حدیث'' کا مسئلہ نکال کر دکھا دینا چاہئے؛ آخر یہ قرآن کی بات کس منہ سے ٹالیں گے۔ لیکن......مسئلہ واقعتاً اگر اتنا سادہ ہوتا تو رونا ہی کیا تھا! دراصل ''اَھواء'' ایک چیز ہی ایسی ہے جو آدمی کو فکری طور پر intellectually اندھا کر چکی ہوتی ہے۔ ''حجیتِ حدیث'' کے حوالے سے آپ قرآن کا کوئی بھی مقام اس شخص کے سامنے لے آیئے، وہ کہتا ہے کہ اس آیت کا تو وہ مطلب اور دلالت ہی نہیں جو آپ لے رہے ہیں! یہاں تک کہ کسی کسی وقت آپ کا جی چاہتا ہے (اُس داعیانہ حرص کے تحت جو ''**فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقاً فِيْ الأَرْضِ أَوْ سُلَّماً فِيْ السَّمَاء فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ وَلَوْ شَاء اللّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَى فَلاَ تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ إِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْن**''☆ کے الفاظ سے تعبیر ہوئی ہے) کہ کاش قرآن سے آپ اُس کو کوئی ایک ہی ایسا ''صریح مقام'' نکال کر دکھا دیں جس کی وہ کوئی تاویل کر ہی نہ سکتا ہو

☆ (الانعام: ۳۵-۳۶) ''تو اگر تیرا بس چلے کہ تو زمین کے اندر کوئی سرنگ لگا لے یا آسمان کے اندر کوئی سیڑھی اور پھر تو ان کو کوئی نشانی لا کر دکھا دے! حالانکہ اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر ہی اکٹھا کر دیتا، پس تو جاہلوں میں سے مت ہو۔ (تمہاری) پکار کا جواب تو وہ دیں گے جو سنیں......''

اور جس کو رد کرتے ہوئے وہ بزبانِ خود یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ ہاں اب تو وہ قرآن کو صاف جھٹلا رہا ہے! لیکن آپ جانتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا! آپ دیکھتے ہیں وہ (منکر حدیث) برابر قرآن کی تعظیم کئے چلا جاتا ہے بلکہ قرآن کی تعظیم میں غلو تک چلا جاتا ہے لیکن قرآن کے ہر اس مقام کو طرح دے جاتا ہے جہاں سے احادیثِ رسولؐ کے اتباع کا حکم ملتا ہے.. جبکہ اُس کا ''زعمِ دلیل'' بھی اِس دوران پوری طرح برقرار رہتا ہے! (ایسا نہ ہوتا تو گمراہ فرقے دنیا میں ناپید exinct ہو جاتے!)۔ دوسری طرف آپ دیکھتے ہیں وہ شخص جو حجیتِ حدیث کے موضوع پر ابھی ''اَھواء'' کی قید میں گرفتار نہیں ہوا ہے، قرآن کے وہ سب مقامات اُس کو نہایت خوب سمجھ آتے ہیں جو اُس کو نبی ﷺ کی ایک ایک حدیث اور ایک ایک اشارے کا پابند کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا مثال میں...... کم از کم یہ شخص ''قرآن'' کو مانتا ہے اس لئے آپ کو اس کے ساتھ گھنٹوں کے گھنٹے ''قرآن'' کو تسلیم کروانے پر صرف نہیں کرنا پڑے۔ ورنہ اگر وہ کوئی ایسا شخص ہے جو ''قرآن'' کو ہی تسلیم نہیں کرتا (اور آج کل تو انٹرنیٹ پر ایسے لوگوں کے ساتھ آپ جس قدر چاہیں بحث کر سکتے ہیں؛ ''منکرینِ قرآن'' کے ساتھ بحث کے لئے بھی اب تو جگہ جگہ ''روم'' کھلے ہیں)...... تو یہاں صرف آپ ہی کو نہیں، ایک منکر حدیث کو بھی گھنٹوں کے گھنٹے ''قرآن'' کا ثبوت دینے میں صرف کرنا ہوں گے..! بلکہ ہوسکتا ہے اس کے لئے ''گھنٹے'' بھی کافی نہ ہوں اور مسئلہ پیچ در پیچ بحثوں میں جا پڑے، اور اس کے بعد بھی وہ کہے کہ کوئی ''مسکت دلیل'' تو آپ نے مجھے دی نہیں ہے، میں ''قرآن'' کو کیسے تسلیم کرلوں!

یہاں تک کہ آپ جانتے ہیں مسئلہ کسی کسی وقت ''خدا کے وجود'' تک چلا جاتا ہے......اور جب کوئی شخص یا طائفہ کسی بھی موضوع پر انحراف میں پڑ چکا ہے اور ایک عرصہ تک وہ اپنے اس عقیدہ کو پالتا پوستا رہا ہے، وہاں کوئی مقام ایسا نہیں آتا کہ وہ شخص آدھے منٹ میں آپ سے ''دلیل'' پا لیتا ہو۔ اِلا اَن یشاء اللہ

پس جو لوگ کسی چیز کے منکر ہیں اور ان کی زندگی اسی میں گزری ہے......ان کو تو ایک صحیح ڈگر پر چڑھانے کیلئے آپ کو ایک خاص ''اضافی محنت'' ہی کرنا پڑتی ہے۔ پھر بھی جس کی قسمت ہو صرف وہی ہے جو اپنے اُس انحراف سے باہر آتا ہے؛ اکثر کو تو ''حق'' بدستور اپنے ہی فکری تانے بانے کے اندر نظر آتا ہے۔

لٰہذا اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ابتداءً جب کسی شخص کی ذہنی وفکری ساخت کی جائے تو عین اُس وقت ہی اُس کو کس طرزِ عمل پر تربیت دی جائے......تا کہ تلاشِ حق کے معاملہ میں وہ ''اَھواء'' کی زد میں آنے سے ہی بچ جائے اور ''خصومات'' کے جنگل میں پھنسنے سے ہی محفوظ رہے۔ ہاں جو شخص ایک بار ''اَھواء'' کی گرفت میں آچکا ہے (اور جو کہ از روئے حدیث آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہیں☆) تو اس کو رہائی دلوانے کیلئے البتہ ایک اور قسم کی محنت درکار رہے۔ ''شرک اور توحید'' ایسے واضح ترین مسئلے پر بھی ایسے شخص کو ''قرآن'' کھول کر دکھا دینا بعض اوقات فائدہ نہیں دیتا۔

☆ وإنه سيخرج في أمتي أقوام تجارىٰ بهم تلك الأهواء كما يتجارى الكلب بصاحبه، لا يبقىٰ منه عرق ولا مفصل إلا دخله۔ (رواه أحمد 16490 وأبو داود 4597، عن معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنهما، وحسنه الألباني في صحيح أبي داود 3843) ''میری امت میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جن کے اندر اھواء یوں رچ بس جائیں گی جیسے کتے کا کاٹا انسان کے اندر رچ بس جاتا ہے اور اس کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس سے سلامت نہیں رہتا''۔

24

کیا ہر نئی بات ممنوع ٹھہرا دی جائے گی؟

کئی طبقوں کی جانب سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ: متقدمین کے فہم وتفسیر سے ہٹ کر کتاب وسنت کو (نئے) معانی پہنانا کوئی ایسی ہی قبیح بات ہے......تو کیا اِس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہاں اب ہر چیز سر بمہر ہے؟ یعنی پہلوں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکے؛ اوراس باب میں ہمارے لئے تو کوئی کام ہی باقی نہیں رہ گیا ہے؟

یہ نتیجہ اخذ کر لینا نہ صرف غلط ہے بلکہ زمین پر انسان کے کردار کو ہی معطل کر دینے کے مترادف ہے۔اور جب زمین پر انسان کا کردار معطل ہو جاتا ہے تو وحی کا کردار بھی ساتھ ہی معطل ہو جاتا ہے؛ کیونکہ وحی کو ''انسان'' ہی کے ذریعے اپنا عملی ظہور کرنا ہے۔جس کیلئے ضروری ہے کہ وحی کی تلقی کیلئے تمام کے تمام انسانی قویٰ کام میں لائے جائیں اور یہ عمل کسی دور میں موقوف نہ ہو۔لہٰذا ہر دور کے اہل علم کو ہی یہاں شریعت کے فہم وتفسیر وتطبیق کے معاملہ میں اپنا حصہ ڈال کر جانا ہے۔**شرط صرف یہ ہے کہ یہ ایک ''تسلسل'' کی صورت رہے نہ کہ ''ادھیڑ بن'' کی۔**

اسلامی شریعت کا مطالعہ وتفسیر وتطبیق (اسلامی فقہ وفکر) ایک ایسی دیوہیکل تعمیر ہے جو ہر انسانی دور میں ہی ایک توسیع واضافہ چاہتی ہے؛ اور یہ ایک ایسا صحت مند وجان دار عمل ہے جس کو کبھی بھی معطل نہیں ہونا ہے؛ جس دور میں ''اجتہاد'' کا یہ عمل معدوم ہوا یوں سمجھئے گویا مسلمان اُس عہد میں پایا ہی نہیں گیا۔لہٰذا ہر دور کے اہل علم اِس میں بیش بہا اضافے کریں گے؛ البتہ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک اعلیٰ ڈیزائن پر کھڑی کی گئی عمارت کو آپ اوپر سے اوپر اٹھاتے چلے جائیں اور کہیں پر یہ ضرورت

محسوس نہ کریں کہ عین بنیاد سے ہی اس کی اینٹیں اکھاڑنا شروع کر دیں اور نتیجتاً پوری عمارت کی سلامتی کو ہی ایک سوالیہ نشان بنا دیں۔ 'نئی چیز' کا ممنوع ہونا اِس معنیٰ میں البتہ ضرور ہے۔

پس ''نئی چیز'' اگر اِس تفسیری وفقہی عمل کو ''توسیع'' دینے کے معنیٰ میں ہو، اور جو کہ اپنے زمانے کے مسائل پر پورا اترنے کی صورت میں خود بخود وقوع پذیر ہوتی ہے، تو یہ ''نئی چیز'' ایک نہایت مستحسن عمل ہے۔ البتہ ''نئی چیز'' اگر اِس معنیٰ میں ہے کہ اِس فلک بوس عمارت کی بنیادوں کو ہی از سر نو کھودنا اور عین وہاں پر ہی 'تصحیحات' کرتے پھرنا ہے، تو یہ ''نئی چیز'' اِس امت کے حق میں ایک نہایت مذموم اور منحوس شےء ہے۔ آج کے وہ طبقے جو تفسیر وفقہ کے معاملہ میں صحابہ وتابعین کی ڈالی ہوئی بنیادوں کو درہم برہم کرنے میں لگے ہیں، اور سبک روئی سے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر صحابہ وتابعین کی وضع کردہ اِن اشیاء کو ہمیں من وعن لینا ہے اور خود اپنی عقل سے، اور لاہور و گوجرانوالہ سے پڑھی ہوئی اپنی 'عربی' سے مدد لیتے ہوئے، فصحائے صحابہ وتابعین کے جاری کردہ اِن اُسس ونظائر کو غلط کہنے کی جرأت تک نہیں کرنا ہے، تو کیا اِس سے ہم یہ سمجھیں کہ شریعت کی تفسیر اور تعبیر کے معاملہ میں ہمارا اور قیامت تک آنے والی نسلوں کا کوئی کردار ہی اب باقی نہیں رہ گیا ہے......؟ اِس سوال کے پیچھے کارفرما جو اصل وارداتی ذہنیت ہے اگر آپ پر واضح ہے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ بظاہر معصوم سا سوال اپنی پشت پر کس قدر مہلک وگمراہ کن محرکات رکھتا ہے۔

دین کی تعبیر وتفسیر کے معاملہ میں آپ کیلئے (بشرطیکہ آپ اِس کے اہل ہوں) یقیناً ایک کردار باقی ہے، مگر یہ وہ کردار نہیں جو علمائے صحابہؓ کے لئے مخصوص ہے جن

کو مدرسۂ نبوت سے براہِ راست ایک علمی وفکری، وروحانی تزکیہ حاصل ہوا؛ اور جن کو قیامت تک کیلئے اِس تفسیری وفقہی عمل کی تاسیس کرنا تھی۔ اور نہ ہی یہ وہ کردار ہے جو علمائے تابعین واتباعِ تابعین کے لئے مخصوص ہے جن کو مدرسۂ نبوت کے فراغت یافتہ گدی نشینوں سے اپنی علمی وفقہی ساخت کروانا نصیب ہوا؛ اور جن کو اِس تفسیری وفقہی عمل کی اولین بنیادیں اٹھانا تھیں۔ ہاں اُن کو بنیاد مانتے ہوئے خود آپ بھی اپنے زمانے کے علمی وفکری وفقہی میدانوں کے اندر جس قدر چاہیں گھوڑے دوڑا سکتے ہیں۔ اور یہ کام کوئی ایسا معمولی بھی نہیں؛ بہت تھوڑے ہیں جو اِس چیلنج پر پورا اتر کر دکھا سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اِس سلسلہ میں اصولی بات تو یہی ہے۔ تاہم طلبۂ علم کے فائدہ کیلئے یہاں پر ہم شیخ سلمان العودۃ کو ہونے والا ایک سوال اور شیخ کا جواب نقل کریں گے:

سائل: شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کہیں پر کہا ہے کہ اُن کی بات اگر سلف سے ماثور نہیں تو ہرگز نہ لی جائے۔ تاہم کسی کسی وقت ہمارے دیکھنے میں آتا ہے کہ طالبعلم ایک ایسا نیا علمی خیال لے آتا ہے کہ استاد یہ کہہ کر اُسے شاباش دیتا ہے کہ اس کو پیش کرنے والا وہ پہلا شخص ہے۔ کیا ایسے کسی علمی استنباط پر اُس طالبعلم کو خوش ہونا چاہیے، خاص طور پر اگر استاد اس پر یہ کہے کہ یہ نہایت خوب اور برمحل استدلال ہے......؟ یا پھر اس کو اِس پر خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ قول سلف یا مابعد کے علماء سے تو ماثور نہیں ہے؟

شیخ سلمان: آدمی کا ایک ایسا قول لے کر آنا جس میں کوئی اس پر سبقت لے کر نہیں گیا ہے...... اگر تو یہ کسی عملی فقہی میدان سے متعلق ہے تب تو جائز نہیں کہ آدمی ایک ایسا قول نکال لائے جو اس سے پہلے کبھی کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔ کیونکہ اگر یہ خیر ہے تو امت کے پہلوں کو ضرور اس میں سبقت حاصل ہونی چاہیے۔ نیز اس لئے بھی کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اتنی صدیاں امت اِس صالح عمل سے بھٹکی ہی رہی تھی۔ اِسی بابت امام احمد فرماتے ہیں: لا تقل في مسألة ليس لك فيها إمام یعنی دین کے ایک مسئلہ میں

اگر تمہارا کوئی پیش رَو نہیں تو وہ بات اپنی اپج سے مت کہو۔

تاہم وہ میدان جو نظری ہیں، اگر چہ وہ شرعی کیوں نہ ہوں، تو وہاں اِس بات میں کوئی مانع نظر نہیں آتا۔ ''نظری میدانوں'' سے میری مراد ہے مثلاً: آدمی کو قرآن کی کسی آیت سے ایک نیا نکتہ مل جاتا ہے، یا کسی حدیث سے سوچ اور فکر کی کوئی نئی جہت مل جاتی ہے۔ یا مثلاً: دو قول جن میں بظاہر کوئی تعارض تھا، یہ شخص ان کے مابین جمع کی کوئی ایسی صورت نکل لاتا ہے جو اِس سے پہلے کتب تفسیر یا شروحِ حدیث میں منقول نہیں ہوئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یا اس کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ کسی مسئلہ میں ایک قول یا ایک مذہب یا ایک اجتہاد تو پہلے سے پایا گیا ہے، مگر یہ شخص اُس قول یا اُس مذہب یا اُس اجتہاد کی صحت پر کچھ ایسے نئے دلائل لے آتا ہے جو پہلوں نے نقل نہیں کئے ہیں اور اِس بنا پر اُس قول یا اُس اجتہاد کو ترجیح مل جاتی ہے۔

اِس چیز کے شواہد سے اہل علم کی کتب بھری پڑی ہیں؛ خصوصاً شاطبی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن حجر وغیرہ کی تالیفات جہاں آپ کو ایسا بہت بڑا ذخیرہ مل جاتا ہے۔

تاہم یہ بھی ضروری نہیں کہ استاد کا شاگرد رشید کو کسی وقت یہ کہنا کہ اس علمی نکتے کے معاملہ میں کسی کو اس پر سبقت نہیں رہی ہے، یہ معنیٰ رکھے کہ یہ بالکل ہی کوئی نئی چیز ہے۔ کسی وقت اُس کی مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی اور طالبعلم کے ذہن میں اس سے پہلے یہ بات نہیں آئی، یا یہ کہ اس سے پہلے کسی سے اِس بات کا منقول ہونا استاد کے اپنے علم میں نہیں ہے؛ جس سے یہ بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ طالبعلم کو ذکاوت اور نکتہ رسی سے ایک خاص حظ نصیب ہوا ہے۔

رہ گیا طالبعلم کا اس پر خوش ہونا تو یہ ''**قل بفضل الله وبرحمته فبذٰلک فليفرحوا**'' (یونس: ۵۸) کی ہی قبیل سے ہے۔ استاد کا ایسے ہونہار طالبعلم کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کی علمی صلاحیتوں کو اور سے اور جگانا باقاعدہ ھدیِ نبوی ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے ابی بن کعبؓ کو ان کے ایک جواب سے خوش ہو کر فرمایا تھا: ليهنك العلم يا أبا المنذر!! (مسلم: ۸۱۰) ''ابو منذر! بھئی تم کو علم مبارک ہو''۔ ☆

یقیناً اِس بات کی گنجائش ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت سے آج بھی آدمی کو کوئی ایسا علمی نکتہ نکال لانا نصیب ہو جو اِس سے پہلے کسی کے بیان کرنے میں نہیں

☆ http://www.ahlalhdeeth.com/vb/showthread.php?t=17235

آیا، اور یقیناً یہ بات ''لا تنقضی عجائبہ'' کے معنیٰ میں شامل ہے، البتہ اِس چیز کو روایتی معنیٰ میں ''تفسیر'' سے تعبیر کیا ہی نہیں جاتا؛ اہل علم کے ہاں اِس کیلئے ''فوائد'' وغیرہ ایسے الفاظ مستعمل ہیں، اور جس کی ظاہر ہے ہمیشہ ہی گنجائش ہے۔

''نئی چیز'' لے کر آنے کے حوالے سے وہ خاص میدان جو اہل علم کے ہاں تجویز ہوتے ہیں اور وقت کے اصحابِ علم و دانش کو ان میں گھوڑے دوڑانے کیلئے خوب خوب صلائے عام دی جاتی ہے: ''نوازل'' ہیں۔ (نوازل، نازلۃ کی جمع، جس کا مطلب ہے ایک ایسا مسئلہ یا موضوع جس سے امت کو اِس سے پہلے واسطہ نہیں پڑا)۔ ظاہر ہے اس میں پورا اترنا کام ہی علمائے وقت کا ہے۔ نیز کتاب و سنت کا اعجازِ علمی۔ (یعنی وہ سائنسی اور سماجی حقائق جو انسانی علم اور تجربے نے اُس پر آج جا کر منکشف کئے ہیں، جبکہ قرآن مجید یا سنت میں ایسے حقائق کی بابت کچھ اشارات پائے جاتے ہیں)۔ علاوہ ازیں، سماجیات کے اندر نظری و تطبیقی علوم (theoretical & applied sciences) جن کے ہر ہر گوشے تک وحی کی روشنی پہنچانا ایک عظیم چیلنج ہے۔ ظاہر ہے اِن میدانوں میں متقدمین کو نہیں بلکہ دورِ حاضر کے رجال کو ہی اپنے علمی کمالات دکھانا ہوں گے۔

25

’اختلافِ سلف کا جو دائرہ آپ بنا کر دیتے ہیں،
ہم بھی اُس سے باہر تو نہیں‘!

ہمارے جدت پسند جو کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختیار کردہ علمی مواقف اور فقہی اتفاقات کے اندر جابجا کیڑے نکالتے اور ائمۂ تابعین و تبع تابعین کو قدم قدم پر غلط ٹھہراتے ہیں، یہاں تک کہ ’’فقہاء کو یہ غلطی لگی ہے‘‘ ایسا بے دریغ جملہ ان کے ہاں تکیۂ کلام کی طرح چلتا ہے...... کسی وقت فرمانے لگتے ہیں کہ ’’اختلافِ سلف‘‘ کا جو دائرہ آپ ہمیں تجویز کر کے دیتے ہیں، ہم بھی اُس سے باہر تو نہیں! دین میں ایک ایسی نئی بات کر کے بھی، جو سلف کے جملہ مذاہب کے ساتھ متصادم ہو گی، بڑے آرام سے کہہ دیں گے کہ اِن کی بات میں اور پہلوں کی بات میں سر مو کوئی فرق نہیں!

دوسری طرف لمبی لمبی بحثیں اِس بات پر ہو رہی ہوں گی کہ سلف کے اجماع اور سلف کے دساتیر اور سلف کے اخذ کردہ معانی و مفہومات کی پابندی ہی سرے سے کب ضروری ہے؟!!!

یعنی دونوں روٹ بیک وقت اختیار کر لئے جائیں گے: راہِ سلف کا خلاف بھی کر لیا جائے گا، اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی وقت حرف غلط کا درجہ بھی دے ڈالا جائے گا...... ساتھ ساتھ البتہ یہ اطمینان بھی دلایا جائے گا کہ ’ہماری اور سلف کی بات میں سر مو کوئی فرق نہیں‘؛ یہاں تک کہ یہ بات اُس مسئلہ میں بھی کہی جا رہی ہو گی جہاں سلف کے کسی طریقے اور دستور کے بخیے ادھیڑے جا رہے ہوں!

حالانکہ ایک سادہ سا سوال ہے کہ سلف کے طریقے اور فہم کی پابندی ہی اگر سرے سے ضروری نہیں ہے تو لوگوں کو اِس پر تسلی دلاتے پھرنا کہ ’ہماری اور سلف کی

بات کوئی ایسی مختلف نہیں ہے' کیا ضروری ہے......؟ الا یہ کہ یہ ''سیلز مین شپ'' salesmanship کا مسئلہ ہو؛ کیونکہ گاہکوں کی ایک تعداد بہرحال ایسی ہے جو سلف کی راہ سے انحراف کرنے کو ہنوز ناپسند جانتی بلکہ اِس سے اچھا خاصا بدکتی ہے، جبکہ سلف کا لیبل دیکھنے کو مل جائے تو خاصی بے پروا ہو کر خریداری کرتی ہے!

سوال یہ نہیں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں آپ اختلافِ سلف کے دائرہ سے باہر ہیں یا اندر۔ گمراہ قرار پانے کیلئے یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ ہر ہر مسئلے میں ہی سلف کے خلاف گئے ہوں۔ بے شمار مسائل آپ کے اور سلفِ امت کے مابین مشترک ہی رہیں گے۔ اصل چیز دیکھنے کی صرف یہ ہے کہ اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کے نزدیک کیا حکم ہے اور دائرۂ سلف کا پابند رہنا آپ کے نزدیک کہاں تک ضروری؟ تفسیرِ دین کے معاملہ میں سلف کے دائرے کا پابند رہنا اگر آپ ابتداءً قبول کر لیتے ہیں تو باقی سب مسئلے قابل حل ہیں اور تب یقیناً یہ جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ فلاں اور فلاں مسئلہ میں آپ کا یہ کہنا کہ 'آپ بھی وہی بات کرتے ہیں جو سلف نے کی ہے' کہاں تک حقیقت ہے اور کہاں تک خلافِ واقعہ۔ تاہم سلف کے فہم وتفسیر کی کوئی اصولی حیثیت ہی اگر آپ کے ہاں طے نہیں ہے؛ نتیجتاً جہاں بھی آپ کی بات فہمِ سلف کے خلاف نکل آئی وہاں آپ دیدے پھیر کر سوال اٹھا دیں گے کہ فہم واجماعِ سلف کی پابندی ہی آخر کب ضروری ہے......تو اِس صورت میں سلف کی موافقت کا جو دعویٰ کہیں کہیں پر کر لیا جاتا ہے، بے فائدہ وغیر متعلقہ رہے گا۔ خوارج، روافض، جہمیہ، قدریہ، معتزلہ میں سے کونسا فرقہ ہے جو دین کے ہر ہر مسئلہ میں ہی سلف کے خلاف چلتا تھا؟! وہ اصل نقطہ جہاں سے اُن کا اور اہل سنت کا کانٹا الگ ہوتا تھا صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ: **اہل سنت دین کو صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف سے سمجھتے ہیں جبکہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم وسلف سے آزادرہ کر۔**

یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ ابو حنیفہ و مالک و شافعی و ابن حنبل، و بخاری و اوزاعی وغیرھم رحہم اللہ صحابہ میں تو نہیں آتے! یا یہ کہ طحاوی، طبری، سرخسی، مرغینانی، کاسانی، لالکائی، ابن بطہ، ابن عبد البر، ابن قدامہ، شاطبی، ابن تیمیہ، ابن کثیر، نووی، ابن حجر وغیرھم رحہم اللہ ایسے ہزاروں اہل علم کیا سلف میں آتے ہیں جو قدم قدم پر اِن کے حوالے دیے جاتے ہیں؟ بلاشبہ...... ہم اہل سنت اِن بے شمار علمی ہستیوں کے حوالے قدم قدم پر دینا ضروری جانتے ہیں؛ کیونکہ فہم اور استنباط کا مستند ہونا جس طرح اِن معتمدینِ امت کے حوالے دے کر ثابت ہوتا ہے اُس طرح 'اپنی' بات کر دینے سے نہیں ہوتا۔ اور بے شک یہ درست ہے کہ یہ سب لوگ دورِ سلف میں نہیں آتے۔ مگر یہ سب لوگ ''مدرسۂ سلف'' سے وابستہ ضرور ہیں بلکہ اِس دبستان کے ترجمان؛ اور یہی بات اصل میں اہم ہے۔ اِن حضرات کا یہ اصول جب ہم پر واضح ہے کہ یہ اجماعِ صحابہؓ کے پابند ہیں، حتیٰ کہ اختلافِ صحابہؓ کے وقت بھی یہ صحابہؓ کے اقوال سے نہیں نکلتے، نیز یہ سلف سے چلے آنے والے فقہی سلسلوں اور علمی دستوروں کے سختی کے ساتھ پابند ہیں اور پہلے سے چنی ہوئی اینٹوں پر ہی نئی اینٹیں چنتے ہیں......تو جب تک ہم پر ثابت نہ ہو جائے کہ یہ فقہاء کہیں پر اِس اصول کو توڑ بیٹھے ہیں، ہم اِن کے استنباطات کے حوالے پورے شرحِ صدر کے ساتھ دیتے ہیں۔ اور یہی وہ اصل فرق ہے جو ہم علمائے سنت اور زعمائے بدعت ☆ کے مابین کرتے ہیں۔ وہ شخص جو سلف سے چلے آنے والے فقہی دساتیر کا ہی پابند نہیں وہ جن گڑھوں کے اندر گرنے والا ہے اُس کے پیچھے تو وہی چلے جس کو ان گڑھوں میں گرنا پسند ہو۔

بحمد اللہ تم

وصلی اللہ علی النبی وآلہ

☆ کل مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، و کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔ ہر نیا چلن بدعت ہے۔ اور ہر بدعت، ضلالت۔

ایک معتزلی، امام مالکؒ کے پاس آیا اور بحث کا خواستگار ہوا: ''آپ مجھے قائل کر لیجیے یا میں آپ کو قائل کر لیتا ہوں''۔

امامؒ کا جواب تھا: ''اور اگر کوئی تیسرا شخص ہم دونوں کو خاموش کرا دے! کیا جب بھی کوئی پہلے سے بڑھ کر دلیل دینے والا آ جائے ہم اپنا دین بدلنے چل پڑیں گے؟! سنو، میں اپنا دین معلوم کر چکا ہوں۔ تمہیں اپنا دِین معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرتے پھرو''۔

امام مالکؒ کا یہ مختصر جواب پورے ایک منہج کا بیان ہے:

''دین'' ایک متعین حقیقت ہے۔ جس کا نزول بھی ہو چکا ہے اور جو زمین پر تجھی بھی جا چکی ہے۔ بیان بھی ہو چکی ہے۔ روبۂ عمل بھی آ چکی ہے۔ نقل بھی ہو گئی ہے اور روایت بھی۔ ہزاروں لاکھوں خلقت ___ جس میں ہر اہلیت کے لوگ شامل تھے ___ برس ہا برس اس کا فکری، نظری، عملی، روحانی اور ایمانی مشاہدہ بھی کرتی رہی اور زندگی کے اندر اس کا عملی اور واقعاتی مظاہرہ بھی۔ پھر ان کے اس فکری مشاہدہ اور عملی مظاہرہ کے عین حق ہونے کی شہادت اس کے نازل کرنے والے نے خود بھی دی ہے (وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ) اور جس پر یہ نازل ہوئی اس نے بھی اس کی توثیق کر دی (ما أنا علیه وأصحابي) پس اس حقیقت کی تلاش اب تفکیر کے صغریٰ و کبریٰ میں نہیں بلکہ اُس انسانی مجموعۂ کے علم و عمل کے ذخیروں میں کی جائے گی اور اسی کے زیر تعلیم رہنے والے ''تابعین'' کے ہاں ڈھونڈی جائے گی، جن کی شاگردی کی جانب امام مالکؒ کا اشارہ ہے کہ ''میں اپنا دین معلوم کر چکا ہوں، تمہیں اپنا دین معلوم نہیں تو جہاں چاہو تلاش کرو''۔

مطبوعات ایقاظ